

# زندگی

رضیہ بٹ

مدتوں پہلے کی بات ہے۔

ابتدائی تارینوں کے چاند کی پھانک تھوڑی دیر کے لیے کیکر کی نوکیلی شاخوں کی پھنگ میں اٹکی اور پھر آہستہ آہستہ کاتک کی رات کے خنک اندھیروں میں ڈوب گئی۔ آسمان پر ستارے اب پوری طرح روشن تھے۔ شام کو دھل دھلا کر نکھرا ہوا آسمان سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ سیاہی کے حوالے سے ستاروں کی چمک زیادہ ہی ہو گئی تھی۔

پہلاں والی گاؤں پر تاروں کی چھاؤں اتر رہی تھی۔ دور دراز تک پھیلے کھیتوں اور ان کے کنارے اُگے قطار در قطار درختوں پر خنک اندھیرے پھیلے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی..... چاولوں کی فصل کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد لوگ گھروں کو جا چکے تھے۔ کچھ فصلوں کی حفاظت کے لیے درختوں تلے چار پائیاں ڈالے حلقے گڑ گڑا رہے تھے۔ ہیر وارث شاہ اور سیف الملوک کے پڑھنے والے بھی موجود تھے۔ اپنی دسوز اور مترنم آوازوں میں معرفت کے کلام پڑھ کر خاموش فضا میں کیف و سرور کی لہریں دوڑا رہے تھے۔ کچھ لوگ ابھی ڈھور ڈنگروں کو ٹھکانوں پر باندھ رہے تھے۔ ان کے گلے میں پڑی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

عورتیں کام کاج ختم کر کے کچے دالانوں میں مٹی اور سوسوں کے تیل کے دیے جلانے چرنے کا تنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں گھروں سے نکل نکل کر گاؤں کے مغربی کنارے والے میدان میں جمع ہو رہی تھیں..... ککلی کلیں..... لکھن مٹی اور جھومر ڈالنے کو وہ ہر شب یہاں جمع ہو جاتی تھیں..... یہاں سب لڑکیاں صرف لڑکیاں ہوتیں۔ چودھریوں کی بیٹیاں، مزارعوں کی بیٹیاں، کامیوں کی بیٹیاں سب یہاں ایک ہوتیں۔ گاؤں کی الہڑنیاں جب مل کر جھومر ڈالتیں تو فضا میں نغمہ کی رچ جاتی..... تالیوں کی گونج،

قدموں کی دھمک اور قہقہوں کی بوچھاڑ، کائنات کا سارا حسن یہیں جمع ہو جاتا.....  
دھماچوٹری بھی خوب مچاتیں۔ لکن میٹی میں جب کوئی لڑکی پکڑی جاتی تو شور شرابے سے فضا گونج اٹھتی.....

یہ روز کا معمول تھا..... گھنٹے دو گھنٹے کے لیے میدان میں رونقیں آباد ہو جاتیں.....  
دن بھر گھروں میں کام کاج اور کھیتوں میں باپوں بھائیوں کے ساتھ مشقت کرنے کے بعد یہ لڑکیاں اندھیرے اترتے ہی اس میدان کا رخ کرتیں۔ اپنے اپنے گلی محلے کی سکھیاں جمع ہو کر دو دو چار چار کی ٹولیوں میں یہاں آ جاتیں اور جب سب جمع ہو جاتیں تو پھر جوانی پر بھی جوانی آ جاتی.....

کچھ ہی فاصلے پر منچلے نو جوان بھی پہنچ جاتے۔ کوئی بانسری کی مدہوش کن لے پر مست ہوتا، کوئی ماہیے کے بول الاپتا..... کوئی اونچی نیچی آواز میں اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتا تاکہ اپنے ہونے کا احساس ان الہڑتیاروں کو دلا سکے۔

ستاروں کی جھلملاتی روشنی خنک اندھیروں میں گھس کر چاروں اور پھیل گئی تھی..... لڑکیاں کھیل کود میں مصروف تھیں۔ اپنی اپنی سہیلیوں کے ٹولے تھے۔ چودھری رحمت علی کی بیٹی نازو کے ہاتھ میں کوٹلا تھا اور وہ دائرے کی صورت میں بیٹھی پندرہ بیس لڑکیوں کے گرد گھومتے ہوئے ”کوٹلا چھپا کی جمعرات آئی“ الاپ رہی تھی۔

تھوڑے فاصلے پر جیراں اور بیگی ککلی کلیر دی بھا بومیرے ویر دی..... بے ڈھنگے پن سے گاتے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ تختی سے پکڑے ہوئے ککلی ڈال رہی تھیں۔ وہ دونوں زوروں سے دائرے میں گھوم رہی تھیں..... ان کے مولے کرتے تہ بند اور دوپٹے بھی اڑ رہے تھے۔ ارد گرد کھڑی لڑکیاں زور زور سے تالیاں پیٹ رہی تھیں۔ کچھ ٹیاریں لکن میٹی کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ شادو درخت کے ساتھ ماتھا ٹکائے آنکھیں بند کیے کھڑی کہہ رہی تھی۔

”لگ چھپ جانا مکئی کا دانہ۔ راجے کی بیٹی آگئی.....“

لڑکیاں ادھر ادھر بھاگ کر چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ کوئی بھی تو نہ چاہتی تھی کہ شادو جب ڈھونڈنے آئے تو اس کے ہاتھ لگ جائے۔ چھپتے چھپتے لڑکیاں دور دور بھی چلی جاتیں۔ درختوں کی آڑ لینے کھڑی فصلوں میں ڈبک کر بیٹھ جانے اور ٹیلوں منڈیروں

کے پیچھے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتیں۔

کھیل ہی کھیل میں زندگی کے اصلی کھیل بھی شروع ہو جاتے۔ لکن میٹی ان مستانی جوانیوں کا پسندیدہ کھیل تھا جو اپنا مرکز تلاش کر چکی تھیں۔ ان کے محبوب چشم براہ ارد گرد منڈلاتے رہتے اور وہ چھپنے کے بہانے ان کی مضبوط بانہوں اور چوڑی چکلی چھاتیوں میں آن چھپتیں۔ یہی تو وقت ہوتا جب وہ بے دھڑک اپنے چاہنے والوں سے مل سکتی تھیں۔

شادو نے آخری بار زور زور سے کہا۔

”لگ چھپ جانا مکئی کا دانہ۔ راجے دی بیٹی آگئی ہے.....“

”آ جائے“ کہیں دور سے آواز آئی..... شادو پلٹی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تلاش کرنے لگی.....

روز کی طرح اسے زیادہ تگ و دو نہ کرنا پڑی..... میٹی کی منڈیر کے پاس ہی رتو کھڑی تھی۔ اس نے لپک کر اسے پکڑ لیا.....

”چور چور.....“ شادو نے شور مچا دیا اور چھپی ہوئی لڑکیاں قہقہے لگاتے دوڑ دوڑ کر ادھر آنے لگیں۔

”رتو چور..... رتو چور.....“ سب نے شور مچا دیا۔

”نہیں جی.....“ رتو بولی ”میں تو چھپی نہیں تھی.....“

”نہیں چھپی تھی تو ہمیں کیا“ صاحبان بولی۔

”اب باری دے..... چل“ شادو نے کہا۔

”نہیں بھی“ رتو مچلی۔

”کیوں جی“ نوراں نے پوچھا۔

”باری دو سیدھی طرح سے“ رحمت نے اس کی لمبی چوٹی پکڑ کر کھینچی۔

”میں کہتی ہوں۔ میں چھپی نہیں تھی تو باری کیوں دوں“ اس نے چوٹی جھٹکے سے

چھڑاتے ہوئے کہا۔

”قصور ہمارا تو نہیں.....“ برکت بی بی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”نہ سہی.....“ پر میرا بھی نہیں..... میں تو جا رہی تھی“ رتو بولی۔

”کہاں“ سب نے پوچھا۔

”نحو کو بلانے.....“ رتو نے کہا ”خدا جانے وہ کیوں نہیں آئی آج“

”ہاں۔ نحو کیوں نہیں آئی۔ ہم نے تو خیال ہی نہیں کیا“ سب ہی بولیں۔

”میری تو سہیلی ہے نا پکی پکی.....“ رتو نے کہا ”مجھے تو خیال آنا ہی تھا۔ میں تو

اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ آئی نہیں.....“

”آئی ہوگی“ شادو نے شوخی سے رتو کے کان میں کہا۔ پھر ہاتھ سے درختوں کی

طرف شوخ سا اشارہ کیا۔

رتو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے آہستگی سے کہا ”بانسری بج رہی ہے بند تو نہیں

ہوئی.....“

دونوں نے اک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”کیوں ہنس رہی ہو۔ ہمیں بھی تو بتاؤ.....“ صاحبان ان کے قریب آ گئی۔

”اپنی بات ہے“ دونوں ہنس پڑیں۔

”اچھا ہم سے چھپ چھپ کر باتیں کر رہی ہو“ صاحبان نے غصے سے تڑی دی۔

باقی بھی اس کی تائید کرنے لگیں۔

”نہیں بھئی۔ نہیں“ شادو نے جلدی سے کہا..... ”نحو آج نہیں آئی..... پتہ نہیں

کیا بات ہے۔“

”کوٹلا چھپا کی کھیل رہی ہوگی۔“

”نہیں وہاں بھی نہیں ہے۔“

”ککلی ڈال رہی ہوگی۔“

”وہاں بھی نہیں ہے۔“

”جھومر ڈالنے کا اسے بڑا شوق ہے۔“

”نہیں ہے، نہیں ہے وہاں بھی نہیں ہے۔ میں دیکھ آئی ہوں..... آج وہ آئی

نہیں۔“

”پتہ کرنا چاہیے۔“

”میں جا تو رہی تھی۔ شادو نے پکڑ کر چور بنا دیا۔“

”چلو چلتے ہیں..... اس کے بغیر تو کھیل کا مزہ ہی نہیں۔“

”چلو.....“

”چلو“

پانچ چھ لڑکیاں رتو کے ساتھ نحو کو لینے اس کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ باقی

جھومر ڈالنے والے ٹولے کی طرف چلی گئیں۔ گدا اور جھومر لوک ناچ اس گاؤں کی الہڑ

دوشیزاؤں کو بہت مرغوب تھے۔



”ماسی“

”ہاں“

”ماسی ابھی تک میرا دیر نہیں آیا۔“

”آجائے گا نجورانی..... شہر گیا ہوا ہے۔ دیر سویر ہو ہی جاتی ہے اور ابھی تو شام

ہی ڈھلی ہے.....“

”شام ڈھلے بہت وقت ہو گیا ہے۔ میرے جی کو کچھ ہورہا ہے ڈر لگ رہا ہے۔“

”پگلی..... ادھر آ جا میری چارپائی پر..... میرے ساتھ لیٹ جا۔ ڈرنے کی تو

کوئی بات نہیں..... تو کیسی ملکوں کی دھی ہے..... تجھے تو ڈر لگنا ہی نہیں چاہیے.....“

”یہ بات نہیں ماسی“

”تو پھر“

”بس بھائی جی کو دیر ہو جائے نا..... تو پھر مجھے ہول آنے لگتا ہے.....“

”بھائی کی دیوانی بیٹی۔ تیرا بھائی شیر ہے شیر.....“

”میرا بابا بھی تو پہلاں والی کا شیر مشہور تھا“

”ہاں“

”پھر ظالموں نے کیسے ذرا سی بات پر مار ڈالا.....“

”اسے دھوکے سے مارا..... دشمن کمینہ تھا نا..... سامنے سے ایک چھوڑ دس آدمی

بھی وار کرتے تو وہ کوئی مات کھانے والا تھا.....“

”ماسی۔“

”جی رائے۔“

”میرا بابا بہادر تھا۔“

”ہاں نڈر بے باک اور بہادر۔ سچی بات پہ اڑ جانے والا.....“

”میں کتنی تھی۔ جب بابا قتل ہوئے۔“

”یہی دو تین سال کی ہوگی۔“

”دشمنی کس سے تھی۔“

”اس کی تو کسی سے نہیں تھی بیٹی..... پر خار بازی خاندان در خاندان چل رہی

تھی..... پچھلی صدی میں ان کے خاندان کا کوئی آدمی ہمارے خاندان والوں نے مار ڈالا تھا.....“

”پھر۔“

”پھر ان کے خاندان والوں نے ہمارا آدمی مار ڈالا.....“

”اور پھر ہمارے دادا کے بھائی نے سکھروں کا لڑکا قتل کر دیا.....“

”ہاں.....“

”پھر میرے بابا کی باری آ گئی.....“

”نجورانی“

ماسی اپنی چارپائی میں اٹھ بیٹھی۔ کھیس ٹھیک کیا۔ پھر گاڑھے کی چادر کی بنگل

ماری..... اور موٹے رنگین پایوں والے نواری پلنگ پر لیٹی نجو کو دیکھا۔ سُرخ کنی دار کھیس اور

پھول پتوں والے کڑھے سرہانے پر سر رکھے نجو لیٹی تھی..... وہ پٹی سے چٹنی ہوئی تھی.....

لالین کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی..... سندور گندھے میدے کی سی رنگت سیاہ

گھنے بال کالی بڑی بڑی آنکھیں چھوٹی سی کول ناک گلابی بھرے بھرے ہونٹ اور کالے

گرتے سبز اوڑھنی میں لپٹا خوبصورت جسم۔ ملک رحمت علی کی یہ اکلوتی بیٹی اب ملک فضل علی

کی اکلوتی بہن تھی۔ باپ قتل ہو گیا تھا۔ ماں چند سال پہلے مر گئی تھی۔ بھائی نے ماں اور باپ

کا پیار دیا تھا۔ اتنی بڑی حویلی میں اکیلی نجو کا رہنا مشکل تھا۔ اس لیے دور کی ایک رشتہ دار

جس کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا..... عمر رسیدہ اور نیک عورت تھی۔ اسے نجو کے لیے حویلی میں

بلا لیا گیا تھا۔

ماسی راہو فضل اور نجد دونوں کی ماں نہیں تھی، لیکن ماں کا پیار دیتی تھی۔ دونوں بہن بھائی بھی اس سے مانوس تھے۔۔۔۔۔ بہت پیار کرتے تھے۔ ماں ہی سمجھتے تھے۔ گھر میں اس کی موجودگی دونوں کے لیے تسلی کا باعث تھی، ورنہ اب تو وہ خاصی عمر کی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ نظر بھی ٹھیک طرح سے نہ آتا تھا۔۔۔۔۔ پھر بھی گھر میں ہونا غنیمت تھا۔

کام کاج کے لیے تو بہترے لوگ تھے۔ بکومراٹی اور اس کی بیوی حویلی کے پچھلے کمروں میں رہتے تھے۔ ان کی تینوں بیٹیاں گھر کا سارا کام کرتی تھیں۔ فضل نے انہیں فکر معاش سے بھی آزاد کر دیا تھا۔ میراٹی تھے، لیکن وہ انہیں گھر کے افراد ہی کی طرح سمجھتا تھا۔ یہ لوگ اپنی حیثیت نہیں بھولے تھے۔ مالک کو مالک ہی سمجھتے تھے۔۔۔۔۔ اور مالک کی خدمت بڑی دلجوئی اور تن دہی سے کرتے تھے۔

ڈھور ڈنگروں کو سنبھالنے والے اور بھی کامے موجود تھے۔ پھر گاؤں کے نائی، دھوبی، میراٹی سبھی کام کرنے کو موجود ہوتے۔ ان کی بہو بیٹیاں بھی ضرورت پڑنے پر حویلی آ جاتیں۔۔۔۔۔ اور ماسی راہو ان سے کام کروا لیتی تھی۔

ملک فضل علی کی چار مربع زمین تھی، زمین تو کافی تھی، لیکن کچھ باپ کے مقدمے کی نذر ہو گئی تھی، کچھ پر سوتیلے چچا کے بیٹوں نے قبضہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ فطرتاً رحمدل اور صلح جو آدمی تھا۔ اس لیے کچھ زیادہ باز پرس نہ کی تھی۔ اسی زمین کے سینے سے سونا اگلتی فصلیں اگاتا تھا۔

سکھیروں سے خاندانی دشمنی چلی آتی تھی، لیکن فضل نے اس دشمنی کو دل سے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ دشمنی تباہی کی طرف لے جاتی تھی۔ اس لیے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ سکھیروں سے باوجود اس کے کہ وہ اس کے باپ کے قاتل تھے، کوئی پر خاش نہ رکھے گا۔

سکھیرے ساتھ والے گاؤں ہڑیالہ کے باسی تھے۔ کئی مربع زمین کے مالک تھے۔ اونچے شملے والی پگڑیوں اور آگ نکالتے ٹاپوں والے گھوڑوں کے لیے ارد گرد کے کئی گاؤں پر اثر انداز تھے۔ کبھی کسی زمانے میں ایک سکھیرا خاندان یہاں آباد ہوا ہوگا، لیکن اب پھلتے پھلتے کئی خاندان بن گئی تھے۔ زمینیں بٹ بٹ کر کم ہو گئی تھیں۔ پھر بھی ایک ایک

خاندان کے پاس پانچ پانچ دس دس مربع زمین تھی۔۔۔۔۔ انہی خاندانوں میں چودھری نذر کا خاندان تھا۔ اسی خاندان نے ملک رحمت علی کو کئی برس پہلے پانی کے جھگڑے کا بہانہ بنا کر قتل کر دیا تھا۔ اب چودھری نذر کے تین جوان بیٹے تھے۔ نذر کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔ دو بڑے بیٹے زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ لیکن تیسرا بیٹا تاج شروع ہی سے پڑھنے کے لیے شہر چلا گیا تھا۔ اپنے حصے کی دولت پر خوب عیش کرتا تھا۔ تعلیم تو بہانہ تھی۔ شہری بن کر چندا و باش لوگوں کی صحبت مل گئی تھی جو اس کی دولت سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے اور دوستی کے پردے میں لوٹ رہے تھے۔ تعلیم تو ادھوری چھوڑ دی تھی۔۔۔۔۔ لیکن کوٹھی خرید رکھی تھی۔۔۔۔۔ اور زیادہ وقت وہ وہیں گزارتا تھا۔ کبھی کبھی گاؤں آتا تھا۔۔۔۔۔

سکھیرے اور ملک آپس میں ملتے جلتے بھی تھے۔ بہت سے خاندانوں کی آپس میں شادیاں ہو چکی تھیں۔ صرف نذر کا خاندان تھا جس کی ملکوں سے کوئی رشتہ داری نہ تھی۔۔۔۔۔ دشمنی اب دب چکی تھی۔ ملک فضل علی کا رویہ دیکھتے ہوئے سکھیرے بھی اپنے رویے میں تبدیلی لے آئے تھے۔ لیکن دشمنی کا بیج تھا ضرور۔

اسی لیے جب بھی ملک فضل کو شہر سے آتے دیر ہو جاتی تو نجو کو ڈر محسوس ہونے لگتا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو یہ ڈر دل ہی میں دب لیتی۔۔۔۔۔ لیکن کبھی کبھی جب برداشت نہ کر سکتی تو ماسی راہو سے کہہ دیتی۔

ماسی سے آج بھی اپنے ڈر کا اظہار کر بیٹھی۔۔۔۔۔ ماسی نے اسے تسلی و تشفی دی۔  
”میرے پاس آ جا بیٹی!“ ماسی نے نجو کو بلایا۔  
نجو اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔ سبز ریشمی دوپٹہ ٹھیک طرح سے لپیٹا۔۔۔۔۔ پاؤں میں جوتی پہنی اور مٹی کے لپے ہوئے فرش پر آہستہ آہستہ چلتی ماسی راہو کے پاس آ بیٹھی۔  
ماسی نے حقے کی نئے منہ میں لگا کر حقہ گڑ گڑایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ ماسی نے دھواں نگلتے ہوئے کہا ”لیٹ جا میرے پاس“  
”میں بیٹھوں گی ماسی!“

”کھیلنے بھی نہیں گئی..... چلی جاتی تو وقت گزر جاتا.....“

”جب تک ویرجی نہیں آ جاتا..... میں کھانا کھاؤں گی نہ کھیلوں گی.....“

”تسلی رکھ..... کوئی کام پڑ گیا ہوگا..... تیرے لیے چیزیں بھی تو ڈھیر ساری لانا ہوتی ہیں اسے.....“

”خیر مانگ رائے..... سکھیروں کے ساتھ اب ہماری کون سی دشمنی ہے۔ باری تو اب ہماری ہے..... اور فضل نے انہیں دل سے معاف کر دیا ہے..... وہ..... تو.....“

ماسی کی بات ادھوری رہ گئی..... رتو اور چاروں دوسری لڑکیاں درد کر کرتی صحن میں آ گئیں۔

”نحو..... نی نحو.....“ انہوں نے آوازیں دیں۔

”کیا ہے“ نحو اٹھ کر دالان سے باہر آ گئی۔

”تیرا ستیاناس“ رتو نے اس کے مارا ”آئی کیوں نہیں کھیلنے“ تیرے بغیر تو مزہ ہی نہیں آتا..... چل جلدی“

”ہاں نحو..... جلدی کر..... بڑا مزہ آئے گا لگن مٹی کا“ شادو بولی

”میں نہیں جاؤں گی۔“ نحو نے کہا۔

”کیوں۔“

”میرا ویر شہر سے نہیں آیا ابھی۔“

”نہیں آیا تو آ جائے گا۔ فکر کی کیا بات ہے.....“

”بھائی فضل جیسے جیالے کے لیے فکر مند ہونا حماقت ہی ہے۔“

”بالکل..... کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔“

”چل آ.....“

”بھئی نہیں..... میں ویر کے آنے کے بعد آؤں گی.....“

نحو نے کہا تو رتو اس کے کان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے آہستگی سے بولی

”اور وہ جو ہنسی بجا بجا کر پاگل ہو رہا ہے.....“

”ہائے رتو۔ چپ رہ۔ وہ شرما کر ہولے سے بولی۔“

”رب دی قسم..... کب سے بانسری بجا رہا ہے راجو..... بے چارہ.....“

رتو اور شادو دونوں نحو کی ہمراز تھیں۔ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔ باقی لڑکیاں اندر ماسی راہ کو سلام کرنے چلی گئیں.....

رتو اور شادو کے اکسانے پر بھی نحو نہ گئی۔ اسے اپنے پیارے بھائی کا انتظار تھا۔ جان انکی ہوئی تھی..... کیسے جاتی۔

سکھیاں چلی گئیں۔

نحو گلی میں کتنی دیر کھڑی بھائی کی راہ تکتی رہی۔ راجو کا خیال بھی آ رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گزارنا اس کے لیے کتنا مشکل ہوگا۔

لیکن یہ سوچ کر بھی وہ رتو وغیرہ کے ساتھ نہ گئی.....



تانبے کی سی تپتی رنگت، بھاری بھاری مونچھیں، اونچا لانا باندھا، بھاری بھاری بھرا بھرا جسم، خوش مزاج، ہنس مکھ اپنوں کا کیا غیروں کا بھی دوست، دکھ سکھ میں کام آنے والا..... یہ تھا ملک فضل علی نجو کا پیارا پیارا ایک اکلوتا بھائی جس کے انتظار میں وہ کبھی دالان میں ٹہل رہی تھی، کبھی صحن میں کھڑی ہو جاتی، کبھی حویلی کے صدر دروازے پر جا کھڑی ہوتی..... حویلی کی پکی بیٹھک میں تیل کا لیمپ جل رہا تھا اور حویلی اور زمینوں پر کام کرنے والے تینوں چاروں افراد درری پر لیٹے لیٹے سو رہے تھے.....

”یا اللہ میرے بھائی کو خیریت سے لے آ“ کھلے آسمان پتلے نجو نے اپنا دوپٹہ پھیلا کر آسمانوں اور زمینوں کے مالک سے استدعا کی۔

”نحو رائے“ ماسی را بونے دالان سے آواز دی۔

”جی ماسی۔“

”ادھر آ۔ میرے پاس بیٹھ جا۔“

”کتنی دیر تو بیٹھی رہی ہوں۔“

”فکر کیوں کر رہی ہے پگلی..... کام پڑ گیا ہوگا..... اس.....“

ماسی را بونے کی بات ادھوری رہ گئی..... گلی میں فضل کی گھوڑی کے نپے تلے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اس کے پاؤں میں پڑی کڑیاں چھنک رہی تھیں۔ فضل کی گھوڑی جب سینہ تانے ٹھک ٹھک چلتی تو زمین کے سینے میں دل دھڑکنے لگتا تھا۔ گھوڑی اور گھوڑی کے سوار کو لوگ گردنیں موڑ موڑ کر دیکھتے تھے۔

ٹاپوں کی آواز دروازے پر رک گئی۔ گھوڑی مخصوص انداز میں ہنہنائی۔ نجو دوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا اس نے فضل کو گھوڑی سے اتر کر اس کی گردن

تھپتھپاتے ہوئے دیکھا۔

اس کا ویر..... پیارا ویر بخیریت واپس آ گیا تھا۔ تسلی کو اتنا ہی کافی تھا..... نجو بھاگ کر ماسی را بونے کے بستر میں آ گھسی۔

”لے آ گیا تیرا ویر“ ماسی را بونے حقے کو گڑ گڑاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ہاں ماسی۔“

”تو اب یہاں کیوں آ گھسی ہے۔ جا کر دیکھ تو اسے۔“

”میں نہیں بولوں گی اس سے۔“

”کیوں؟“

”بس..... اتنی دیر سے کیوں آیا ہے.....“

”اتنی بڑی ہو گئی..... پر پگلی کی پگلی ہی ہے۔ کہاں تو اس کے انتظار میں اتنی پریشان ہو رہی تھی۔ اور.....“

”سلام ماسی۔“ فضل گھوڑی صحن میں باندھ کر کمرے کے دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے بندل تھے۔

”جیتے رہو۔ جگ جگ جیو.....“

”نحو کہاں ہے ماسی.....“

ماسی کو نجو نے کمر پر تھپتھا کر چپ رہنے کو کہا۔

”اندر آ جا“ ماسی نے فضل سے کہا۔

وہ اندر آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑی چیزیں نجو کے پلنگ پر ڈال دیں۔ خود بھی پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا.....

نحو ماسی کے کھس میں چھپی لیٹی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں وہ نظر بھی تو نہ آ رہی تھی۔ فضل نے پھر پوچھا ”ماسی نحو کہاں ہے۔ کھینے گئی ہے.....“

”تو ہی بتا..... بھلا وہ جاسکتی ہے کھینے۔“

”تیرے پاس سو گئی ہے۔“

”سو سکتی ہے۔ جب تک تو نہ آئے.....“



”ہوں..... تو روٹھ کر پڑ گئی ہے۔“

”ہاں روٹھ گئی ہوں۔“ کھیس پرے ہٹا کر نجو چارپائی میں اٹھ بیٹھی۔ فضل کھلکھلا

کر ہنس پڑا۔

”ادھر آ.....“ اس نے بڑے پیار سے نجو کو بلایا۔

”نہیں آتی۔ نہیں آؤں گی۔“

”ناراض۔“

”ہاں۔“

”گھائے میں رہے گی۔ دیکھ تو کیا کچھ لایا ہوں شہر سے تیرے لیے۔“

”مجھے نہیں چاہئیں چیزیں۔ بس وقت پہ گھر آ جایا کرو۔ اتنا ہی کافی ہے۔“

”وہ چارپائی سے نکل کر آہستہ آہستہ فضل کی طرف آ گئی..... منہ بسورے اس

کے پاس آن کھڑی ہوئی.....

فضل نے اسے پیار سے اپنے قریب بٹھالیا..... اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا

”کتنی بار کہا ہے مجھ سے روٹھانہ کر۔“

”میں نے بھی تو کتنی بار کہا ہے کہ دیر سے نہ آیا کرو..... شہر سے تم جلدی نہیں

آ سکتے تھے؟“

”روٹی کھالی ہے۔“

”نہیں۔“

”چل پھر لا روٹی..... کھائیں.....“

”پہلے بتاؤ کیا کچھ لائے ہو.....“

فضل ہنس کر بولا ”چالا کو ماسی..... جا پہلے روٹی لا..... بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

نجو اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی باہر نکل گئی.....

”ماسی کو کھلا دی تھی۔ یا اسے بھی ابھی تک بھوکا مارا ہے۔“

”میں نے تو کھالی تھی پتر..... یہی تیری چپتی بھوکی بیٹھی ہے اب تک.....

تھوڑی دیر اور نہ آتا تو..... تو بس رورو کر بے حال ہو جانا تھا اس نے.....“

”ماسی کام بہت تھے..... شہر روز روز تو جانا ہوتا نہیں..... اسے کہہ کر بھی گیا تھا۔“

”دل کی بات ہے نا..... اس کی تو جان ہے تجھ میں۔“

مجھے بھی تو جان سے زیادہ عزیز ہے یہ..... بہن سے زیادہ مجھے بیٹی لگتی ہے.....

اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اب بھی بچی لگتی ہے..... جی چاہتا ہے اسے کندھوں پر اٹھائے پھروں

جیسے بچپن میں اٹھائے پھرتا تھا.....“

ماسی راہو نے حقہ گڑ گڑایا۔ پھر ہنس کر بولی ”اب ذرا پیار کم کیا کرو..... جوان ہو گئی

ہے..... بیاہ کرنا ہے..... جدا کرنا ہے اسے.....“

”جانتا ہوں ماسی.....“

دونوں باتیں کرنے لگے..... نجو کے لیے دو تین جگہ سے پیغام آ چکے تھے.....

لیکن فضل نے ابھی تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا..... ماسی راہو اکثر احساس دلاتی تھی.....

آج بھی وہ نجو کے بیاہ کی باتیں کرنے لگی۔

”کرنا ہی ہے..... دیکھتی جا تو..... انشاء اللہ اپنی بہن کا اس دھوم دھام سے بیاہ

کروں گا کہ دنیا دیکھے گی.....“

”میری مرضی تو یہ ہے کہ پہلے اپنا کر گھر میں دوہٹی آ جائے..... پھر نجو کو پرانی

کر دیں گے.....“

”اوں ہوں۔“

”کیوں۔“

”پہلے نجو کی ڈولی اٹھے گی پھر بیگاں اس گھر میں آئے گی۔“

”بچیا..... بیگاں تیری بچپن کی منگ ہے۔ سیکینہ کئی بار مجھے کہہ چکی ہے اشاروں

اشاروں میں.....“

”پھوپھی کی بھلی کہی تو نے..... مجھے بھی کہتی ہے..... لیکن میں نے دل میں

عہد کر لیا ہوا ہے..... نجو کی شادی کے بعد ہی اپنی شادی ہوگی.....“

”یہ کیا بات ہوئی۔“

”بس.....“

”چار دن نجو کو بھی بھابھو کے ساتھ مل جل کر رہ لینے دے..... تو اسے جتنا پیارا ہے بیگاں بھی اتنی ہی عزیز ہے۔“

”ہاں ماسی میں جانتا ہوں..... اسی لیے تو کہتا ہوں کہ نجو کی شادی کر کے اپنی شادی کروں گا..... ڈرتا ہوں پہلے بیگاں یہاں آ گئی..... تو کہیں نند بھابی والا چکر نہ شروع ہو جائے۔“

ماسی رابو کے پوپلے سے منہ سے قہقہہ پھیل گیا ”اچھا یہ بات ہے۔ سیانا ہے تو واقعی.....“

”شک ہے کوئی ماسی میرے سیانا ہونے میں.....“

”ہاں ہے۔“ ماسی کی جگہ نجو بولی بھائی کے لیے کھانا لے کر آ گئی تھی.....

”ٹھہر تو۔ کیا کہا تو نے..... کان مروڑ دوں گا.....“ فضل نے دھونس جمائی۔

”ہائے ہائے ہائے.....“ اٹھلاتے ہوئے نجو بولی۔

فضل اٹھ کر ہاتھ دھونے چلا گیا۔ نجو نے چنگیر میں روٹی ساگ کی تھالی اور مکھن

کا پیالہ رکھا..... دودھ کا کٹورہ پلنگ کے قریب زمین پر رکھ دیا۔

فضل آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے نجو بھی بیٹھ گئی..... دونوں کھانا

کھانے لگے۔

”کیا کچھ لائے ہو ویرجی!“ نجو نے نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی دیکھ لینا۔“ فضل مکھن نوالے میں لپیٹتے ہوئے بولا۔

”بتاؤ نا.....“

”روٹی نہیں کھائی جائے گی۔ جب تک جان نہ لے گی کہ کیا کچھ آیا ہے۔“

”بالکل.....“

”بتاؤں۔“

”ہاں۔“

”تیرے لیے لال جوڑا لایا ہوں۔“

”لال کیوں میں نے تو پیلے پھولوں والا کہا تھا۔“

”لال جوڑا تیرے بیاہ کے لیے.....“

”جھوٹ..... اپنی بیگاں کے لیے لائے ہو گے نا۔“

”بیگاں سے پہلے تجھے پہناؤں گا۔“

”میں نہیں بولتی۔“ نجو نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ فضل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر

نوالہ تھماتے ہوئے کہا ”پگلی کھانا کھالے پھر روٹھنا.....“

وہ ہنس پڑی۔

فضل اسے شہر سے لائی ہوئی چیزوں کی تفصیل بتانے لگا۔ نجو خوش ہو گئی.....

پیارے بھائی کو دیکھا..... کتنا اچھا تھا اس کا ویر..... اس کے دل سے بھائی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ برتن اٹھا کر لے گئی۔ فضل بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آ کر نجو ایک ایک چیز کھول کر دیکھنے لگی۔

زیور کا جڑاؤ سیٹ..... لال جوڑا..... کانچ کی چوڑیاں اس کے علاوہ گھر کے استعمال کی کئی چیزیں تھیں۔

سب چیزیں اٹھا کر اس نے سنبھال دیں.....

پھر بستر میں لیٹ گئی۔

جڑاؤ زیور اور لال جوڑا..... وہ جھلمل جھلمل کرتی آرزوؤں کی حسین دنیا میں کھو گئی..... اسے بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ جاگتی رہی.....

وہ

تو

اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔ جب راجو ہنری پر دگداز نغمہ گنگناتے ہوئے گلی سے گزرا تھا.....

”بے چارہ“ وہ پھول کی طرح کھل اٹھی تھی اور پھر اسی مسکراہٹ میں ڈوبی ڈوبی سو گئی تھی۔

یا قوتی رنگ کے دبیز قالینوں، موٹے موٹے مخملیں پردوں، نرم نرم صوفوں، گدے دار منقش کرسیوں، بڑی بڑی دیوار گیر پینٹنگوں اور جھلمل جھلمل کرتے کرٹل کے فانوسوں والے بڑے سے ڈرائنگ روم میں گل پروشے نے قدم رکھا تو بت بن گئی۔ پھیلی پھیلی شربتی حیران آنکھوں سے درو دیوار کو دیکھا اور پھر جیسے یہ سب کچھ ہونے کا یقین نہ آیا۔ اپنے برابر کھڑے اونچے لائے خوبصورت جوان کو پکڑ لیا..... گل پروشے کے لیے تو موٹر ہی عجوبہ تھی۔ اب یہ گھر.....

انگریزی لباس میں ملبوس جوان اس کی بے ساختہ حرکت پر مسکرا دیا۔  
”گل پروشے“ نو جوان نے اس کی اسی کمر کے گرد بازو ڈالا..... اور اسے اندر لے جا کر ایک پکلیے صوفے پر بٹھا دیا۔

گل پروشے نے اپنے چاند جیسے چہرے پر جھک آنے والے بال پیچھے ہٹائے اور اپنی حیرانگی سے پھیلتی شربتی آنکھیں قیمتی ان دیکھی چیزوں پر گاڑ دیں۔  
”سرتاج“ وہ سہمی سہمی نظر آرہی تھی۔

”صرف تاج کہو گل پروشے۔ میرا نام سردار تاج محمد سکھیرا ہے۔“

”تاج“ سردار..... سکھیرا.....“ وہ آہستہ آہستہ بولی۔

”ہاں“ وہ اس کے پشتون لہجے پر مسکرایا۔

”مجھے یہاں ڈر لگتا ہے تاج۔“ گل پروشے پٹھانی لہجے میں بولی۔

”کیوں“ وہ مخمور نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”پتہ نہیں ام ایڈر کیسے رہے گا۔“

”تم اپنے گھر میں آئی ہو گل پروشے اور اپنے گھر میں بھی کوئی ڈرتا ہے۔“

”یہ..... یہ گھر میرا ہے۔“

”ہاں..... بالکل..... کیا میرا تمہارا نکاح نہیں ہوا۔“

”ہوا ہے۔“

”پھر.....“

”میں نے..... میں نے ایسا گھر پہلے کبھی نہیں دیکھا سردار۔“

تاج اس کے قریب بیٹھ گیا..... اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر کے اسے اپنے پہلو میں گھسیٹ لیا..... وہ سہمی سہمی اس کے ساتھ لگ گئی۔

تاج نے اس کے گالوں پر جھونے والی لٹوں کو ہونٹوں سے چھو لیا..... گل پروشے ابھی تک حیرانگی کا پیکر بنی تھی۔ سولہ سترہ سالہ پہاڑی دوشیزہ جو پتھر کے گھروں میں رہنے کی عادی تھی۔ جونگی زمین پر سوتی تھی، جس کے اوپر پیوند لگی گدڑی کا لحاظ ہوتا تھا..... آج سپنوں سے بھی زیادہ حسین گھر میں آ گئی تھی.....

تاج نے گھنٹی بجائی۔ نوکر آ گیا۔ دیہاتی قسم کا آدمی تاج کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”جی صاحب جی۔“

”چائے لاؤ..... ساتھ کھانے کے لیے بھی کچھ ہو۔“

”اچھا صاحب۔“

”جلدی۔“

”بہتر۔“

علما پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ تاج گل پروشے سے پھر چھیڑ چھاڑ کرنے لگا..... گل پروشے جو ابھی تک اس طلسماتی ماحول سے سہمی سہمی تھی۔ تاج کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ نہ ہو سکی.....

”یہ..... یہ سب کچھ تمہارا ہے تاج۔“ اس نے جیسے خواب سے چو نکلتے ہوئے

کہا۔

”میرا نہیں تمہارا ہے میری جان۔“ تاج نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا.....

اور خوشیوں کی انوکھی، انجانی اور اچھوتی سی لہر گل پروشے کے نرم و گداز اور خوبصورت جوان جسم میں دوڑ گئی۔

”چائے پی کر تمہیں سارا گھر دکھاؤں گا۔“ اس نے گل پروشے کے نرم پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر کہا۔ ”تم اس گھر کی رانی ہو۔ گل پروشے رانی.....“

”سچ“ گل پروشے بے اختیارانہ اس سے لپٹ گئی..... ”سردار تم بوت اچا ہے۔“ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی..... چائے کے ساتھ کھانے کے لیے میٹھی اور نمکین چیزیں تھیں.....

تاج نے چائے بنا کر گل پروشے کو دی۔ پھر اپنے لیے پیالی بنائی۔ اب گل پروشے کچھ کچھ نارمل ہو رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیار بھری نشیلی نشیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے چائے پی۔

چائے کے بعد تاج گل پروشے کو گھما پھرا کر گھر دکھانے لگا..... کھانے کا کمرہ بیڈرومزلان کچن سٹورسب کچھ دکھایا..... اپنی خواب گاہ میں اسے لایا تو گل پروشے پھر حیران حیران نظروں سے چیزیں دیکھنے لگی.....

”یہاں بیٹھو۔“ تاج نے اسے چکیلے گدوں والے پلنگ پر بٹھادیا۔

”گھبراؤ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا.....“

گل پروشے سوات کی رہنے والی تھی۔ سیدو شریف کے قریب ہی اس کا گاؤں تھا۔ قلقل کرتے چشموں، لہلہاتے سبزو اور سبز پتھر لے پہاڑی علاقوں میں پلی یہ لڑکی پھولوں کی طرح شگفتہ تھی۔ لیکن پتھروں کی طرح سخت بھی تھی۔ بچپن میں والدین مر گئے تھے۔ سیدو شریف کے ریست ہاؤس کے چوکیدار خان بابا نے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ جانے وہ اس کا کچھ لگتا بھی تھا کہ صرف خدا ترسی سے پناہ دی تھی۔ خان بابا تو اچھا آدمی تھا، لیکن اس کی بیوی بی بی ظالم عورت تھی۔ گل پروشے نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، لاتوں، گھونسوں اور ٹکوں کو ہی اپنے جسم پر محسوس کیا تھا۔ گالیاں سنتے سنتے کان پک گئے تھے۔ سارا دن مشقت کرتی، جنگل میں لکڑیاں جن جن کر بڑے بڑے گٹھے سر پر اٹھا کر لاتی، بکریاں چراتی، بی بی کے بچوں کو سنبھالتی، وقت بے وقت گڑ کی چائے بی بی کے لیے بناتی۔ بی بی

چار پائی پر بیٹھے بیٹھے صرف حکم چلایا کرتی تھی۔

گل پروشے حساس لڑکی تھی۔ پیار کے دو بول سننے کو ترستی تھی۔ اس کے اندر کی گل پروشے پیار نہ پا کر وحشی اور خونخوار ہو گئی تھی..... کئی دفعہ اندر کی گل پروشے چاہتی کہ بی بی کا سوتے میں گلا گھونٹ دے۔ اس کے بچوں کو اٹھا کر دریائے سوات کے تیز رفتار پانیوں میں پھینک دے۔ بی بی کے پتھر لے گھر کو تھس تھس کر دے۔ وہ سوتے میں بھی ایسے ہی وحشیانہ خواب دیکھتی..... اس کے اندر نفرت، کدورت اور انتقام کی آگ بھری ہوئی تھی۔

پچھلے ہفتے ریست ہاؤس میں تاج اپنے چار دوستوں کے ساتھ آیا۔ تاج نے نئی گاڑی خریدی تھی۔ ان دنوں گاڑیاں سرکاری افسروں کے پاس ہوتی تھیں۔ انگریز بہادر گاڑیوں اور جیپوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ شہر کے کسی کسی رئیس نے گاڑی خریدنے کی ہمت کی تھی..... سردار تاج محمد سکھیرا کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہی ہوتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی کے علاوہ ٹبر کا بزنس بھی تھا..... اسی سلسلے میں سوات آنا جانا تھا۔ گاڑی ضرورت بھی تھی اور ظاہری ٹھاٹ باٹ اس کے متقاضی بھی تھے..... دوستوں کو سیر کرانے اور بزنس کی خاطر وہ سوات آیا تھا۔

گل پروشے، خان بابا کے پاس جانے کیا لینے آئی تھی کہ تاج محمد کی نظر اس جنگلی پھول پر پڑ گئی.....

گل پروشے نے اس وقت چھینٹ کا گھیردار کرتے تنگ موری کی بھاری شلوار اور کالی چادر سر سے پیچھے کی طرف ڈال رکھی تھی، لباس اتنا میلا اور اس قدر بوسیدہ تھا کہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کس کپڑے کا بنا ہے..... اتنے پیوند اور اتنے سوراخ تھے کہ اصلی کپڑا ہی گم ہو چکا تھا..... لیکن کچھڑ میں کنول کی مثال صادق آتی تھی۔ اس کا سرخ و سپید بے داغ چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا اور ماتھے پر کٹے بال اس چاند کی خوبصورتی میں بے بہا اضافہ کرتے تھے۔ تاج صرف لکڑی ہی کا بیوپاری نہ تھا۔ عورت بھی تجارتی مال کی طرح اس کی زندگی میں آتی تھی..... گل پروشے کو دیکھا تو چل گیا۔ اتنا ہر قیمت پر حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ دوستوں سے ذکر کیا..... جو بات ان سب کو انہونی لگ رہی تھی۔ وہ پل بھر میں ہو گئی.....

خان بابا اور بی بی تو گل پروشے سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ سو دو سو میں بھی اس

کا سودا کر لیتے..... وہ تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ جب بولی شروع ہی ایک ہزار سے ہوئی ایک ہزار کا تو ان کے لیے تصور بھی ممکن نہ تھا۔

سودا طے ہوا تو بی بی نے گل پروشے کو نہلا دھلا کر نیا جوڑا پہنایا..... اور تاج کے حوالے کرنا چاہا.....

گل پروشے سب کو دیکھ رہی تھی سن رہی تھی..... لیکن اپنے آپ کو تاج کے حوالے کرنے سے پہلے بولی

”نکاح کے بغیر ام اس کے سات نہیں جائے گا.....“

خان بابا اور بی بی کو تو ہاتھ پاؤں پڑ گئے..... ایک ہزار ان کے لیے قارون کا خزانہ تھا۔ گل پروشے کی ضد اور اکڑ سے واقف تھے۔ پہاڑ ٹل سکتے تھے لیکن وہ اپنی بات جو کہہ دے اس سے نہ ٹلتی تھی۔ جبر و تشدد بھی اس کی ضد نہ توڑ سکتے تھے۔

تاج کو پتہ چلا تو ہنس دیا..... ”کیا فرق پڑتا ہے..... نکاح کر دو۔“

اسے واقعی کیا فرق پڑتا تھا..... نکاح ہو یا نہ ہو..... عورت اس کے لیے رنگین کھلونا تھی..... جب تک جی بھرتا اس سے کھیلتا..... پھر پھینک دیتا۔

چنانچہ

مشکل حل ہو گئی.....

اور

تاج گل پروشے سے نکاح کر کے اسے اپنے گھر لے آیا۔ گل پروشے کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا..... گاڑی اس کے لیے نئی چیز تھی۔ وہ سارا راستہ خوف کھاتی کبھی خوش ہوتی رہی.....

اور

جب گھر آئی تو گھر اور اس کی آرائش و زیبائش دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔

بڑی سڑک پر سفید گھوڑی سینہ تانے دوڑی جا رہی تھی۔ فضل پھوپھی سکیمنہ کے ہاں جا رہا تھا۔ بیگیاں کو دیکھے کافی دن ہو گئے تھے۔ کئی دنوں سے وہ کھیتوں پر بھی نہ آ رہی تھی۔ حالانکہ مونجی کی فصل سمیٹی جا رہی تھی۔ پھوپھی سکیمنہ اس کے تینوں بیٹے، چھوٹی بیٹی فضلاں اور کنبے کے سارے افراد کھیتوں میں موجود ہوتے تھے۔

سنہری دھوپ چمک رہی تھی اور فضا میں چادلوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ راوی اور چناب کے درمیانی علاقوں میں میلوں میل پھیلے گاؤں مونجی کی مہک دے رہے تھے..... چاول اس علاقے کی مشہور فصل تھی..... کلیوں کی طرح کی خوشبودار باسستی کے لیے تقریباً سارے گاؤں مشہور تھے۔

فضل گھوڑی دوڑائے کوٹلی جا رہا تھا۔ یہ ہڑیا لے کے ساتھ ہی چھوٹا سا گاؤں تھا..... دونوں گاؤں کی زمینیں ایک دوسرے سے پیوست ہی تھیں..... فضل کی رشتہ کی پھوپھی یہاں بیاہی تھی۔ اس کا خاوند بشیر اس گاؤں کا نمبردار بھی تھا۔ سکیمنہ کی دوسری بیٹی بیگیاں فضل کی منگ تھی۔ بچپن ہی میں رشتہ طے ہو گیا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، بیگیاں اور فضل کے بندھن مضبوط ہوتے گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔

بھرے بھرے مضبوط جسم، گندمی رنگت اور کالے بالوں اور بڑی بڑی ہرنی ایسی آنکھوں والی بیگیاں نجو کی بھی بڑی چہیتی تھی۔ دونوں رشتہ کی بہنیں بھی تھیں، لیکن بہناپے سے زیادہ دوستی تھی۔ بڑی پکی سہیلیاں تھیں..... پہلے پہلے تو بیگیاں بھی نجو کے ہاں آ جاتی تھی۔ ہفتہ ہفتہ رہ کر جاتی تھی۔ لیکن اب وہ نہیں آتی تھی۔ پھوپھی سکیمنہ مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اب تو نجو ہی اسے ملنے آیا کرتی تھی۔

آج نجو کا بھی جی چاہ رہا تھا اور اس نے فضل سے کہا بھی تھا ”ویر مجھے کوٹلی چھوڑ آؤ۔“

”کیوں۔“ فضل زیر لب مسکرایا تھا۔  
 ”بیگاں سے ملنے کو جی کر رہا ہے۔“  
 چلو تمہاری جگہ میں مل آتا ہوں۔“  
 ”تم وہاں جا رہے ہو۔“  
 ”ہاں۔“

”پھر مجھے کیوں نہیں لے جاتے۔“

”کبھی تو اکیلے جانے دیا کرو۔“ فضل ہنس کر بولا تھا تو نجو بھی ہنس پڑی تھی۔

”جاؤ جاؤ..... ٹھیک ہے۔“ اس نے فراخ دلی سے اجازت دے دی تھی۔

فضل اس کے سر پر تھپکی لگا کر بولا تھا۔ ”مجھے اور بھی کام ہیں شاید شہر بھی جانا پڑے..... ورنہ تجھے ضرور ساتھ لے چلتا..... چل وعدہ رہا کل کوئی کام نہ ہوا تو چھوڑ آؤں گا۔“

”اب فضل کوٹلی جا رہا تھا..... اس کی سفید گھوڑی اڑی جا رہی تھی..... پکی سڑک پر ٹاپوں کی مسلسل ٹک ٹک بڑی مترنم لگ رہی تھی.....

وہ بڑی سڑک سے کچی سڑک پر اتر..... اور ہڑیا لے کے ساتھ ساتھ جا کر کوٹلی جانے والی سڑک پر ہولیا.....

تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اس نے بڑے میدان میں لوگوں کو جمع دیکھا..... عورتیں مرد بچے بوڑھے جمع تھے۔ یوں جیسے میلہ لگا ہو۔

تجسس نے ابھارا وہ باگیں موڑ کر گھوڑی کو میدان کی طرف لے آیا۔

”کیا بات ہے بھائی۔“ اس نے ایک دیہاتی سے پوچھا۔ ”یہاں لوگ کیوں جمع ہیں۔ خیر خیریت ہے نا.....“

”ہاں بالکل خیریت ہے.....“ دوسرا آدمی بولا۔

”پھر لوگ کیوں جمع ہیں۔“

”یہاں تماشا ہونے والا ہے۔“ ایک معمر دیہاتن جو سر پر لٹی کا گڑوا اٹھائے تھی ہنس کر بولی۔

اور پیشتر اس کے کہ فضل کچھ اور پوچھتا پہلا دیہاتی بولا ”تاج سکھیرا موٹر لے آیا ہے..... پیہوں والی موٹر..... خود بخود چلتی ہے..... ولایت سے منگوائی ہے اس نے..... ابھی وہ میدان میں چلا کر دکھائے گا.....“

”اچھا.....“ فضل دیہاتیوں کے معصوم ذوق و شوق پر مسکرایا۔ دیہاتی عورتوں بچوں اور اکثر مردوں نے موٹر نامی چیز دیکھی تھی نہ سنی کچھ مرد ہی ایسے تھے جو شہر جاتے اور صاحب بہادروں کی موٹریں سڑکوں پر دیکھ لیتے..... دیہاتیوں کے لیے یہ اک عجوبہ تھا اور اسے دیکھنے صرف ہڑیا لہ ہی کے نہیں ارد گرد کے دوسرے گاؤں کے لوگ بھی جمع ہو رہے تھے۔

اپنے گاؤں کے کئی لوگ بھی فضل کو نظر آئے۔ کوٹلی کے کئی بندے بھی دیکھے..... شاہ پورا اور سوانی کے لوگوں کو بھی دیکھا۔

وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ بیگاں سے ملنے کی لگن تھی۔ وہ جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا..... اسے یقین ہو گیا کہ بیگاں گھر میں اکیلی ملے گی..... اکیلے میں ملنے کے تصور ہی سے وہ جھوم گیا۔

وہ بیگاں کے گھر کے سامنے گھوڑی کی باگیں کھینچ کر رکا..... دروازہ کھلا تھا اور کچا صحن نظر آ رہا تھا۔

گھوڑی سے اتر کر اس نے بیگاں کے بھائی کو پکارا۔ ”رحمے اور حمے۔“

رحما گھر تھوڑا ہی تھا.....

بیگاں کھرے پر بیٹھی دودھ کی چائی کو بچ رہی تھی..... ہاتھ میں کوچی پکڑے پکڑے لپک کر آئی..... فضل کی آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا..... مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور آنکھوں نے آنکھوں میں سرور و کیف کے جام اندیل دیئے۔

”تو کیسے آیا فضلے.....“ بیگاں لجا کر بولی۔

”اندر آنے کو نہ کہو گی۔“ وہ شوخی سے مسکرایا۔

”آ جاؤ..... پر گھر میں کوئی نہیں ہے۔“

”میں تو تیرے لیے آیا ہوں بیگاں۔“

”ہائے اللہ.....“

”بیگاں شرما کرو ہاں سے ہٹ گئی۔ فضل گھوڑی کو دروازے کے قریب باندھ کر اندر آ گیا۔“

”بیٹھ جا۔“ کھرے کے پاس پڑی چار پائی پر بیگاں نے کالی اور پہلی ڈبیوں والا کھیس بچھا دیا۔

فضل بیٹھ گیا۔ بڑے سے صحن کے ایک طرف دالان تھا۔ دوسری طرف چھوٹے کمرے دائیں طرف مٹی کی جھکی جھکی چھت والا برآمدہ تھا جس کے نیچے چولہے وغیرہ بنے تھے۔ یہ باورچی خانہ بھی تھا اور فالتو چار پائیاں رکھنے کی جگہ بھی..... رنگین پایوں والی نواڑی چار پائیاں وہاں کھڑی تھیں۔

کھرے پر دودھ کی چاٹی پڑی تھی جسے تھوڑی دیر پہلے بیگاں مانجھ رہی تھی..... صحن میں مرغیاں دانہ دنا چنتی پھر رہی تھیں..... دو تین نیم کے درخت بھی تھے..... کمروں کے سامنے گلاب کے بوٹے بھی تھے..... دو ایک پھولدار بیلین بھی دیواروں پر چڑھتی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے قریب ایلوں کی سلگتی آگ پر مٹی کی بڑی ہانڈی میں دودھ چڑھا ہوا تھا..... دھیمی دھیمی آگ پر ابلنے والے دودھ پر پیلی پیلی بالائی کی موٹی تہ جم گئی تھی۔

”کیسی ہو بیگاں۔ کہاں گھوم پھر رہی ہو..... ادھر آ کر بیٹھو میرے پاس۔“

”نہ جی۔“

”کیوں۔“

”شرم آتی ہے.....“

”بس۔“

بیگاں شرما کر مسکرا کر دیکھتے ہوئے پھر چاٹی دھونے بیٹھ گئی.....

”بیگاں۔“ فضل نے پکارا۔

”ہاں۔“ وہ اس کی طرف پشت کیے زوروں سے بازو ہلاتے چاٹی مانجھتے ہوئے

بولی۔

”میں تیرے گھر آیا ہوں۔“

”ہاں۔“

”اتنے دنوں سے تجھے دیکھا نہیں تھا..... آج آیا ہوں تو یوں کمر موڑے بیٹھی ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے مڑی اور کھرے کی بنی پر بیٹھتے ہوئے اس کو تنکنے لگی۔ ”دودھ پیو

گے یا سی۔“

”کچھ نہیں۔“

”خفا ہو گئے۔“

”ہاں۔“

وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں نقرئی گھنگروؤں کی کھنک تھی۔ فضل کا جی چاہا کہ اٹھ کر اسے بازوؤں میں دبوچ لے۔ غنیمت ہی تھا جو بیگاں اٹھ کر دودھ لینے چلی گئی۔

وہ بڑے سے لمبے گھونگٹ کے گلاس میں دودھ بھر لائی..... موٹی بالائی بھی اس نے دودھ میں ڈال دی۔

”لے۔“ اس نے کہا۔

فضل نے گلاس لے کر چار پائی کے پاس رکھ لیا..... اور شوخی سے بیگاں کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

”ہائے..... فضلے کیا کر رہا ہے..... ابھی کوئی آ جائے تو کوٹھے سے ہی کسی نے جھانک لیا تو.....“

”تو..... تو کیا ہوا“ فضل کی آنکھوں میں جیسے نشہ اتر رہا تھا۔

”تو میری منگ نہیں کیا.....“

بیگاں نے گھبرا کر اوپر چاروں طرف دیکھا بغیر منڈیروں کے چھت تھے۔ اکثر ہمسائیاں اوپر آ جایا کرتی تھیں۔

اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے فضل نے جھٹکا دیا۔

وہ اس کے اوپر گری۔ فضل نے جلدی سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ خود ہی

بوکھلا گیا۔

بیگاں گھبرا کر دالان میں بھاگ گئی۔  
فضل چند لمحے وہیں بیٹھا مسکراتا رہا۔ پھر دودھ کا گلاس پیا.....

”اندر آؤں۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”نہیں۔ فضلے نہیں.....“ بیگاں گھبرا رہی تھی۔

”اچھا..... نہیں آتا..... آ جا باہر۔“

”قسم کھارب کی مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا۔“

فضل نے قسم کھائی..... تو وہ ہولے ہولے چلتی باہر آ گئی۔

تھوڑی دیر فضل وہاں اور ٹھہرا..... محبت کی باتیں، محبت کی قسمیں، محبت کے وعدے..... دود یوانوں میں اور بات ہی کون سی ہو سکتی تھی۔

-----○-----

بنسری کے سینے سے دردیلے نغے پھوٹ رہے تھے۔ چاندنی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں خنکی رچی بسی تھی۔ دھیمے سر درد کی لہریں بن کر خنک چاندنی کے غبار میں پھیل رہے تھے۔

اور

دور

میدان میں گاؤں کی الہڑٹیاں اپنے روزمرہ کے کھیلوں میں مشغول تھیں۔ کچھ کوئلہ چھپا کی کھیل رہی تھیں..... کچھ لکڑی مٹی..... کچھ گدا ڈال رہی تھیں۔ کچھ جھومر اور کچھ چھون چھوئی کھیل رہی تھیں.....

چھون چھوئی کھیلنے والیوں میں نجو بھی تھی..... رتو چور بنی تھی..... اور سب لڑکیاں دوڑ دوڑ بھاگ بھاگ کر چور کے ہاتھوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ خوب شور مچا تھا۔ جو لڑکی پکڑی جاتی چیخ اٹھتی..... جو پکڑتے پکڑتے بچ نکلتی وہ اس سے بھی زیادہ چیخیں مارتی..... ہنس ہنس کر لڑکیاں جیسے پاگل ہو رہی تھیں۔  
رتو نے برکتے کو پکڑ لیا۔

”برکتے چور برکتے چور۔“ سب لڑکیاں تالیاں پیٹتے ہوئے شور مچانے لگیں۔  
برکتے کھیانی ہو رہی تھیں۔ رحم میراثی کی یہ بیٹی کبھی کسی کے ہاتھ تو نہ آتی تھی۔ آج رتو نے جانے کیسے پکڑ لیا۔

”اس درخت کے پاس کھڑی ہو جا۔“ شادو نے برکتے سے کہا ”جب میں آواز دوں گی تب پکڑنے دوڑنا۔“

برکتے درخت کے پاس لگ کر کھڑی ہو گئی۔ لڑکیاں جو گھیرے میں کھڑی تھیں



ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئیں۔

رتو اور نجو ساتھ ساتھ بھاگیں۔

بھاگتے بھاتے وہ درختوں کے گھنے سایوں تلے آ گئیں۔

”رتو۔“ نجو نے کہا۔

”ہاں۔“

”میں جاؤں اب۔“

”جا۔“

”کھیل ختم ہونے پر گھر نہ چلی جانا۔“

”تم جلدی آ جانا۔“

”کوشش کروں گی۔“

”نا بھی۔۔۔۔۔ زیادہ دیر لگائی تو میں گھر چلی جاؤں گی۔“

”اچھی سہلی ہے۔۔۔۔۔ تجھے پتہ بھی ہے میں کئی دنوں سے راجو سے نہیں ملی۔“

”اچھا۔ اچھا۔۔۔۔۔ جا۔۔۔۔۔ میں آدھی رات تک میدان میں تیرے انتظار میں بیٹھی

رہوں گی۔۔۔۔۔“

”اتنی زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔۔۔۔۔ آ جاؤں گی۔۔۔۔۔“

بنسری کی لے جوں جوں تیز ہو رہی تھی، نجو کی بے تابلی بڑھ رہی تھی۔ نغموں کا درد

وہ اپنے سینے میں مچلتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔۔۔۔۔

”جا بھی۔ کھڑی کیوں ہے۔ بیچارے کا بنسری بجا بجا کر برا حال ہو گیا ہے۔“ رتو

نے اسے دھکیلا۔۔۔۔۔

نجو نے رتو کا ہاتھ دبایا اور پھر چھوڑ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے درختوں تلے

ہوتی بنسری کی آواز کی سمت بڑھنے لگی۔

رتو چند لمحے رکی اور پھر بھاگتی ہوئی میدان میں جا پہنچی۔ برکتے ابھی تک کسی لڑکی

کو پکڑ نہ پائی تھی۔۔۔۔۔ دوڑنے بھاگنے والی لڑکیوں نے خوب اودھم مچا رکھا تھا۔۔۔۔۔ رتو کا جی

اب بھاگ دوڑ کو نہیں کر رہا تھا۔ وہ گداڑا لے والی لڑکیوں کے قریب چلی آئی، ارد گرد کھڑی

لڑکیوں کے ساتھ مل کر قدموں کی دھمک پرتالیاں بجانے لگی۔

نجو کسی پر اسرار روح کی طرح گھنے درختوں کے سایوں تلے سے گزر رہی تھی۔

کہیں کہیں پتوں سے چھن چھن کر چاندنی نیچے اتر رہی تھی ورنہ خشک سا اندھیرا ہی تھا۔۔۔۔۔ نجو

کو تو محبت کی روشنی راہ دکھا رہی تھی، جو وہ بے دھڑک بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

چودھری ظہور الہی کی زمینوں کے آخری سرے پر پھیلے بیٹھا پرانے درختوں تلے

راجو بنسری بجایا کرتا تھا۔ یہاں تنہائی ہی تنہائی ہوتی تھی۔ اس طرف لوگوں کا آنا جانا بھی نہ

ہونے کے برابر تھا۔ رات کے وقت تو کسی کے آنے کا امکان ہی نہ تھا۔۔۔۔۔ انہی درختوں

کے قریب پرانا کھوہ تھا جس کی منڈیریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ عورتیں تو عورتیں گاؤں کے مرد

بھی اس طرف سے نہ گزرتے تھے کہ سب کا خیال تھا، یہ کھوہ اب غیر آباد ہے اور اس میں

جنوں کا بسیرا ہے۔۔۔۔۔ کئی کہانیاں اس سے وابستہ تھیں۔۔۔۔۔ کئی لوگوں نے یہاں روہیں دیکھی

تھیں۔ کتنے لوگ بتاتے تھے کہ رات کے سناٹوں میں یہاں دوسائے نظر آتے ہیں جو کبھی

کھوہ کے اندر ڈوب جاتے ہیں اور کبھی منڈیر پر نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔

نجو بلا خوف بڑھے جا رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ کھوہ کے قریب سے گزری اور پگڈنڈی پر

ہوتی ہوئی غلیل کی شکل کے اس بوڑھے درخت کی طرف چل دی جس کے تنے پر بیٹھا راجو

بنسری کے دردیلے نغموں کا کرب فضا میں بکھیر رہا تھا۔

وہ ہولے ہولے چلتے اس کے قریب آ گئی۔۔۔۔۔

راجو آنکھیں بند کیے بنسری ہونٹوں سے لگائے انگلیوں کی خفیف حرکت سے

نغموں کا دل دھڑکا رہا تھا۔۔۔۔۔ چاندنی کا سحر چاروں طرف پھیلا تھا۔ درد ہی درد بکھرا تھا۔

نجو اسکے سامنے یوں کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔ جیسے کسی دیوتا کے سامنے دیو داسی کھڑی

ہوتی ہے۔۔۔۔۔ درد ابلتا رہا اور وہ بے تاب ہوتی رہی۔

اس نے راجو کو بلایا نہیں۔ طلسماتی سحر نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

لیکن

جب درد سے بنسری کا سینہ بھی شق ہونے لگا تو اس نے بے اختیارانہ آگے بڑھ

کر راجو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس راجو۔۔۔۔۔ بس کر۔۔۔۔۔“

وہ روہانسی..... ہو کر بولی۔

راجو کے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔  
 ”تو آگئی نجو..... تو آگئی.....“ بنسری ایک ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے نجو کے بازو کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا..... بے یقینی کے عالم میں وہ اسے تکے گیا.....  
 دوسرے لمحے نجو نے اپنا سر اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر ٹکا دیا۔  
 یقین کی منزل قدموں میں آگئی..... راجو نے بے صبری سے اسے اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا.....

راجو پہلاں والی ہی کا باسی تھا۔ نمبردار کی حویلی کے پہلو میں ہی مٹی کے چھوٹے چھوٹے کوٹھے تھے۔ راجو اپنی بیوہ ماں اور بیوہ پھوپھی کے ساتھ رہتا تھا..... کسی زمانے میں اس کے باپ دادا کے پاس بھی کئی مربع زمین تھی۔ لیکن اس کی پھوپھی صاحبان دشمن داریوں کی نذر ہو گئی..... اس کے شوہر اور سسرال والوں نے نصف صدی پہلے کا بدلہ یوں لیا کہ صاحبان کو بیاہ کر لے گئے..... پھر اغوا کروا دیا..... بدنامی ہوئی۔ مقدمے چلے اور مقدمہ بازیوں کی نذر زمینیں ہونے لگیں۔ اس پر بس نہ ہوئی صاحبان کا شوہر کسی اپنے دشمن سے مقابلے میں مارا گیا..... قتل کا مقدمہ صاحبان اور راجو کے باپ پر بن گیا..... پھر راجو کا باپ بھی گاؤں کی لڑائی میں سنگین لگنے سے مارا گیا۔ یوں رہی سہی زمینیں بھی مقدموں کے خونیں منہ میں چلی گئیں..... اب راجو کے پاس ذاتی زمین نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ بیگھے زمین بچی تھی جس میں موہی بنریاں ہی کاشت کی جاسکتی تھیں۔

راجو گاؤں کا کڑیل جوان تھا۔ اس جیسا خوبصورت نوجوان پہلاں والی کی دھرتی نے کم ہی دیکھا ہوگا..... بادامی آنکھوں اور گندی خوشوں کی رنگت والا یہ جوان بچپن میں اتنے دکھ بھوگ چکا تھا کہ دکھ درد دہشت کا ایک حصہ ہی بن گئے تھے۔ اس دکھ درد کو سکون دینے کے لیے اس نے بنسری کا سہارا لیا تھا۔ وہ بنسری بجاتا تو جیسے دل دھڑکنا بھول جاتے..... وقت تھم جاتا اور کائنات کی نبضیں رک جاتیں.....

اس بنسری سے پھوٹی دکھ کی لے ہی نے نجو کو راجو سے ملایا تھا۔ وہ بے اختیارانہ اس لے پر کھنچی چلی گئی تھی..... اور جب اس کے قدم رکے تھے تو سامنے راجو کو منزل کی طرح

منتظر پایا تھا.....

ملکوں کی بیٹی جس کے بھائی کے پاس بھی چار مربع زمین تھی؛ جس کی اونچے شملے والی پکڑی اور آہنی کھروں والی سفید گھوڑی گاؤں کی عزت کا نشان تھی؛ اک مفلس نوجوان کی محبت کی اسیر ہو گئی تھی؛ جس کے پاس زر تھا نہ زمین..... ہاں دل تھا۔ مندروں اور مسجدوں کی طرح مقدس..... جہاں خدا کے سائے میں محبت بستی تھی..... جو نجو کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

اور

جسے

نجو جی جان سے چاہتی تھی۔

”نجو“ راجو نے اسے آہستگی سے پکارا۔ دونوں اب ساتھ ساتھ غلیل نما درخت کے تنے پر یوں بیٹھے تھے..... جیسے جھولے میں پیر لٹکائے بیٹھے ہوں۔

”ہاں۔“

”تو روز کیوں نہیں آتی۔“

”روز کیسے آؤں راجو۔“

”کھیلے تو روز آتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ادھر آ جایا کر۔“

”روز کب کھیلے آتی ہوں۔“

”جھوٹی۔“

”رب دی قسمے.....“

”کیوں نہیں آتی روز۔“

”بس..... ویراب گھر دیر سے آنے لگا ہے..... اور تجھے بتایا ہے نا جب تک وہ

آنہ جائے اور میں اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا نہ کھالوں..... میں گھر سے باہر نہیں نکلتی.....“

”بڑا پیار ہے تجھے فضل سے۔“

”ہائے تجھے کیا بتاؤں راجو..... میرا ویر میرے لیے کیا ہے۔ جی چاہتا ہے قربان

ہو جاؤں اپنے ویر پر.....“

”سارا پیار ویر کو ہی دیدیا تو میرے لیے کیا بچے گا۔“ اس نے نجو کی موٹی پٹیا پکڑ

کر ہلکے سے جھٹکا دیتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔  
 ”تیرے لیے..... تیرے لیے.....“ وہ شوخی سے مسکرائی۔

”ہاں بتا..... نا۔“

”تیرے لیے میں۔“

”سچ نجو۔“

”ہاں راجو.....“

نچو نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ راجو کی بڑی بڑی پرسوں آنکھوں میں  
 مچلتے جذبوں سے اسے لاج آرہی تھی۔

راجو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا..... بلندیاں ہی بلندیاں پھیل گئیں۔ نگاہوں  
 کے سامنے..... وہ مسکورا اسے تکتا رہا..... پھر جیسے کوئی دھڑکا دل کی دنیا کو دہلا گیا۔ اس کی  
 طرف جھکتے ہوئے جلدی سے بولا..... ”نچو..... سچ کہہ رہی ہے کہ تو میری ہے۔“

”شک ہے کوئی..... تو آزما لے۔“

”نہیں..... شک نہیں ڈر ہے۔“

”کس بات کا۔“

”تو..... تو ملکوں کی بیٹی ہے نجو..... کہیں.....“

”تو تو کیا میرا شیوں کا بیٹا ہے.....؟ تیری ذات بھی تو اونچی ہے..... گو نڈل ملکوں  
 سے کم تو نہیں ہوتے.....“

وہ ہنس پڑی۔ ”راجو تو میرے دیر کے بارے میں غلط رائے قائم نہ کر۔ وہ تو  
 میری خوشیوں کے لیے جیتا ہے۔ میری آنکھوں میں میری مانگوں کو پڑھ لیتا ہے۔ یہ تو میری  
 ساری زندگی کی خوشی ہے تو اپنی بے بے ہمارے گھر بھیج تو سہی۔“

”حوصلہ نہیں پڑتا.....“

”بزدل ہے کیا؟“

”نہیں..... میری بہادری میں کسی کو شک نہیں۔ خود اپنے آپ کو بھی بھروسہ ہے.....  
 لیکن بے بے کو تیرے گھر دامن پھیلا نے بھیجوں اس بات کا حوصلہ نہیں.....“

”تو بیٹھارہ..... درختوں تلے بنسری بجاتے رہا کرنا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی.....  
 ”روٹھ گئی۔“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”مجھے کم حوصلہ لوگ اچھے نہیں لگتے۔“ وہ پیار سے بولی۔ ”جو کرنا ہوتا ہے کر گزرتا  
 چاہیے۔“

وہ چند لمحے سر جھکائے کھڑا رہا۔

نچو اس کے وجہ سر اپا کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تو تو نرا پاگل  
 ہے راجو۔“

”تو نے پاگل بنا دیا ہے.....“

وہ فخر سے مسکرائی..... چند لمحے دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔ پھر نچو نے  
 سنجیدگی سے کہا۔

”ڈر دل سے نکال دے راجو..... ہم دونوں کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ ہمارا میل تو  
 رب سچے نے خود کیا ہے.....“

”ہاں..... میں تجھے نہیں جانتا تھا۔ تو مجھے.....“

”تیری بنسری کی دردیلی لے نے مجھے کشاں کشاں کھینچا اور میں تیرے پاس  
 آ گئی تو بھی تو جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا.....“

”ہاں۔“

”راجو کی دیکھلی نے ہیر کا من موہ لیا تھا۔ تیری بنسری نے نجو کو باؤلی کر دیا۔“  
 ”راجو کی دیکھلی کی طرح کہیں میری بنسری بھی صرف فریادوں کی تڑپ کے  
 لیے نہ رہ جائے۔“

”جن کا میل رب کرتا ہے ان کے چہڑے کا سوال ہی نہیں ہوتا راجو۔“

نچو کے لہجے میں مونگے کی چٹانوں کی سی سختی اور بھرپور اعتماد تھا۔ راجو کا دوسووں سے  
 بھرپور دل حوصلہ پا کر مضبوط ہو گیا۔ اس نے خوبصورت نظروں سے نجو کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔  
 ساری فضا ساری کائنات ہی مسکرانے لگی۔

ماسی رابو صحن میں رنگین پایوں والی نواڑی چار پائی پر بیٹھی تھی۔ بکو میراٹی چلم بھر کے لے آیا تھا اور ماسی کے آگے رکھتے ہوئے خود فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی جیراں کھرے میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ اس کی تینوں بیٹیاں دالان اور کمرے صاف کر رہی تھیں۔ جارو اور رقیہ دالان میں پوچا پھیر رہی تھیں..... ڈبے میں لال لال سوندھی سوندھی خوشبو والی مٹی گھول کر پرانے کپڑے اس میں بھگو بھگو کر کچے فرش پر سلیقے سے پھیر رہی تھیں۔ کچے فرش کو صاف رکھنے اور دھول مٹی سے بچنے کے لیے پوچا پھیرنا ضروری تھا..... رقیہ کا جی تو کرتا کہ سارے گھر میں روز ہی پوچا پھیرا کرے۔ جارو ذرا کام چور تھی..... دوسرے چوتھے دن ہی تیار ہوتی اس کام کے لیے..... جیلاں نجو کے کپڑے تہ کر رہی تھی۔ نجولو ہے کا بڑا صندوق کھولے بیٹھی تھی..... فضل اس کے لیے شہر سے نئے کپڑے لایا تھا..... جنہیں وہ بکس میں ڈال رہی تھی..... یوں وہ جہیز جمع کر رہی تھی..... کچھ کپڑے بیگاں کے لیے بھی تھے۔ وہ جیلاں کو دکھا رہی تھی۔

”یہ جوڑا بیگاں کے لیے ہے۔ اس پر میں شہر سے گوٹا لگواؤں گی۔ ہائے اللہ وہ دن کب آئے گا جب بیگاں میری بھابی بن کر یہاں آئے گی۔“

”بھائی فضل بیاہ کرتا کیوں نہیں۔“ جیلاں بروکیڈ کا سوٹ تہ کرتے ہوئے بولی۔ وہ نجو کے قریب ہی فرش پر بچھے کھیس پر بیٹھی کپڑے تہ کر رہی تھی۔

نجو ہنس کر بولی۔ ”کہتا ہے پہلے تیری شادی کروں گا۔“

”میری؟“ جیلاں نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے نجو کو دیکھا۔

نجو ہنستے ہنستے بے اختیار ہو کر بولی ”تیری نہیں میری..... میری۔“

”ہاں..... میں بھی حیران ہوئی..... کہ.....“

”چل تیری بھی تو کرنی ہے نا..... تجھے تو میں اپنے جہیز میں ساتھ ہی لے جاؤں گی.....“

”رائیوں کے لیے نوکرائیوں کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے.....“

جیلاں نے نجو کی خوشامدی کی۔

”بس ٹھیک ہے..... تو میرے ساتھ ہی جائے گی.....“

”پھر بھائی فضل سے کہہ دیں کہ ایک نہیں دو رشتے ڈھونڈیں۔“

”ہاں.....“

دونوں ہنسنے لگیں.....

باہر صحن میں بکو ماسی رابو کو نئی نئی خبریں سنا رہا تھا۔ ماسی رابو کے لیے یہی لوگ پنڈ سے رابطہ کے لیے تھے۔ گھر گھر جاتے تھے اور رنگا رنگ خبریں اڑا لاتے تھے..... ویسے بھی گاؤں کی عورتیں ماسی رابو کے پاس جب وقت ملتا آ بیٹھتی تھیں۔ اسے ادھر ادھر کی خبریں سنا جاتیں۔ ماسی رابو نیک عورت تھی۔ تجربوں کی بھٹی میں جلتے عمر گزری تھی اس لیے لوگوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ برے بھلے وقت میں بھی لوگ اس کے پاس مشورے کے لیے دوڑے آتے..... دکھ تکلیف میں وہ اب بھی دوسروں کے کام آتی تھی۔

”وے بکے۔“

”ہاں ماسی۔“

”کل صادق کی چاچی بتا رہی تھی کہ سکھیروں کے چھوٹے منڈے تاج نے موٹر خریدی ہے.....“

”ہاں ماسی..... سنا ہے ولایت سے منگائی ہے..... کیا چیز ہے ماسی۔“

”کیسی ہے.....“

”چم چم کرتی ہے۔ چار بڑے بڑے پہیے ہیں..... اوپر ڈبہ سا بنا ہوا ہے۔ بس فر فر چلتی ہے۔“

ماسی رابو نے قہقہہ لگایا اور بولی ”تو نے پہلے کبھی موٹر نہیں دیکھی۔“

”نہیں۔“

”جھوٹ کیوں بولتا ہے۔“ گردن موڑ کر کھرے پر بیٹھی جیراں بولی۔

”اے کب دیکھی تھی کبھی۔“

”شہر ملک صاحب کے ساتھ جاتے نہیں؟“

”ہاں جاتا ہوں۔“

”وہاں موٹریں نہیں ہوتیں۔“

”وہ تو دیکھی ہیں۔ پر یہ کچھ نئی چیز ہی ہے۔“

ماسی را بوسکرا کر حقہ گڑ گڑانے لگی۔

”سارا دن بڑی سڑک پر دوڑاتا پھرتا ہے سکھیرا۔“ بکو بولا۔ ”اور وہ لوگ

دیکھنے کے لیے سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”ان کے لیے واقعی نئی چیز ہوئی بکو۔“

”تاج سکھیرا نئی نئی باتیں بھی تو کرتا ہے ناماسی۔“

”اور کیا بات کی اس نے۔؟“

”آپ نے نہیں سنا۔“

”کیا؟“

جیراں بھی موٹے ملکجے سے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی ”لو ماسی آپ کو

کچھ پتہ ہی نہیں۔“

”کیا ہوا۔“

”تاج سکھیرے نے کسی پٹھانی سے شادی بھی کر لی ہے۔“

”پٹھانی سے۔“

”ہاں ماسی۔“

”مجھے تو نہیں بتایا کسی نے۔“

”کہتے ہیں بڑی خوبصورت ہے۔ ہزار روپے میں خرید کر لایا ہے۔“

جیراں دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ ”سنا ہے وہاں عورتوں کو بیچ دیتے ہیں ماسی۔“

”کہاں؟“

”پتہ نہیں لوگ کیا نام لے رہے تھے۔ پہاڑوں پر“ وہ سوچنے لگی۔

”سوات۔۔۔۔۔ سوات۔۔۔۔۔“ بکو نے کہا۔

”اچھا سوات سے لایا ہے خرید کر۔“ ماسی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ علما ہے نا علما۔۔۔۔۔“ بکو بولا۔

”کون علما۔“ ماسی نے کہا۔

”تاج سکھیرے کا میراثی۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں رہتا ہے۔ اس نے

بتایا مجھے۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“

پھر تینوں تاج سکھیرے کی باتیں کرنے لگے۔ اس کی عیاشی کے قصے بھی گاؤں

تک پہنچتے رہتے تھے۔ بات سے بات نکلتی گئی۔

”وہ تو کچھ اور ہی بن گیا ہوا ہے ماسی۔ تو دیکھے تو پہچان ہی نہ سکے کہ وہ ہڑیلے کا

بندہ ہے۔۔۔۔۔“

”شہر جو چلا گیا ہے۔۔۔۔۔ شہری بن گیا ہوگا۔“

”پورا پورا صاحب بہادر۔۔۔۔۔ انگریزی کپڑے پہنتا ہے۔ انگریزی بولتا

ہے۔۔۔۔۔“

”دوسرے بھائی تو نرے پیٹڈ ہی ہیں۔ سارا دن کھیتوں میں جتے رہتے

ہیں۔۔۔۔۔“ جیراں بولی۔

”اپنی دھرتی ہے ان کی۔۔۔۔۔ واہتے ہیں اور کھاتے ہیں۔“ بکو بولا۔

”سنا ہے یہ زمینیں بھی بیچتا رہتا ہے۔“ ماسی را بونے حقہ گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاں اپنے بھائیوں کے آگے ہی دوسرے بیچتی ہے اس نے۔ شہر میں کاروبار جو

کر رہا ہے۔۔۔۔۔“ بکو بولا۔

”پیسہ انتوں کا ہے اس کے پاس۔“ جیراں نے کہا۔

”اسی لیے تو اڑا بھی رہا ہے۔“ بکو بولا۔ ”وہاں جو گھر لے رکھا ہے نا اس

نے۔ علمائے تبارہا تھا کہ راگ رنگ کی خوب محفلیں جمتی ہیں وہاں اور ماسی۔ کڑیوں کا تو وہ بیوپاری ہے.....“

”تو یہ تو یہ۔“ جیراں نے کانوں کو چھوا۔

ماسی راہو نے گہرا سانس لیا اور بولی ”رب کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ضروری تو نہیں نا..... قتل قلام سے ہی گہرا جڑیں.....“

”ٹھیک کہتی ہو ماسی.....“ جیراں بولی۔

”دولت کو جس طرح وہ لٹا رہا ہے ایک دن کنگال ہو جائے گا۔“ بکو بولا.....

”بڑے بڑے عیاش دوست ہیں اس کے۔ بد معاشوں کا گڑھ ہے اس کا شہر والا گھر۔“

بکو ادھر ادھر سے سنی باتیں ماسی راہو کو بتانے لگا۔

بہت سی باتیں ماسی کے علم میں پہلے سے بھی تھیں۔ کبھی کبھی فضل اسے بتایا کرتا

تھا۔ وہ سنتی رہی..... معلومات میں کافی اضافہ ہو رہا تھا۔

اور معلومات میں اضافہ نجو اور لڑکیوں کے بھی ہو رہا تھا۔ آپس میں باتیں کرتے

وہ کان ادھر ہی دھرے تھیں۔ تاج سکھیرے کی موٹر جا رہا اور رقیہ دیکھ بھی آئی تھیں..... ان

کے لیے یہ بھی عجوبہ ہی تھا۔ وہ بڑے مسخرے پن سے نجو کو بتا رہی تھی..... نجوان کی معصوم

باتوں پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔



سر پر دودھ کا گڑوار کھے بیگیاں واڑے سے نکلی اور پگڈنڈی پر ہوئی پانچ بھینسیں اور دو گائیں یہاں ہی تھیں..... تین بھینسوں کا دودھ تو چا چا ڈیرے پر لے جاتا تھا۔ ایک دودھ سکھا چکی تھی۔ باقی ایک تھی جس کا دودھ وہ گھر لے جا رہی تھی۔ گائیں بھینسوں کا رکھوالا بابا رمضان تھا۔ بھوری بھینس بیگیاں کی لاڈلی بھینس تھی۔ اس کا دودھ وہ خود ہی دوہا کرتی تھی..... بھوری بھی سمجھ گئی ہوئی تھی۔ مجال تھی جو رمضان بابا کو دودھ نکالنے کے لیے قریب بھی پھٹکنے دیتی..... بیگیاں کو روز یہاں دودھ لینے کے لیے آنا پڑتا تھا۔ یوں بھی جانوروں کے دانے پٹھے کی خبر لینا ہوتی تھی..... چارہ ڈلوانا ہوتا تھا..... یہ کام بیگیاں نے اپنے ذمہ ہی لے رکھا تھا۔ کھنٹی کی عیسائی عورتوں سے گوبر وغیرہ بھی اٹھوانا ہوتا تھا۔ بابا رمضان تو اب بوڑھا ہو گیا تھا۔ سارے کام بیگیاں ہی کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ رمضان کا بیٹا منظور اور بیٹی غفوراں اب واڑے کی صفائی ستھرائی اور بھینسوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ چرانے کے لیے باہر لے جاتے تھے۔

بیگیاں نیلے کرتے کالے تہبند اور بڑے سے دوپٹے کو سر پر ڈالے تلے والی نوکدار جوتی پہنے خراماں خراماں چلی جا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں سونے کی مرکیاں تھیں..... جو اس کے تہمتاے ہوئے سانولے سلونے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ناک میں سونے کی کیل تھی جس کا سرخ رنگ چمک رہا تھا ہاتھوں میں چاندی کے گھنگھریاں لگے کنگن تھے..... وہ گڈوے کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ سر تک لے جاتی تو گھنگھریاں بڑے مترنم انداز میں چھٹک اٹھتیں۔

پگڈنڈی سے ہوتی وہ کچی چوڑی سڑک پر اتر آئی۔ کھیتوں پر دھوپ سنہرا پنچھاؤں کر رہی تھی۔ کٹائی کے بعد ابھی کچھ زمینیں خالی پڑی تھیں۔ کہیں کہیں کھیتوں کے کناروں پر

سبزیاں لگائی گئی تھیں۔ کچھ کھیتوں میں گنا اگا تھا اور کپاس کی فصل بھی سرائھا رہی تھی.....  
کھیتوں میں اکا دکا لوگ تھے..... چاول کی فصل سمیٹی جا چکی تھی۔ دھان اور چاول جیالے  
گھوڑوں والے ریڑھوں پر لد لد کر شہر جا رہا تھا۔ منڈیوں میں فصل بیج بیج کر زمیندار جیسیں  
نوٹوں اور روپوں سے بھر بھر کر گھروں کو لوٹتے تھے۔

بیگیاں اپنی دھن میں مست سڑک کے پتھوں بیج جا رہی تھی..... اونچے قد کی مضبوط  
جٹی کی چال کا اپنا ہی وقار تھا۔

وہ اس وقت فضل کے بارے میں سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتوں  
کا سرور دل و دماغ پر تھا..... گرد و پیش سے بے خبری نظر آتی تھی.....

اچانک ہی وہ اچھلی..... گرتے گرتے بچی..... دودھ چھلک کر اس کے ماتھے  
اور کپڑوں کو بھگوتا دھاروں کی صورت بننے لگا..... تاج سکھیرے نے عین اس کے پیچھے  
آ کر گاڑی کا اس زور سے ہارن دیا تھا کہ وہ بے اختیار اناہچھل پڑی تھی۔

اس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔

تاج سکھیرا گاڑی میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

بیگیاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی..... گڈوا تار کر زمین پر رکھا اور کمر پر ہاتھ  
رکھ کر تن کر بولی ”اندھے ہو کیا..... نظر نہیں آتا.....“

”تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا..... سوہنیو“

بیگیاں شعلہ جوالا بن گئی..... ”لفنگے بد معاش“ کہنے..... اس نے اسے بے نقط

سنا ڈالیں۔

وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا.....

”تیری موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے تاجے.....“ وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

”اوائے اس موت توں صدقے جائے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”جانتا ہے میں کون ہوں۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔

”کوٹلی کے نمبردار کی قیامت بیٹی.....“ وہ پھر ہنسا۔

”صرف کوٹلی کے نمبردار کی بیٹی ہی نہیں..... تیرے وڈے دشمنوں کی بہو بھی ہوں.....“

”اوہو۔ کون ہیں دشمن.....“

”میں فضل کی منگ ہوں، منگ..... ملک فضل کی.....“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر

انتہائی غصے کے عالم میں کہا..... ”ہوش کی دنیا میں رہا کر..... موت کو یوں نہ لاکار.....“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا.....

سامنے سے دودھ پاتی چلے آ رہے تھے۔ تاج نے جلدی سے گاڑی سٹارٹ کی  
اور تیزی سے کچی سڑک پر مٹی اڑاتا چلا گیا۔

بیگیاں کے جسم میں جیسے انگارے بھر گئے..... کتنی دیر وہ وہیں کھڑی اسے کوستی رہی.....  
یہ پہلی بار نہ تھی..... جو تاج نے اسے چھیڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دودھ اس  
کے ساتھ بدتمیزی کر چکا تھا۔ چند ماہ پہلے اسے کھیتوں پر کام کرتے دیکھا تھا..... بیگیاں کی  
ہوش رُبا جوانی نے اس کے من میں ہلچل مچادی تھی۔ وہ بے دھڑک اس کے پاس آ کر بولا  
”تیرا نام کیا ہے کڑیے۔“

”کیوں؟“ بیگیاں نے ابرو تان کر پوچھا.....

”ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“

”کیا ضرورت پڑ گئی ہے.....“

”پڑی ہے تو پوچھ رہا ہوں نا..... کس گاؤں کی ہے۔ ہڑیا لے کی شاہ پور کی یا

کوٹلی کی۔“

”تو بتا کس گاؤں کا ہے۔“

”ہڑیا لے کا سکھیرا..... تاج سکھیرا۔“

”ہوں۔“

”کیوں؟“

”سیدھی راہ پکڑ اپنی..... تو غلط جگہ پر آ گیا ہے..... زندگی چاہیے تو دفع

ہو جا..... نہیں تو جانتا ہے اس پنڈ کی بہو بیٹیوں کو چھیڑنے والے کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔“

وہ دم دبا کر بھاگ گیا تھا۔

پھر

چند ہفتوں بعد وہ کنویں پر پانی بھرنے گئی تھی تو وہ بہانے بہانے ادھر آ گیا تھا.....  
”کیوں“ بیگیاں نے تیکھے پن سے کہا تھا؟

”لڑکیاں پانی نکال رہی ہیں..... اور میں ایسے ہی کھڑا ہوں۔ یہ جواں مردی تھوڑی ہے..... ہٹو میں سب کے گھر بھر دوں.....“

چند لڑکیاں پرے ہٹ گئیں..... لیکن بیگیاں نے اسے پرے دھکیل کر ڈول خود پکڑ لیا.....

”چلا جا یہاں سے..... بہو بیٹیاں سب کی سائھی ہوتی ہیں..... یہ ہڑیا لے اور کوٹلی کا سانجھا کنواں ہے.....“

”میں نے کنویں پر تو حق نہیں جمایا۔“

”کچے ڈھیٹ ہو.....“

وہ کنویں سے پرے چلا گیا۔ باقی لڑکیاں بیگیاں کے سر ہو گئیں۔

”تجھے پتہ نہیں یہ سکھیروں کا چھوٹا منڈا ہے۔ شہر میں رہتا ہے میموں اور صاحبوں کے ساتھ اس کی دوستی ہے..... اس سے دشمنی مت لے کہیں تیرے باپ

بھائیوں کو پھنساندے ناحق میں.....“

”چل چل بڑا آیا.....“

”نہیں بیگیاں..... سارے پنڈ اس سے ڈرتے ہیں..... بڑا کمینہ ہے تو ان لوگوں کو نہیں جانتی۔“

بیگیاں بڑے تفاخر سے ہنس کر بولی ”لو بھلا..... میں نہیں جانتی ان لوگوں کو.....  
پگلیو یہ تو میرے سوہروں کے بچے دشمن ہیں۔ ان کی پہچان میں نہ رکھوں گی تو اور کون

رکھے گا.....“

”پھر تو اس سے اتنا اکھڑ کیوں بولی۔“

”تو کیا ڈر جاتی اس سے..... ہونہہ..... وہ ہے کیا چیز..... گلامر دڑ کر رکھ دوں گی اس کا میں اکیلی ہی.....“

لڑکیاں چپ ہو گئیں..... گاؤں کی دشمنیوں اور ان کے ہولناک نتیجوں کا ان

سب کو علم تھا۔ آئے دن وارداتیں ہوتی تھیں۔ پانی کی تقسیم پر قتل..... زمین کی بانٹ پر قتل..... ڈنڈے سوئے تو چلتے ہی رہتے تھے..... اکھڑ اور ان پڑھ دیہاتیوں میں حصہ بھی تو بہت ہوتا تھا..... کسی کی بات صبر و تحمل سے سننے کے تو عادی نہ تھے۔ ذرا کسی نے اونچی نیچی بات کی، بس مشتعل ہو گئے..... آؤ دیکھا نہ تاؤ پل پڑے..... دم بھر میں خون خرابہ ہو جاتا تھا.....

بیگیاں نے اپنا گھڑا سر پر رکھا، دوسرا کو لہے پر اور چھلکتے پانی سے بھگتی اپنے گھر کی راہ لی۔

دور درخت تلے کھڑے تاج نے ایک بے ہودہ آوازہ کسا..... وہ کھول کر رہ گئی۔  
لیکن کچھ کہے بنا آگے بڑھ گئی.....

اور

آج

تیسری بار اس لعین مردود نے اسے راہ جاتے روکا تھا۔ وہ کوئی چھ ماہ بعد گاؤں آیا تھا..... زیادہ وقت شہر ہی میں رہتا تھا، فصل لینے آ جاتا تھا.....

غصے سے کھلتی بیگیاں گھر جا رہی تھی۔ دودھ کی دھاریں اس کے چہرے سے ہوتیں جسم پر بہہ رہی تھیں..... وہ تاجے کو مزہ چکھانے کے متعلق بڑے غصیلے انداز سے سوچ رہی تھی۔

اس نے آج تک بہنوں، بھائیوں، ماں، باپ کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ تاجا اسے راہ میں چھیڑتا ہے..... وہ سمجھتی تھی کہ گالیاں دے کر کوس کوس کر وہ اس ذلیل سے خود ہی بدلہ

لے لیتی ہے۔

لیکن

آج

آج اس نے سوچ لیا تھا۔  
کہ وہ سب کو بتا دے گی..... چاچے..... بے بے..... بھائیوں سب کو بتا دے

گی.....



اور

اگر

آج

آج رات ٹاہلیوں کے جھنڈ تلے فضل اسے ملنے آیا تو اس سے بھی کہہ دے گی۔  
فضل کے نومند و توانا مضبوط جسم اور آن کی خاطر پہاڑوں سے بھی ٹکرا جانے  
والے جذبے کا سوچ کر وہ خوش ہو گئی۔

-----O-----

تاج نے ڈھیر سارے ملبوسات گل پروشے کے آگے ڈھیر کر دیئے۔ سونے کے  
دوسیٹ اور طلائی چوڑیاں بھی اس کی گود میں ڈال دی۔

گل پروشے ڈرائنگ روم میں قالین پر صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔  
یہاں آئے اسے تقریباً مہینہ ہو گیا تھا..... یہ ایک مہینہ اس نے خوابوں جیسی جنت میں  
گزارا تھا..... تاج کی محبت اور شیفٹنگی پا کر وہ پھولی نہ سہائی تھی..... محبت کو ترسی ہوئی لڑکی  
کے لیے زندگی کا یہ موڑ اتنا دلفریب اور مسحور کن تھا کہ اس کی ہمیشگی کی تمنا کر بیٹھنا کوئی عجیب  
بات نہ تھی۔

تاج اسے شہری آداب سکھا رہا تھا۔ لباس بنوا کر دیئے تھے۔ سرخی پاؤڈر کا  
استعمال سکھایا تھا۔ زیور بنا کر دیئے تھے۔ حسین و جمیل گل پروشے ان لوازمات سے کوئی  
آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ اس کے کانچ ایسے نازک اور بلوریں جسم پر رنگارنگ لباس بے  
طرح اٹھتے تھے۔ تاج اسے گڑیا کی طرح سجا کر رکھتا تھا..... یہ کھیل اسے کچھ زیادہ دن ہی  
بھاگیا تھا ورنہ لڑکیاں تو اس کی زندگی میں صرف چند دن کی مہمان ہوتی تھیں.....  
”اتنا ڈھیر اٹھا لایا ہے سردار.....“ گل پروشے نے رنگارنگ لباسوں کو دیکھ کر  
مسکراتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ تمہارا ہے میری جان“ وہ صوفے پر اس سے جڑ کر بیٹھتے ہوئے اس پر  
جھک گیا۔

”امار پاس ابھی بوت کپڑا تا۔“ گل پروشے نے سر اس کے گھٹنے پر رکھ کر بائیں  
تاج کے گلے میں ڈال دیں.....

تاج نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ کیف و سرور سے دونوں مدہوش

سے نظر آنے لگے۔

”تاج“ گل پروشے سیدھی ہو بیٹھی۔

”ہوں۔“ تاج نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر سرگريٹ سلگایا۔

”تم نے ام کو اتنا محبت دیا ہے..... اتنا پیار دیا ہے..... اتنا عزت دیا ہے کہ لگتا

ہے ام خوشی سے ہی مر جائے گا.....“

تاج نے کش لے کر دھواں گل پروشے کے منہ پر اگل دیا..... وہ ہنس کر بولا۔

”نہ نہ..... یوں مت کہو..... ابھی جیو اور عیش کرو..... عیش کراؤ.....“

وہ معصومیت سے ہنس پڑی۔

”جاؤ یہ کپڑے پہن کر آؤ۔“ تاج نے قدموں میں پڑے کپڑوں میں سے ریشمی

آتش گلابی لباس کو بوٹ کی نوک سے قدرے اونچا کیا۔

”ابھی۔“

”ہاں۔“

”ویسے سردار شام کو پہنے گا۔“

”نہیں ابھی۔ ساتھ زیور بھی پہنو۔“

”ابھی ام تمہارا قدموں میں بیٹے گا۔ ام کو اچا لگتا ہے سردار.....“

”نہیں..... یہ کپڑے پہن کر دکھاؤ..... زیور بھی..... قیامت بن کر آ جاؤ اور

ٹوٹ پڑو اپنے سردار پر.....“

گل پروشے نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی..... اور سارے کپڑے اور زیور

اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئی.....

تاج چھت سے لٹکتے فانوس کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ گل پروشے کے مستقبل

کے متعلق اس کے ذہن میں بہت سی تجویزیں تھیں.....

تھوڑی ہی دیر بعد گل پروشے اپنے مرمریں بدن پر نیا لباس سجائے آ گئی۔ اس

لباس اور زیور نے تو اسے قاتلانہ حد تک حسین بنادیا تھا.....

”گل“ تاج اسے سر سے پاؤں تک چمکتی آنکھوں سے پیتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔“

”ہاں نہیں جی کہتے ہیں۔“

”خو..... بھول جاتا ہے سردار.....“

”یاد رکھا کرو..... ویسے تم کافی کچھ سیکھ گئی ہو۔“

”سب کج سیکے گا..... تمہارا خاطر ام سب کچھ سیکے گا۔“

”او..... جیو.....“

تاج نے اس کے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی

آغوش میں آ گری..... انداز سپردگی قاتلانہ تھا۔

جوش، جذبات والہانہ تاج خریدی ہوئی اس لڑکی کے روئیں روئیں سے عیش و

آسودگی وصول کرتا تھا.....

پھر

جب وہ اپنے بیڈروم میں جنس و جذبات کی آسودگی کے بعد ایک دوسرے سے

چمٹے لیٹے تھے تو گل پروشے سکون کی لہروں پر بہتی جا رہی تھی۔ اپنی تقدیر کی اس انتہا پر وہ

اپنے آپ پر رشک کر رہی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں اک و سوسہ ریگ گیا۔ اگر کبھی یہ جنت اس سے چھن

گئی تو.....

تو

اس نے سراٹھا کر بازو چیت لیٹے تاج کے سینے پر رکھتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس

کے بالوں میں الجھا دیا..... وہ اپنی سبزی مائل نیلگوں کشادہ آنکھوں کو پوری طرح کھولے

تاج کے چہرے کو مٹنے لگی۔

”کیوں۔“ تاج نے پوچھا۔

”سردار۔“ وہ اپنی آنکھوں میں ریگتے وسوسوں کو چھپائے بغیر بولی۔

”ہوں۔“

”سردار۔ تم ام سے ایک بات بولے گا۔“

تاج اس کی بات پر ہنس پڑا..... پھر اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے بولا ”ایک نہیں سو بات بولے گا۔“

”مذاق مت کرو۔“

”اچھا۔“

”ہاں ٹیک ٹیک بتاؤ۔“

”کیا بتاؤں۔“

”ام پوچے گا تم بتاؤ۔“

”پوچھو.....“

”خدا کی قسم..... سچ بولے گا نا“

”تم پوچھو تو سہی گل۔“

”سردار.....“

”ہاں۔“

”ام سے کبھی بے وفائی تو نہیں کرے گا۔“

”کون۔“

”تم۔“

”یہ کیا سوچھی تمہیں گل پروشے۔“ تاج نے اسے بازوؤں میں بھینچ لینا چاہا لیکن وہ اپنا آپ چھڑا کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

تاج نے اس کی سنجیدگی کو ہنسی میں اڑانا چاہا۔

گل پروشے کو گدگدی بہت ہوتی تھی۔ تاج نے اس کی کمر کے قریب گدگدایا۔

لیکن گل پروشے نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بولی ”بتاؤ نا سردار.....“

”کیا بتاؤں۔“

”ام سے دعا تو نہیں کرے گا۔“

”یہ کیوں پوچھ رہی ہو.....“

”دیکو سردار..... تم نے ام کو خریدا..... امارے لیے بوت پیسہ خرچ کیا“ کپڑے

لایا..... اتنا اچا گھر میں رکھا.....“

”اور کیا چاہتی ہو.....“

”پیار مو حابت.....“

”وہ تو تمہیں ضرورت سے زیادہ مل رہا ہے گل جانی۔“

”ہاں..... یہ پیار ام کو پاگل بنا دے گا..... ام بوکا تا پیار کا واسطے..... ام نے

بوت کچ پایا..... لیکن ام کو چیزوں کی ضرورت نہیں..... صرف تمہارا پیار کا ضرورت ہے۔“

تاج مسکرائے جا رہا تھا۔

لیکن

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

وہ سر جھکائے بڑے افسردہ لہجے میں اپنی پیار کی محرومی کے متعلق اسے بتانے

لگی۔ وہ بہت چھوٹی تھی کہ ماں باپ مر گئے۔ پھر اس کے کانوں نے پیار کا لفظ نہیں سنا.....

وہ اس کے لیے اندر ہی اندر ترستی رہی..... اور خدا سے وعائیں کرتی رہی.....

”خدا نے تم کو بھیجا..... تم نے ام کو خریدا..... ہم جنت میں آ گیا۔“

”بس ٹھیک ہے۔“

”لیکن اگر یہ جنت ام سے چھن گیا تو.....“

”تاج اس کی سنجیدگی سے اکتا گیا۔ کروٹ بدلنے لگا..... تو گل پروشے نے سختی

سے اسے اپنی طرف موڑ لیا۔ تاج نرم و گداز ہاتھوں کی اس سختی سے قدرے حیران ہوا.....

”سردار..... میرا بات سنو.....“

”گل پروشے لیٹ جاؤ ابھی..... باتیں پھر کر لیں گے۔“

”نہیں۔“

”تو کہو کیا کہنا ہے۔“

”بولو کہ ام سے بے وفائی نہیں کرے گا.....“

”ایسے وعدے بے فائدہ ہوتے ہیں گل پروشے۔ یہ سب کچھ تو وقت بتاتا

ہے۔“ اس نے گول مول سی بات کی..... ”نہیں..... ام کو تم بتاؤ..... ام سے دعا تو نہیں

کرے گا کبھی۔“

”نہیں کروں گا کبھی نہیں کروں گا۔۔۔۔۔“

”ٹیک ہے۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔۔۔۔۔ اور یہ بھی یاد رکھنا سردار کہ اگر کبھی تم نے ام سے بے وفائی کیا تو ام تمہارا جان ایک کر دے گا۔۔۔۔۔“

”او واہ وا۔۔۔۔۔ تمہارا اور میرا جان ایک ہی تو ہونا چاہیے۔ تاج نے ہنس کر پھر اسے اپنی طرف کھینچا۔“

”امارا مطلب یہ نہیں۔۔۔۔۔“

”اور کیا ہے۔۔۔۔۔“

”دیکھو سردار۔۔۔۔۔ ام پٹانی ہے۔۔۔۔۔ پتھروں کے دیس کا ہے۔۔۔۔۔ پھولوں کے دیس کا ہے۔۔۔۔۔ میٹھے چشموں کے دیس کا ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”امارے سات تم دعا نہیں کرے گا تو ام اپنا جان بھی تم پر قربان کرے گا۔۔۔۔۔ میٹھا چشمہ بن جائے گا۔۔۔۔۔ تم جتنا چاہے گا۔۔۔۔۔ سیراب ہوگا۔۔۔۔۔ پھول بن جائے گا۔۔۔۔۔ تم جتنا چاہے مہک سونگھے گا۔۔۔۔۔“

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

لیکن

گل پروشے کی آنکھوں میں اک خوفناک چمک لہرائی۔۔۔۔۔ ٹھوس لہجے میں بولی ”اور کبھی ام کو دھوکہ دیا ہے بے وفائی کیا تو ام پتھر بن جائے۔۔۔۔۔ تمہارا سر کچل دے گا یہ پتھر۔۔۔۔۔“

تاج پہلی بار سنجیدہ ہوا۔۔۔۔۔ گل پروشے کو غور سے دیکھا۔۔۔۔۔ وہ واقعی پتھروں کے دیس کی پتھرلی عورت لگ رہی تھی۔۔۔۔۔

خونخوار وحشی اور درندہ سی۔۔۔۔۔

وہ چپ چاپ اسے تکے گیا۔

خوف اس کے دل میں ایک لمحہ کو پیدا ہوا۔

لیکن

وہ بھی سکھیرا تھا۔۔۔۔۔ جس نے جھکنا کبھی سیکھا نہ تھا۔۔۔۔۔ جو بدلہ لینے میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ جو اٹے سیدھے سب ہتھکنڈے جانتا تھا۔۔۔۔۔ آزما سکتا تھا۔

گل پروشے کی اس کے سامنے کیا وقعت کیا حقیقت تھی۔ نادان لڑکی اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگی تھی۔۔۔۔۔ یہ تو اس کا حسن جہاں سوز تھا۔۔۔۔۔ جو سکھیرا الجھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ورنہ اب تک تو اسے روند مسل کر اس نے خلاصی بھی کر لی ہوتی۔۔۔۔۔

اک خریدی ہوئی لڑکی سے مرعوب ہونا اس کی دھمکی سے ڈر جانا اس کی شخصیت کے شایان شان تھوڑا ہی تھا۔۔۔۔۔

لیکن

وہ اس وقت بد مزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔

گل پروشے کو اس نے مطمئن کر دیا تھا۔۔۔۔۔ ہمیشہ با وفارہنے کا یقین دلایا۔۔۔۔۔ گل پروشے کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے تاج نے اس کے دامن میں ہفت اقلیم کی دولت بھر دی ہے۔۔۔۔۔ بے اختیار ہو کر اس نے سر تاج کی چھاتی پر رکھ دیا۔۔۔۔۔ اور آنکھیں بند کر کے حسین خوابوں میں کھو گئی۔

-----○-----

چودھری نظام دین کی زمینوں کی بیائی کر رہا تھا۔ چودھری نظام دین کا گھر انہ شہر سکونت اختیار کر چکا تھا۔ وہ ان زمینوں کی یوں دیکھ بھال کر رہا تھا جیسے یہ اس کی اپنی زمینیں ہوں۔ وہ اپنی گھوڑی کو صحن کے پرلے سرے پر چھپر تلے باندھ رہا تھا، ماں کے بار بار بلانے پر وہ رسوئی گھر میں آ گیا..... ایک طرف کچھی کھٹولا سی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا ”لا ماں..... کیا کھانا ہے.....“

ماں نے پیتل کی بڑی سی تھالی چاولوں سے بھر دی تھی۔ شکر کا ڈبہ اس کی طرف بڑھا دیا اور تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔

”پھوپھی کہاں ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”دالان میں ہوگی۔“ اس نے کہا۔

”بلا لونا اسے بھی۔“

”تو کھا..... ہم دونوں کھالیں گی۔“

”ماں تجھے پتہ بھی ہے کہ ترنوالہ اکیلے میں میرے حلق سے نہیں اترتا.....“

ماں نے گھور کر اسے دیکھا..... پھر زور سے آواز دی ”صاحبان آ کھانا کھالے.....“

”آئی بھابی“ صاحبان نے دالان سے آواز دی۔

تھوڑی دیر بعد ادھیڑ عمر کی صاحبان ادھر آ گئی..... وہ بھابی کے برابر پیڑھی پر بیٹھنے لگی تو راجو نے ہاتھ پکڑ کر چار پائی پر بٹھالیا۔ ”یہاں بیٹھ پھوپھی.....“

صاحبان مسکراتے ہوئے بولی ”کیا بات ہے لاڈ آ رہا ہے۔“

”لاڈ تو روز ہی آتا ہے..... پر کیا کروں.....“

”کر یہ کہ.....“ صاحبان ہنستے ہوئے بولی ”شادی کر لے.....“

”ہاں راجو.....“ ماں نے ہانڈی میں ڈوکی چلاتے ہوئے کہا ”ہم دونوں نے

صلاح کی ہے.....“

وہ ایک دم جیسے اچھل پڑا..... جلدی سے بولا ”کیا صلاح کی ہے۔“

”تیری شادی کی“ صاحبان بولی۔

”راجو۔“

”ہاں ہاں۔“

”روٹی کھالے۔“

”رکھ دے کھالوں گا۔“

”گرم گرم چاول کھالے۔ ٹھنڈے ہو گئے تو مکھن جم جائے گا۔ شکر کتنی ڈالے

گا.....“

”آج مکھن چاول پکائے ہیں۔“

”خالی چاول پکائے ہیں۔ مکھن تیرے لیے لگایا ہے۔“

”مجھے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ میں اکیلا نہیں کھاؤں گا اور ہاں

پھوپھی کو بھی تو بلا تینوں مل کر کھاتے ہیں.....“

”اب اتنا مکھن تھوڑا ہی ہے جو سب کھائیں تو کھالے اتنی محنت کرتا ہے.....

ہمارا کیا ہے.....“

”محنت تو تم دونوں بھی برابر کی کرتی ہو..... گھر کا کام بھی پنپاتی ہو، بھینس بھی

سنہالتی ہو..... کھیتوں پر بھی جاتی ہو.....“

کچے برآمدے تلے بنے رسوئی گھر میں راجو کی ماں چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔

چولہے میں آگ جل رہی تھی..... کسی پرانی ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا۔ یہ ساگ

وہ صبح کے لیے پکا رہی تھی۔ اس وقت سلور کے کالے کالے دیگے میں چاول پکے تھے۔ مٹی

کے پیالے میں تھوڑا سا مکھن رکھا تھا..... اور ٹین کے ڈبے میں شکر پڑی تھی۔ ایک کونے

میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ راجو ابھی ابھی کھیتوں سے واپس آیا تھا۔ ان دنوں وہ

”گھر کا سونا پن اب نہیں دیکھا جاتا..... تیری ووہٹی آجائے بال بچے ہو جائیں تو ہم بھی گھر کی خوشیاں دیکھیں.....“ ماں نے کہا۔

راجو ایک دم سنجیدہ ہو گیا..... ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“  
”تو..... تو راضی ہے ناں“ صاحبان جلدی سے بولی۔

”ہاں۔“

”لڑکی ہم نے ڈھونڈ لی ہے۔“

”وہ چاولوں کی تھالی پر شکر ڈالتے ہوئے دھیرے سے مسکرا کر بولا ”لڑکی میں نے ڈھونڈ لی ہے..... اب شادی تم دونوں کروادو.....“

ماں نے صاحبان اور صاحبان نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں پیڑھی اس کی کھٹولی کے قریب گھیٹ لائی ”کیا کہا ہے راجو.....“

”وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکرایا۔ اس کے چہرے پر ان گنت ستاروں کی چمک پھیل گئی..... آنکھوں میں خمار سا اتر آیا.....“ ”نحو کو جانتی ہو ماں۔“

”کون نحو.....“ ماں نے کہا۔

”وہ ملک فضل کی بہن جو ہے“ صاحبان بولی۔

”ہاں.....“ راجو نے جواب دیا۔

ماں کو اک جھر جھری سی آگئی..... پھیلی پھیلی آنکھوں سے کھٹولی پر بیٹھے راجو کو دیکھا..... اور بے اختیار انہنی میں سر ہلا دیا۔

”کیوں۔“ راجو ماں کی کیفیت کا اندازہ کر رہا تھا۔

”کہاں ملکوں کی دھی اور کہاں ہم راجو.....“ ماں کی جگہ صاحبان بولی۔

”کیوں ہم کوئی چوہڑے چمار ہیں.....“ راجو نے کہا۔ تو ماں نے اک گہرا

سانس لے کر کہاں..... ”یہ انہونی ہے راجو.....“

”کیوں ماں..... ایسی کیا بات ہے۔ تیرا پوت لچا لفنگا تو نہیں، شکل و صورت

کا بھی اچھا ہی ہے.....“ وہ مسکرایا۔

لیکن

ماں اور صاحبان مسکرا نہ سکیں۔

”کل رشتہ لے کر چلی جاؤ، دونوں بھائی فضل کے پاس۔“ راجو نے کہا۔

”بے عزتی کروانی ہے۔“

”کیوں پر..... غریب ہی ہیں نا ہم..... اور کیا عیب ہے۔“

”غریبی ہی سو عیبوں کا عیب ہے پتر.....“

راجو نے اک گہری سانس لی۔ پھر اسے اپنی محبت کی سچائی اور توانائی کا احساس ہوا۔ بڑے اعتماد سے بولا..... ”تم لوگ جاؤ تو سہی رشتہ لے کر..... فضل انسانوں کو پرکھ سکتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے انکار نہیں کرے گا.....“

ماں نے مایوسی سے سر ادھر ادھر ہلا دیا۔ پھر آہستگی سے بولی ”ہم دونوں نے تو مہراں کی بیٹی کے متعلق سوچا تھا۔ بڑی اچھی کڑی ہے۔ کام کاج کرنے والی.....“

”ماں۔“

”ہاں۔“

”میری شادی کا سوچنا ہے نا، تو صرف نحو کے متعلق سوچ، سارے پنڈوں کی کڑیاں بھی لا کر میرے سامنے کھڑی کر دے گی نا تو میرا فیصلہ نحو ہی کے حق میں ہوگا.....“  
تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی۔

پھر صاحبان مسکرا کر بولی ”کوئی خاص گل ہے نا، تیرا.....“

”یہی سمجھ لے پھوپھی.....“ پھر اس نے بڑے ہولے سے کہا ”وہ میرا پیار ہے پھوپھی۔“

ماں نے بات سن لی۔ آہستگی سے جیسے اپنے آپ سے بولی ”تیرا پیار ہے پر تیرا میل نہیں.....“

وہ بڑے اعتماد سے ہنس پڑا..... ”تو فکر نہ کر ماں۔ میرا اس کا میل رب سچے نے کیا ہے۔ وہی حفاظت کرے گا..... تم لوگ کل مولا کا نام لے کر چلی جاؤ، ان کے ہاں۔“

وہ دونوں چپ رہیں۔

”میں جو کہ رہا ہوں ماں..... تم جاؤ وہاں..... جا کر پیغام تو دو..... پھر دیکھیں

گے کیا ہوتا ہے.....“

”اچھا..... چھوڑو ان باتوں کو کھانا کھالے بالکل ٹھنڈے ہو گئے ہیں چاول۔“

صاحبان نے ہاتھ سے چاولوں کو چھوا۔ ”پہلے وعدہ کرو.....“

”کس بات کا۔“

”رشتہ لے کر جاؤ گی۔“

”چلے جائیں گے.....“

اور ماں جلدی سے بولی ”تو ہی جائے گی صاحبان۔ میرا تو حوصلہ نہیں پڑتا“

چھوٹے منہ سے بڑی بات کرنے کا.....“

”حد ہو گئی ماں.....“ راجو بولا ”مجھے پتہ نہ تھا تو اپنے آپ کو اتنا کمتر سمجھنے لگی

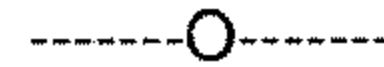
ہے..... ماں کبھی ہمارا خاندان بھی آدھے پنڈ کا مالک تھا۔ یہ کیوں بھولتی ہے۔

”بھولنے کی بات ہی ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اب ہم کیا ہیں۔“

تینوں کافی دیر بحث مباحثے میں الجھے رہے۔ چاول ٹھنڈے ہو گئے۔ چولہے میں

آگ بجھنے لگی اور دیے کا تیل ختم ہونے لگا تو راجو نے ماں اور پھوپھی کو نجو کے ہاں رشتہ لے

کر جانے پر آمادہ کر ہی لیا۔



رتو کے بھائی کی شادی تھی۔ نکلے زمیندار تھے اس لیے مہینہ بھر پہلے ہی ہلا گلا شروع ہو گیا تھا۔ روز رات کو جب چراغ جل اٹھتے تو گاؤں کی سہاگنیں اور کنواریاں ان کی حویلی کے بڑے دالان میں جمع ہو کر ڈھولک پر خوشی کے گیت گاتیں۔ سوانگ بھرتیں اور ہنسی مذاق کرتیں اور جب چراغوں کی روشنی مدھم پڑتے پڑتے ماند ہونے لگتی تو ٹولیوں کی صورت میں گھروں کو لوٹتیں..... میزبان دل والے بھی تھے۔ حلوائی گھر پر بٹھالیا تھا۔ روز رات کو مٹھائی بٹی۔ لڑکیاں بالیاں جھولیاں بھر بھر کر مٹھائی گھر میں لے جاتیں۔ دوسرے تیسرے دن میٹھے چاولوں کی دیکیں بھی پکنے لگی تھیں..... گوشت روٹی تو روز کا معمول تھا..... رنگارنگ کھیل تماشے بھی ہو رہے تھے۔ کبھی مہمانوں کی خوشی کے لیے میرا شیوں کو بلا لیا جاتا۔ کبھی کٹھ پتلیوں کا تماشا ہوتا..... اور کبھی بیچرے ناچنے گانے کو آ پہنچتے۔ آتش بازی بھی چھوڑی جاتی۔ لوگ محظوظ ہوتے۔

امارت کا اظہار بھی مقصود تھا۔ پیسہ وافر تھا انہی موقعوں پر تو نمائش ہوتی تھی۔

نجو رتو کی عزیز ترین سہیلی تھی۔ بچپن کا ساتھ تھا۔ جوانی اور جوانی کی سرمستیوں کے راز بھی مشترک تھے۔ نجو رتو کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ بھابی کے لیے کپڑے رتو نے بنائے تھے۔ زیور بھی اس کی پسند کا بنا تھا۔ نجو ہر بات میں رائے دیتی تھی اور رتو کے ماں باپ بھائی بہنیں اس کی رائے کا احترام کرتے تھے۔

باقی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ نجو بھی رات شادی والے گھر باقاعدگی سے جاتی تھی۔ رات کیا اس کا تو پورا پورا دن ہی وہاں گزرتا تھا۔ ہاں فضل کے انتظار میں کبھی کبھی وہ گھر ہی بیٹھی رہتی تھی۔

ویسے فضل اور سراج کی دوستی بھی تھی۔ اس کی شادی میں وہ بھی پوری طرح ہاتھ

بٹا رہا تھا۔ اکثر دونوں بہن بھائی وہاں اکٹھے ہی جاتے، شہر سے چیزیں وہی لارہا تھا۔  
 بارات ساتھ والے گاؤں جانا تھی۔ سرشام ہی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ بڑے  
 بڑے گیس روشنی کے لیے شہر سے منگوائے گئے تھے۔ آتش بازی کا بھی انتظام تھا۔ گاؤں کی  
 اکثریت مدعو تھی۔ لوگ نئے کپڑے پہن کر چلے آ رہے تھے۔ جن کے پاس نئے نہیں تھے  
 انہوں نے بھی دھودھلا کر پہنے تھے۔ کلف لگی پگلیں ہر دیہاتی کے سر پر تھیں۔ ان کے اونچے  
 شملے پنڈ کی آن کا نشان تھے۔

عورتیں اور لڑکیاں بالیاں بھی رنگ برنگے کپڑے پہنے پھر رہی تھیں۔ گوٹے  
 کناری لگے دوپٹے ڈھلک ڈھلک پڑتے تھے۔ چاندی اور سونے کے زیوروں سے بھی  
 بعض تولدی ہوئی تھیں۔ نجو نے گلابی گوٹے والا دوپٹہ لیا تھا۔ سبز کرتہ تھا جس پر باریک  
 گوٹے کی دھاریاں نکلی تھیں۔ کالی سندوف کی شلواری تھی۔ پاؤں میں تلے کی نوکدار جوتی  
 تھی۔ آج اس نے اپنے سونے کے کڑے بھی پہنے تھے۔ چاندی کی چوڑیاں بھی تھیں۔ گلے  
 میں کنٹھا تھا اور کانوں میں بڑے بڑے بالے۔ وہ بڑے دالان میں لڑکیوں کے ساتھ  
 بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ سب میں منفرد سب سے ممتاز دکھائی دے  
 رہی تھی۔

رتو بھی آج خوب بنی ٹھنی تھی۔ خوشی سے گلنار ہوئی جا رہی تھی۔ بات بات پر قہقہے  
 لگا رہی تھی۔ اس کے سیاہی مائل سانولے رنگ میں آج بلا کی کشش تھی۔

”رتو بڑی خوش ہے۔“ کسی لڑکی نے کہا۔

”ویر کی شادی ہے خوش کیوں نہ ہوگی۔“ دوسری بولی۔

”ہائے اللہ..... یہ تو خوشی ہی عجیب طرح کی ہوتی ہے۔ میرے بھائی کی بھی

پچھلے مہینے شادی ہوئی ہے نا۔“

”پہلے ہی خوشی ہوتی ہے، بھابی آجائے تو خوشی ہوا ہو جاتی ہے۔“

”واہ کیوں۔“

”ہم نے تو یہی دیکھا ہے۔“

”یہ تو اپنے اپنے گھر کا طریق ہے۔ ہماری بھابی بھی تو ہے۔“

”بس لڑائی جھگڑے ضرور شروع ہو جاتے ہیں.....“

”ضروری تو نہیں.....“

لڑکیاں اپنی اپنی بھابیوں کی باتیں کرنے لگیں..... نجوان کی باتیں دلچسپی سے سن  
 رہی تھی۔ بولی ”بھائی پیارے ہوں تو بھابیاں ان سے بھی پیاری ہوتی ہیں..... مجھے تو بیگاں  
 ابھی سے اتنی پیاری لگتی ہے کہ.....“

”کون بیگاں۔“ کسی لڑکی نے پوچھا۔

”اے ہے۔ بھائی فضل کی منگ..... نجو کی پھوپھی کی دھی۔“

”میں نے نہیں دیکھی کبھی.....“

”کوٹلی رہتی ہے نا.....“

”نجو تو اپنے بھائی کی شادی کیوں نہیں کرتی.....“

نجو نے اک گہری سانس لی..... اور بولی ”ہائے میرا بس چلے تو آج ہی کر دوں۔“  
 ”یہ کیا بات ہوئی۔“ کوئی لڑکی بولی۔

”بھئی..... اس کا ویر مانتا ہی نہیں..... اس نے ایک شرط رکھی ہوئی ہے۔“ رتو  
 نے ہنس کر نجو کو چھیڑا۔

”کون سی شرط.....“ بہت سی لڑکیاں نجو کے گرد گھیرا ڈال کر بولیں۔

”وہ کہتا ہے پہلے نجو کی شادی کروں گا پھر اپنی.....“ رتو بولی۔

”پھر کرتا کیوں نہیں اس کی شادی۔“

”یہ اس کی لاڈلی بہت ہے۔ آسمان سے کوئی شہزادہ اترے گا اس کے لیے.....“

جو ہنسی بجاتا آئے گا..... اور.....“

نجو نے زور سے رتو کے پہلو میں چٹکی کاٹی..... اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ کم بخت  
 کہیں سب کے سامنے اس کا راز ہی فاش نہ کر دے..... رتو آنکھیں مڑکاتے ہوئے اپنا پہلو  
 سہلانے لگی۔

”لڑکیاں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھیں کہ رتو کا چھوٹا بھائی دالان

میں آتے ہی رتو سے بولا ”بھائی فضل کے پیٹ میں درد ہے..... پھکی دے دو۔“



”کیا.....“ لڑکیوں کا گھیرا چیر کر نجو آئی۔  
 ”پھکی چاہیے.....“ مہر بولا..... ”بھافضل کے پیٹ میں بڑی پیڑ ہو رہی ہے.....“  
 ”کہاں ہے وہ.....“ نجو کا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا۔ تھر تھر کانپنے لگی۔  
 رتو نے جلدی سے اسے تھام لیا.....

”میرا دیر.....“ وہ لرزتے ہوئے بولی۔  
 ”گھبرا نہیں نجو.....“ شادو اور دوسری لڑکیوں نے نجو کو تھام لیا.....  
 لیکن وہ اپنا آپ چھڑا کر بھاگی..... صحن سے دوڑتے ہوئے باہر کو لپکی۔ مہر اور رتو  
 اس کے پیچھے آئے۔ باہر کی بیٹھک میں فضل چار پائی پر مرغ بسل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ گھر  
 کے لوگ اس کے پاس کھڑے تھے۔ کچھ مہمان بھی تھے..... اپنے آرمودہ نسخے بتا اور آزما  
 رہے تھے۔ پیاز کا پانی..... سرکہ اور نمک، اجوائن اور کالا نمک..... جو کچھ کوئی بتا رہا تھا وہ کھا  
 پی رہا تھا..... لیکن درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔  
 ”دیر جی.....“ نجو کمان سے نکلے تیر کی طرح فضل کے سینے سے جا لگی۔ وہ تڑپ  
 رہی تھی۔

”اوہ..... لگی..... تمہیں کس نے بتا دیا،“ بمشکل فضل کہہ سکا۔  
 ”کیا ہو گیا، میرے ویر کو..... نظر لگ گئی کسی کی.....“ وہ چیخنی۔  
 کمرے میں کھڑے بڑے بزرگ نجو کو تسلی دینے لگے ”بی بی حوصلہ کرو۔ خیر  
 ہو جائے گی.....“  
 ”اللہ میرے ویر کی پیڑ مجھے دے دے۔“ نجو نے روتے ہوئے فریاد کی۔  
 ”میرے ویر کو کوئی تکلیف نہ ہو.....“

وہ معصومانہ انداز میں دعائیں کرتے ہوئے بھائی کی ساری تکلیفیں خود اپنے اوپر  
 لینے کو تیار تھی۔

کمرے میں رش بہت ہو گیا تھا..... فضل کی طبیعت گھبرا رہی تھی۔ بڑا گھبرو جوان  
 تھا۔ چھوٹی موٹی تکلیف کو تو کبھی خاطر ہی میں نہ لاتا تھا۔ درد کی شدت ہی تھی جو رنگ زرد  
 ہو رہا تھا اور سردی کے باوجود پسینے آ رہے تھے۔

کوئی حکیم جی کو لانے دوڑا..... فضل نے گھر جانے کی خواہش کی..... تھوڑی ہی  
 دیر بعد دو تین جوان اسے سہارا دے کر گھر لے چلے..... نجو بھی ساتھ ساتھ گئی..... وہ تو جیسے  
 مرغ بسل تھی.....

حکیم جی آ گئے..... انہوں نے اچھی طرح فضل کو دیکھا اور دوائیاں تجویز کیں۔  
 پہاڑی پودے، موٹی الائچی اور دارچینی کا قہوہ بنا کر فوراً پلانے کو کہا۔ دوائیاں مطب سے  
 بھیجنے کا کہہ کر وہ بکو کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

نجدوڑی اور قہوے کی چیزیں تلاش کرنے لگی۔ جیراں پہاڑی پودے براہر والوں  
 کے گھر سے لے آئی۔

کچھ لوگ احوال پرسی کو یہاں بھی آ گئے۔ ان میں راجو بھی تھا۔ لیکن نجو کو تو جیسے  
 گرد و پیش کا ہوش ہی نہ تھا۔ گھبرائی، شپٹائی اندر باہر دوڑ بھاگ رہی تھی۔ راجو کو اس کی محبت  
 کا بخوبی اندازہ ہو گیا، جو نجو کو اپنے بھائی سے تھی۔

دوائی کھانے کے گھنٹہ بھر بعد فضل کو کچھ افاقہ محسوس ہوا..... وہ اوندھا لیٹے لیٹے  
 ہی اونگھ گیا..... نجو اس کے پلنگ کے قریب بیٹھی دعائیں کرتی رہی۔

ادھر بارات روانہ ہو رہی تھی۔ لوگ جوق در جوق اکٹھے ہو رہے تھے۔ رتو  
 اور سب سہیلیاں تیار کھڑی تھیں..... نجو کا انتظار تھا۔  
 لیکن

توبہ، نجو بھائی کو یوں چھوڑ کر باہر جانے والی تھی۔ اسے تو کچھ سجھائی ہی نہ دے رہا  
 تھا..... باؤلی ہو رہی تھی۔

رتو خود اسے بلانے گئی۔ لیکن نجو نے جانے سے انکار کر دیا۔  
 ”تم تو تم رتو..... اس وقت تو موت بھی بلانے آ جائے تو نہ جاؤں.....“ اس نے  
 فضل کی چار پائی کے قریب بیٹھے بیٹھے کہا۔

رتو بولی ”اب تو بھائی فضل کو آرام ہے سو گئے ہیں۔“

”نہیں رتو..... تم سب جاؤ۔“

”مہینوں سے تیاری کر رہی تھی اور اب.....“

”رب کو یہی منظور تھا۔“

”تھوڑی دیر کے لیے چلی چل۔“

”نہیں بھئی..... میں تو ایک پل کے لیے بھی یہاں سے ہل نہیں سکتی.....“

مافی را بود راجہاں نے بھی بہت زور دیا لیکن نحو تو فضل کو یوں چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”تاج۔“

”ہاں۔“

”ہاں نہیں جی بولتا ہے۔“

”اوہ..... اچھا..... جی..... ہمارے حربے ہم پر ہی آزمانے لگی ہو۔“

”برابا ت ہے کیا۔“

”نہیں ٹھیک ہے۔“

”تم کدر جاتا ہے۔“

”کب۔“

”اب۔“

”گاؤں۔“

”ام بھی چلے گا۔“

”کہاں! میرے گاؤں۔“

”تمہارا گاؤں دیکھے گا ام..... تم نے ام کو اپنا گاؤں نہیں دکایا۔ اپنا بھین بھائی

سے نہیں ملایا.....“

تاج اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔ گل کو غصہ آ گیا۔ ”کیوں ہنستا ہے۔“

”تم گاؤں جا کر کیا کرو گی۔“

”تمہارا رشتہ دار سے ملے گا ام۔“

”میرے رشتہ دار بہت ظالم ہیں..... کچا کھا جائیں گے تمہیں۔“

”کیوں۔“

”میں نے اپنی مرضی سے شادی نہیں کی نا.....“

”اپنا مرضی سے تو کیا ہے نا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ لوگ تمہیں قبول کب کریں گے۔ ہمارے گاؤں کے لوگوں کو تو نہیں جانتی.....“

”ام ضرور جائے گا۔ دیکھ گا وہ امارا کیا بگاڑتا ہے۔“

”وہ شیرنی کی طرح غرائی..... تاج اس کے تیور دیکھ کر چپ ہو گیا.....“

”ام تمہارا بیوی ہے۔ شادی کیا ہے۔ خدا اور رسول کے سامنے ام تم میاں بیوی بننا ہے.....“

”پھر بھی..... میرے خاندان والوں کی مرضی سے تو یہ سب کچھ نہیں ہونا..... وہ سب تمہارے خلاف ہو جائیں گے مار ڈالیں گے تمہیں.....“

وہ ہنس پڑی..... ”تم سمجھتا ہے ام اس بات سے ڈر جائے گا۔ ام تو خود مرنے مارنے پر تیار رہتا ہے.....“

”پیچھا چھڑانے کو تاج نے اس کا کندھا تھپتھپایا.....“ اچھا کسی وقت لے چلوں گا.....“

”ام آج جائے گا تمہارے ساتھ۔“

”نہیں گل۔“

”تم روز روز جاتا ہے..... ام کو نہیں لے جاتا۔ آج ام ضرور جائے گا۔“

”اوہ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو.....“

”سب سمجھتا ہے۔ چلو..... ام تمہارے ساتھ ابھی چلے گا.....“

”ابھی میں کہاں جا رہا ہوں۔“

”تم نے بولا ہے گاؤں جائے گا۔“

تاج نے بہتیرا اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹلنے والی کہاں تھی۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خونخوار ہو جاتی تھی۔ اسکی ضد اور ہٹ کے سامنے اکثر تاج کو جھکنا پڑتا تھا۔ ویسے تاج کا دل اب گل پروشے سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی شگفتہ اور حسین

تھی۔ ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ سونے سے پہلے اس کے پاؤں دباتی تھی۔ اس کی خاطر اس نے بہت سی عادتیں ترک کر دی تھیں۔ شہری باتیں جو اسے ناپسند تھیں اپنی تھیں اور تو اور تاج کے شراب پینے کو بھی تھوڑی سی لڑائی کے بعد گوارا کر لیا تھا۔ ان ساری باتوں کے عوض وہ صرف اور صرف تاج کی محبت اور اعتماد کی بھوک تھی۔ کوئی اس سے زندگی کی یہ ساری آسائشیں لے کر اسے نکال کر دیتا اور اس کے پاس صرف تاج رہ جاتا تو اسے ملال نہ ہوتا..... یہ عیش و عشرت تو ثانوی چیزیں تھیں۔ اسے ان کی پروا نہ تھی۔ تاج اکثر گاؤں چلا جاتا..... یاد دوستوں کے گھر رات گئے تک بیٹھا رہتا..... گل سراپا انتظار بنی رہتی..... جب وہ آ جاتا تو گلہ کرنے کی بجائے اس کے قدموں میں بچھ بچھ جاتی۔ اسے اس کی سرگرمیوں کا تاحال علم نہ تھا..... وہ نئے نئے بہانے اس کو خوبصورتی سے تراش لیتا کہ بھولی بھالی گل پروشے یقین کے جال میں پھنس جاتی.....

لیکن آج وہ اس کے ساتھ گاؤں جانے کی ضد کر بیٹھی..... وہ اس وقت واقعی گاؤں جا رہا تھا..... اس کے خاندان میں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس کے دو خالہ زادوں نے اس کی پھوپھی کے بیٹے کو کلہاڑیوں سے زخمی کر دیا تھا۔ وہ بیچ گیا تھا..... لیکن تاج کے خیمیاں اور دھیمیاں میں دشمنی کا بیج بویا گیا تھا۔

بڑے بھائیوں نے اسے بلا بھیجا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ اس سے صلاح مشورے لیتے تھے..... کچھ تو پڑھا لکھا تھا..... کچھ شہر میں اس کی سرکاری افسروں سے بنتی تھی۔ انگریز مجسٹریٹ دوست تھا..... ایس پی سے بھی شناسائی تھی۔

آج جانا ضروری تھا لیکن گل پروشے مچلی ہوئی تھی..... وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے خاندان کی کوئی بات گل کو بتائے۔ لیکن آج اس کی ضد دیکھ کر اس نے یہ سارا واقعہ اسے سنا دیا۔

”کیا ہوا..... ام بھی اور دیکے گا سب کچ۔“

”گل کہنا ماننا سیکھو..... ورنہ.....“ اسے غصہ آ گیا۔

”ورنہ..... ورنہ..... کیا کرے گا.....“ گل غرائی۔“

”گھر سے نکال دوں گا۔ طلاق دے دوں گا.....“ وہ بھی لال پیلا ہو گیا.....

تھوڑی دیر بعد وہ موٹر میں تاج کے برابر بیٹھی بڑی سڑک پر جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر علما بیٹھا تھا۔ اس کی بیٹی گوگی بھی ساتھ تھی۔ علمے اور گوگی کو تاج نے سب کچھ سمجھا دیا تھا..... وہ دونوں گل پروشے کو دوسرے گاؤں گھما پھرا کر دکھائیں گے اور اپنے گاؤں سے دور ہی رکھیں گے..... اس نے انہیں کہہ دیا تھا۔



”ہوں۔“ گل نے دونوں ہاتھ کو لہوں پر رکھ کر ایسی خونخوار نظروں سے اسے دیکھا کہ اس کا دل ہول گیا۔

”کیا کہا۔ ایک بار پھر بولے گا تاج.....“ وہ تو اجل کی طرح ٹوٹ پڑنے کو تیار نظر آئی۔

تاج نے ہنستے ہوئے اس کی کمر پر ہاتھ ڈالا..... ”مذاق سمجھا کرو.....“

گل نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا ”ام ایسا مذاق بھی برداشت نہیں کرے گا.....“

”اچھا بھئی اچھا۔“

”امارا نام گل پروشے ہے۔ ام پتھروں کی بیٹی ہے پتھروں کی طرح سخت..... سمجھا.....“

”سمجھا سمجھا۔“

تلخ کلامی کو تاج نے ہنس ہنس کر مٹانے کی پوری کوشش کی لیکن جانے کیا بات تھی۔ اس کے دل میں خوف سا بیٹھ گیا اور وہ جو کئی دنوں سے گل پروشے سے پیچھا چھڑانے اور اسے کسی اور ضرورت مند کے ہاتھ اوانے پونے بیچ دینے کی سوچ رہا تھا..... اندر ہی اندر سہم گیا۔

گل اس کے ساتھ تیار ہو گئی..... تاج کو اسے گاؤں لے جانے کی حامی بھرنا پڑی.....

”ایک شرط ہے۔“ تاج نے کہا۔

”بولو۔“

”تم میرے خاندان والوں سے نہیں مل سکتیں..... گاؤں جاسکتی ہو۔“

”ام کدر جائے گا وہاں۔“

”ہماری ایک حویلی گاؤں کے سرے پر ہے وہاں.....“ نہ جانے کیا سوچ کر وہ بولی ”ٹھیک ہے۔“

”حویلی کے ساتھ ہی ایک طرف پہاڑ والی اور دوسری طرف کوٹلی کی زمینیں شروع ہو جاتی ہیں۔ تم چاہو تو ان دونوں گاؤں میں گھوم پھر سکتی ہو۔ مجھے وہاں کافی دیر لگے گی.....“

”گل پروشے نے سر ہلایا.....“

بھگی بھگی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بڑے بڑے صدیوں پرانے بوہڑوں اور ٹاہلیوں کے جھنڈوں میں ہوا سرسراتی پھر رہی تھی۔ شام کی اداسی اتر چکی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ صبح سے وقفوں کے بعد پھوار پڑنے سے خنکی کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی اور یہ بوجھل پن فضا میں اداسی بھر رہا تھا۔ سردیوں کا چھوٹا سا دن ختم بھی تو جلدی ہو جاتا تھا۔ سروی کے ڈر سے لوگ خود اور ڈھور ڈنگر سر شام ہی ٹھکانوں پر چلے جاتے تھے۔ کھیتوں میں تو اکا دکا رکھوالے ہی رہ جاتے تھے۔ اب تو گاؤں کی کنواریاں بھی اودھم مچانے میدان میں نہ آتی تھیں۔ کبھی کسی سکھی کی حویلی میں جمع ہو جاتیں، کبھی کسی کی زیادہ تر گھروں میں ہی رہتیں اور کچے دالانوں کے پرانے دروازے بند کر کے لفافوں میں گھس کر نئے پرانے قصبے سناٹے سو جاتیں۔

فضل کئی دنوں بعد بیگاں سے پرانے بوہڑ کے نیچے ملا تھا۔ وہ تین چار دن بیمار رہا تھا۔ پھوپھی سکی نہ اور سب گھر والے اس کی احوال پرسی کو آئے تھے۔ وہ کیا پنڈ کا کون سا بندہ تھا جو پوچھنے نہ آیا تھا۔

بیگاں نہیں آئی تھی۔ گو اس نے اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا۔ اپنی بے قراری اور بے چینی کا کھل کر تو نہ بتا سکتی تھی۔ ہاں احوال پرسی ضرور کر لی تھی۔

آج فضل ہڑیا لے کی درمیانی سڑک سے ہوتا کوٹلی اپنے ایک یار بیلی کے پاس آیا تھا۔ واپسی پر پھوپھی کے گھر بھی گیا تھا۔

بیگاں اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئی تھی۔ بہت لاغر ہو رہا تھا وہ۔ رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور چہرہ اتر اتر ہوا تھا۔

وہ اس سے کوئی بات نہ کر سکی۔ اندر چاچے کے پاس جو وہ بیٹھا تھا۔ بیگاں صحن

میں ادھر ادھر منڈلاتی پھر رہی تھی۔

پھوپھی نے خاطر مدارت کرنا تھی۔ جلدی سے مرغی ذبح کروالی اور بخنی بنوانے کے لیے بیگاں سے چھوٹی فضلاں کو کہا۔

لیکن وہ مرغی ابھی نل کے نیچے دھور رہی تھی کہ فضل باہر نکل آیا۔

”بھیا فضل کہاں چلے بیٹھونا۔“ فضلاں جلدی سے بولی۔

”اب واپس جاؤں گا۔۔۔۔۔ شام اتر رہی ہے۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔

”پھپھی میں نے کچھ نہیں کھانا، اس وقت ابھی طبیعت پوری طرح ٹھیک

نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ اور پھر دیر ہو گئی۔۔۔۔۔ تو تجھے پتہ ہے ناں اس کا۔۔۔۔۔“

”کس کا۔“

”اپنی لاڈلی بھتیجی کا۔۔۔۔۔ رو رو کر مر جائے گی، میں دیر سے گیا تو۔۔۔۔۔“

”تیری مرضی۔۔۔۔۔ ورنہ میں نے تو مرغی ذبح کروالی تھی۔۔۔۔۔“

”بس پھپھی۔۔۔۔۔ اب جاؤں گا۔۔۔۔۔ جاتے جاتے بھی وقت لگے گا۔۔۔۔۔“

”پھپھی دعا و سلام کے بعد اندر چلی گئی۔۔۔۔۔“

”فضلاں میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔“ بیگاں نے آہستگی سے بہن سے کہا اور

مسکرا کر فضل کو دیکھا، جو اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔۔۔۔۔

فضلاں مرغی کا ایک ٹکڑا صاف کرتے ہوئے بولی۔

”جلدی آ جانا۔“

”اچھا۔“

وہ باہر نکل گئی۔ فضل بھی گھوڑی کی باگ پکڑے باہر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد

دونوں پرانے بوہڑ تلے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ گھوڑی کو فضل نے کھلا چھوڑ دیا۔

”تو کتنا لاغر ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“ بیگاں نے اس کڑیل جوان کے سراپا پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

”تجھے کیا۔“

”مجھے کچھ نہیں۔“

”ہاں کون سا دیکھنے آ گئی تھی۔“

”کیسے آتی فضل۔“

”کیوں۔ کوئی غیروں کے گھر آنا تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اپنے منہ سے کیسے کہتی مجھے لے چلو کسی نے مجھے ساتھ

لے جانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی..... تم کیا جانو میرا کیا حال تھا۔“

فضل نے بیگاں کو بڑے پیار سے دیکھا..... ”سچ کہہ رہی ہو۔“

”میری حالت جو تھی خدا ہی جانتا ہے۔ شکر ہے خدا نے تجھے بچا لیا۔“

”بیگاں۔“

”ہاں۔“

”اگر میں مرجاتا..... تو.....“

”بیگاں نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا..... ”رب نہ کرے۔“

فضل نے شوخی سے اس کے ہاتھ کو دانتوں سے پکڑ لیا۔

وہ لجا گئی..... بمشکل ہاتھ چھڑا پائی..... فضل مخمور نگاہوں سے اسے تکتے لگا۔

”چل ہٹ۔“ بیگاں نے نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی۔

فضل نے آگے بڑھ کر اپنے مضبوط مشقتی ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے اور

بڑے اصرار سے بولا ”سچ سچ بتا بیگاں۔“

”کیا۔“

”اگر میں مرجاتا تو تو کیا کرتی.....“

”پھر وہی بات۔“

”تو بتا دے نا۔“

”بری باتیں مت کر۔“

”چل بری سہی تو بتا دے..... کیا کرتی جو میں مرجاتا تو۔“

”ہائے اللہ۔ ایسی منحوس باتیں کرتا ہے تو۔“

بیگاں نے سر اٹھایا۔ اپنی سیاہ ستاروں ایسی چمکتی آنکھیں فضل کے چہرے کی

طرف کیں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بڑے ٹھوس لہجے میں بولی ”فضلے بیگاں اور تم دو تو

نہیں..... تو نہ رہتا تو بیگاں بھی ختم ہو جاتی..... اپنے آپ۔“

”بیگاں۔“ بے اختیارانہ فضل نے کہا اور اس کو بازوؤں میں بھر کر چھاتی سے

لگا لیا.....

بیگاں کا جی بھرا آیا اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ فضل بے زبان جذبوں کے

ایسے اظہار سے بے طرح متاثر ہوا۔

تھوڑی دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔

پھر بیگاں بولی ”اب میں جاؤں۔“

”جی تو نہیں کرتا۔“

”رات ہو رہی ہے.....“

”ڈرتی ہے۔“

”کس سے۔“

”رات سے۔“

”سردیاں ہیں نا۔ راہیں سنسان ہیں.....“

”تو کیا ہوا پنڈ اپنا ہے..... لوگ اپنے ہیں.....“

”پھر بھی.....“

بیگاں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ فضل نے یونہی چھیڑا..... ”فضلے کی منگ ہو کر ڈرتی

ہو سنسان راہوں سے۔“

”نہیں فضلے یہ بات نہیں..... لیکن.....“

”وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچائی..... تو فضلا سر ہو گیا..... ”کوئی بات ہے کیا۔“

”نہیں نہیں کچھ نہیں۔“

”بتا دے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں پر تو مجھے گھر کی گلی تک چھوڑ آ.....“

فضل نے سر آہستہ آہستہ ہلایا..... ”کوئی بات ہے نا..... چھپاتی کیوں ہے۔ کیا

خوف ہے اپنے فضلے سے.....“

آنکھیں نہ نکال دے گا!!

بیگیاں کی پیار بھری باتوں کے باوجود وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ سکھروں کی زیادتی کے باوجود اس نے دل سے دشمنی کا بیج نکال دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نسل در نسل خون خرابوں کی روایت منتقل ہوتی رہے۔

لیکن

آج بیگیاں کی بات نے اس کے خون کو کھولا دیا تھا۔ سانپ کا سر پکل کر ہی اس کے ڈسنے سے محفوظ رہا جاسکتا تھا۔ اس بات کی صداقت اور سچائی پر اسے یقین آ گیا تھا۔



”کچھ نہیں فضلے۔ تو تو یونہی پوچھے جا رہا ہے جا تو..... میں چلی جاؤں گی اکیلی..... ڈرنے والی تو میں ہوں نہیں..... کسی کی مجال ہے جو.....“

”اچھا میں چلا..... چھپا رہی ہے نا مجھ سے..... چھپاتی رہ.....“

وہ مڑا تو بیگیاں نے دوڑ کر اسے بازو سے پکڑ لیا..... ہنس کر بولی ”ناراض تو نہ ہو.....“

”میں کیوں ناراض ہوؤں گا.....“ وہ روٹھ گیا۔

بیگیاں اس کے منہ بنانے پر ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی ”بات تو کچھ بھی نہیں فضلے..... صرف..... صرف یہ ہے کہ آج تاج سکھیرا گاؤں آیا ہوا ہے.....“

فضل نے حیرانگی سے بیگیاں کو دیکھا اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے، کرخت لہجے میں بولا ”آیا ہوا ہے تو تجھے کیا..... اکثر آیا ہوتا ہے.....“

”جب میں یہاں آ رہی تھی تو وہ نا بے چودھری کے گھر میں داخل ہو رہا تھا.....“

”پھر.....“

فضل جھنجھلا گیا۔ چڑ کر بولا ”اس نے تجھے کچھ کہا ہے۔“

”نہیں، نہیں۔“ وہ گھبرا گئی۔ دوسرے لمحے بولی ”بس اس سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ بہت بری نظروں سے دیکھتا ہے مجھے۔“

فضل کا خون کھول گیا، آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ گھوڑی کی طرف لپکا کہ بیگیاں دوڑ کر اسے کندھے سے پکڑ کر بولی ”فضلے بات تو سن۔“

فضل نے باگ پکڑے پکڑے بیگیاں کو دیکھا۔ وہ جبراً ہنس پڑی۔ ”غصہ تو تیرے ناک پر دھرا ہے۔ ذرا ہوش سے بات تو سنا کر۔“

بیگیاں فضل کے تیور دیکھ کر ڈر گئی۔ سکھروں اور ملکوں کی صدیوں پرانی دشمنی کا اسے پتہ تھا۔ اس نے سوچا تو تھا کہ تاج کے متعلق فضل کو بتا دے گی، لیکن وہ تو صرف اشارہ ہی سمجھ کر مشتعل ہو گیا تھا۔

پوری بات بتا دیتی تو ابھی اسے جا کر قتل کر دیتا۔

ہنس ہنس کر اس نے بات کی سنگینی ختم کرنا چاہی، لیکن فضل کے دل میں چھین بیٹھ گئی..... تاج سکھیرے کی یہ مجال کہ اس کی منگ کو بری نظروں سے دیکھا؟..... وہ یہ





”نہیں بھئی..... مجھے کسی کے دل کی بددعا نہیں لینی۔“

”اب راجو ہنس پڑا.....“

”ایک بات سن بھاراجو۔“ رتو نے کہا۔

”کہو۔“

”تو اسے گاؤں کی اس آخری گلی تک چھوڑ جائے گا؟“

”ہاں۔“

”نچو منڈیر سے اچھل کر اتری اور بولی ”نہیں، نہیں..... وہاں تک جاتے کسی

نے دیکھ لیا تو.....“

”تو کیا ہوا.....“ رتو ہنس کر بولی ”یا تو تم دونوں کی مشکل حل ہو جائے گی۔ یا.....“

”بھافضل دونوں کی.....“ رتو نے ہاتھ سے گردن کاٹنے کا اشارہ کیا۔

تینوں ہنس پڑے۔

”عاشق موت سے نہیں ڈرتے.....“ رتو بھین رتو.....“ چند لمحوں بعد راجو بولا.....

اس کے لہجے اور ٹھوس انداز سے نچو بڑی متاثر ہوئی۔

رتو مذاق کے موڈ میں تھی۔ بولی ”عاشق موت سے نہیں ڈرتے“ پر رشتے کی بات

کرنے سے ڈرتے ہیں.....“

نچو ہنس پڑی..... ”یہ بات کی ہے نا۔“

راجو ایک طویل سانس کھینچ کر بولا..... ”رتو بھین تو ہی مدد کر ہماری۔ میں تو بے بے

اور پچھپی کو کہہ کر تھک گیا ہوں۔“

نچو نے گھبرا کر اسے دیکھا اور اس کے دل کی بات بوجھ کر رتو جلدی سے بولی ”کیا

کہا..... تیری بے بے اور پچھپی یہ رشتہ پسند نہیں کرتیں.....“

”لوحد ہوگئی.....“ راجو بولا..... ”پسند تو بہت کرتی ہیں، پر رشتہ لے کر جانے کی

ہمت نہیں کرتیں.....“

”کیوں۔“

”ہمارے پلے ہی کیا ہے رتو بھین۔ کہتی ہیں چھوٹا منہ ہے بڑی بات کیسے کریں۔“

رتو چپ ہوگئی۔ اس پہلو سے تو کبھی اس نے سوچا ہی نہ تھا.....

”تو نے اپنی بے بے سے بات کی تھی۔“ نچو نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”پھر۔“

”پھر وہی بات..... تمہارے گھر جانے کا حوصلہ نہیں کرتیں۔ کئی دنوں سے کہہ

رہی ہیں..... پر جاتی نہیں.....“

”کوئی اور بات تو نہیں، راجو.....“

”اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“

”تیری ماں اور پچھپی کہیں اور.....“

”اور نہیں نچو.....“

رتو چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ”تو اپنی بے بے کو ہمارے گھر بھیج نا.....

میری اماں سے بات کریں۔“

”ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا.....“

”حق ادا کر دیا ہے نا، بہن ہونے کا۔“

”بالکل بالکل۔ لے میں کل ہی بے بے کو تمہارے گھر بھیجوں گا.....“ چاچی سے

بات کر لیں گی۔“

”ٹھیک۔“

”ٹھیک۔“

رتو نے بات معقول کی تھی۔ یوں مسئلہ حل ہونے کی توقع تھی۔

”بس اب جاؤں۔“ رتو نے شوخی سے دونوں کو دیکھا۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“ نچو نے راجو کی طرف دیکھا۔

راجو نے برا سامنہ بنا لیا..... روٹھا روٹھا نظر آنے لگا۔ نچو جلدی سے بولی ”اچھا تو

جارتو..... میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گی.....“

”میں اپنے گھر چلی جاتی ہوں۔ بھاراجو تجھے چھوڑ جائے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ راجو بولا..... ”میں گلی کے سرے تک چھوڑ جاؤں گا۔“

”پھر وہی بات..... کسی نے دیکھا لیا تو.....“

”تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ گردنیں ہی اڑیں گی نا.....“

”وہ ہنس کر بولا.....“

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد راجو واپس چلی گئی۔

راجو اور نجو ایک دوسرے کے سامنے منڈیر پر بیٹھ گئے..... نگاہوں سے شراب محبت چھلک رہی تھی۔ دل ایک دوسرے پر فدا ہو رہے تھے۔ مسکراتے مسکراتے دونوں ایک دوسرے کو تنگے جا رہے تھے۔

وقت گزرنے کا احساس بھلا کسے ہوتا۔ دور پنڈ میں کتوں کے بھونکنے کی آوازوں پر دونوں چونک گئے۔

نجو جلدی سے بولی ”اب چلیں راجو۔ وقت بہت ہو گیا ہے۔“

”جی تو نہیں کرتا.....“ وہ بولا۔

نجو کے اصرار پر اس نے کھیس کی بکل ماری۔ بنسری کو کھیس سے پونچھا اور بولا

”چلو.....“

دونوں درختوں تلے ہوتے گاؤں کی طرف جانے لگے۔ دونوں اب بھی پیار بھری باتیں کر رہے تھے۔ وفا کی قسمیں کھا رہے تھے ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہ رہ سکنے کی باتیں کر رہے تھے۔

”نجو..... بھائی فضل نے اگر انکار کر دیا تو تیرا راجو مر جائے گا۔“

”وہ انکار نہیں کرے گا راجو..... تو نہیں جانتا وہ میرے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے اور

اگر اس نے انکار کر ہی دیا نا تو تیری نجو بھی تیرے ساتھ ہی مرے گی۔“

راجو نے ہاتھ میں لیا نجو کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔

کچھری کے احاطے میں چودھری نظام دین نے فضل کو دیکھا تو لپک کر آیا۔  
”فضل.....“

فضل نے گردن گھما کر دیکھا چودھری نظام دین تھا.....

”سلام ماما جی۔“

دونوں بغل گیر ہو گئے۔ پھر الگ ہوتے ہوئے مصافحہ کیا۔ نظام دین فضل کو دیکھ

کر بہت خوش ہوا تھا۔

”کیسے آئے ہو۔“

”میرے اک مزارعے کی پیشی تھی آج۔“

”کوئی جھگڑا ہو گیا۔“

”چھوٹے موٹے تو ہوتے ہی رہتے ہیں ماما جی..... زمین اور پانی کے

جھگڑے۔“

”انہی سے تنگ آ کر ہی تو ہم شہر میں آئے.....“

”اپنی اپنی پسند ہی ہے نا..... میں تو اپنی زمینوں کو چھوڑنا کبھی پسند نہ کروں۔“

”چھوڑی ہم نے بھی تھوڑی ہیں..... بس خود ہی اٹھ آئے ہیں شہر۔“

”اور سنائیں ماما جی۔ مامی کا کیا حال ہے۔ بھائی کیسے ہیں، بہنوں کا کیا حال ہے۔“

”سب ٹھیک ہیں۔ چلو نا مامی کو مل لو چل کر.....“

”پھر کسی دن آؤں گا۔“

”آج کیا ہے۔“

”پتہ نہیں یہاں کتنی دیر لگے۔“

”اپنی شادی کب کرے گا؟“

”نجومی کرلوں تب.....“

”اب تو بڑی ہو گئی ہوگی۔“

”ہاں۔“

”میری ریحانہ کی ہم عمر ہے۔“

”اچھا۔“

مائی چند لمحے چپ رہی، پھر مسکرا کر بولی ”گاؤں سے شہر آ کر تم سب سے ناٹھ کچھ ٹوٹ سا گیا ہے۔“

”بالکل ہی ٹوٹ گیا ہے مائی جی۔“

”جی چاہتا ہے ناٹھ جوڑ ہی لیا جائے۔“

”ضرور مائی..... آپ کی حویلی ویران پڑی ہے..... گر رہی ہے ہمیشہ کے لیے نہ سہی..... سال میں دو ایک مہینوں کے لیے ہی آ کر رہا کرو.....“

”بچے کہاں مانتے ہیں۔“

فضل چپ ہو گیا۔ مائی چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی ”شاہد وکیل بن گیا ہے۔“

”ہاں مائی..... ماشاء اللہ۔“

”اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”بسم اللہ.....“

”نجومی کے لیے پوچھوں..... تو.....“

”مائی مسکرا رہی تھی۔ فضل کچھ شپٹا گیا.....“

”اپنی بیٹی ہے۔ باہر سے جو کوئی لاؤں گی اپنی بیٹی کیوں نہ عیش کرے۔ اللہ کا دیا

سب کچھ ہے ہمارے پاس اور شاہد جیسا لڑکا بھی چراغ لے کر ڈھونڈیں تو نہیں ملے گا۔ بڑا

سعادت مند بچہ ہے.....“

فضل کچھ نہیں بولا۔

”سوچ لے..... تو پسند کرے..... تو ہم کسی دن آ جائیں رشتہ لے کر.....“

”جب فارغ ہو جاؤ تو آ جانا۔ شہر تو آتے ہی رہتے ہو کبھی کبھار مل لیا کرو..... تو کیا حرج ہے۔“

”ہرج تو کوئی بھی نہیں..... ویسے آپ لوگوں نے تو گاؤں بالکل ہی آنا چھوڑ دیا۔ خوشی میں شامل ہوتے ہیں نہ غمی میں۔“

”بس..... مصروفیت ہی رہتی ہے یہاں۔“

دونوں لوگوں کے جھرمٹوں سے قدرے پیچھے ہٹ کر برآمدے کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ چودھری نظام دین فضل کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ لیکن جب بھی ملتا تھا سگوں کی طرح ملتا تھا۔ خلوص اور محبت کی گرمی سے اس کا دل خالی نہ ہوا تھا۔

اس نے زبردستی فضل کو گھر چل کر کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ کوٹھی نما بڑے سے مکان میں چودھری نظام دین رہتا تھا۔ چھ بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سے صرف دو کی شادی کی تھی ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی۔ دو بیٹے تو شہر میں بزنس کر رہے تھے۔ ایک وکیل بن گیا تھا۔ دو کالج میں پڑھ رہے تھے اور آخری سکول میں تھا۔ دونوں بیٹیاں سکول جاتی تھیں۔ گاؤں کا یہ گھرانہ اب بالکل شہری بن کر شہری آداب سیکھ چکا تھا۔ موٹی سی مائی بھی اب دیہاتن نہ لگتی تھی..... لباس اور وضع قطع سے چودھرائن کو نیگم صاحبہ بنا دیا تھا.....

فضل سے بھی بڑے تپاک سے ملے۔ کھانے کے بعد بھی سارے بیٹے بیٹیاں اس کے ساتھ بیٹھے دلچسپی سے گاؤں والوں کی باتیں سنتے رہے۔

پھر

جب سب ادھر ادھر ہو گئے تو مائی اس کے قریب کھسک آئی اور رازداری سے بولی ”نجومی کہیں رشتہ و شہرت تو نہیں کیا۔“

”ابھی تو نہیں کیا۔“

”کب تک کرو گے۔“

”بس دیکھ رہا ہوں۔ کوئی اچھا ور مل جائے تو.....“

”تیری بات تو سیکھنے کی بیٹی سے ملے ہے نا۔“

”ہاں مائی۔“

وہ اب بھی کچھ نہ بولا..... مامی شاہد کے متعلق بتانے لگی۔  
 ”سب ٹھیک ہے مامی.....“ فضل بولا..... ”پراک پنڈ کی کڑی شہریوں میں آ کر کیسے رہے گی۔ شاہد تو بہت زیادہ پڑھ لکھ گیا ہے.....“  
 ”دل و دماغ روشن ہو گیا ہے اس کا۔“  
 ”نچو تو معمولی لکھنا پڑھنا ہی جانتی ہے۔ قرآن شریف پڑھا ہے بس۔“  
 ”تو کیا ہوا.....“  
 ”جوڑ کچھ.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”سوچ لے..... مامی راہو سے بھی صلاح کر لے۔“ مامی نے ہنس کر کہا ”خدا بخشنے تمہاری ماں سے تو میرا خاصا میل ملاپ تھا شاید اسی لیے دل کرتا ہے کہ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنالوں.....“

فضل چپ چاپ سوچتا رہا۔  
 وہ شہر سے گاؤں آتے ہوئے بھی سوچتا رہا۔ مامی کا گھر ٹھاٹ پاٹ دیکھ لیا تھا۔  
 کچہری میں شاہد کے نام کا چرچا بھی سنا تھا۔ شاہد سے مل کر بھی خوشی ہوئی تھی۔ خوبصورت جوان تھا۔ بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ گاؤں میں اراضی بھی تھی۔  
 لیکن

بار بار اسے یہی سوچ پریشان کر رہی تھی کہ گاؤں کی الہڑ کی اس ماحول میں بیچ بھی سکے گی۔

شام گھر آ رہی تھی۔ جب وہ پنڈ پہنچا۔ آسمان کا مغربی گوشہ ڈوبتے سورج کی سرخی لیے روشن روشن تھا۔ باقی ہر طرف دھندلاہٹیں پھیل رہی تھیں.....

نچو صحن میں چار پائی پر بیٹھی تھی۔ جیلاں نے آج کھوہ پر کپڑے دھوئے تھے۔ سوکھے کپڑے گٹھڑی میں باندھ لائی تھی..... جارو شلغم اور ساگ اٹھائے تھی۔ بکو اور جیراں برآمدے میں چولہے کے پاس بیٹھے تھے ہانڈی پک گئی تھی اور باسستی کے خوشبودار چاولوں کو جیراں دم دے رہی تھی۔

فضل اندر آیا۔

”سلام ویر جی۔“ نچو نے چار پائی سے اٹھتے ہوئے پیار سے کہا۔ باقی سب نے بھی سلام کیا۔

فضل نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سب کے سلام کا جواب دیا۔  
 ”ویہڑے میں کیوں بیٹھی ہو۔ ٹھنڈ نہ لگ جائے۔“ فضل نے نچو سے کہا۔  
 ”اتنی ٹھنڈ تھوڑی ہے ویر۔“

”ماسی کہاں ہے۔“

”اندر۔“

”ٹھیک ٹھاک ہے نا..... ڈر ہی لگتا رہتا ہے۔ کسی دن چل ہی نہ پڑے۔“ فضل نے ہنس کر کہا اور پھر نچو کو ساتھ لے کر دالان میں آ گیا۔ نچو کے لیے آج وہ پھر شہر سے بہت ساری چیزیں لایا تھا۔ مامی کو سلام کر کے اس نے احوال پرسی کی اور چیزیں نچو کو دے دیں۔  
 چیزیں لیے کر نچو بہت خوش ہوئی۔ ”ویر جی تم تو ایسی ایسی چیزیں لا کر مجھے بالکل شہری بنا دو گے.....“

فضل نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا اور شفقت بھرے لہجے میں بولا۔ ”شہری بننا پسند ہے تجھے.....“

نچو نے ایک دم نفی میں گردن ہلا دی۔ ”مجھے تو اپنا پنڈ ہی پسند ہے ویر جی..... یہیں پیدا ہوئی..... پلی بڑھی ہوں..... یہیں مروں گی.....“

فضل چپ ہو گیا۔ نچو چیزیں اٹھا کر جیراں اور جارو کو دکھانے لے گئی۔ فضل تذبذب میں پڑ گیا۔ مامی راہو سے مامی کی کہی ہوئی بات کہے یا نہ کہے۔

گل پروشے اپنی خواب گاہ میں تھی۔ رات بہت جا چکی تھی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔۔۔۔۔ تاج گاؤں جانے کا کہہ کر گیا تھا اور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ گاؤں میں اس کی دشمنیاں بھی بہت تھیں۔ گل پروشے کو اس نے بتایا تھا۔۔۔۔۔ علمے نے بھی گاؤں کی پوری تاریخ گل کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ حیران تھی کہ پٹھانوں کی طرح ان لوگوں میں بھی دشمنی نسل در نسل چلتی ہے۔

خواب گاہ میں آنے سے پہلے اس نے علمے سے پوچھا تھا ”سردار بہت غصہ در ہے گاؤں میں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو ان کا خاندانی وصف ہے بی بی۔“

”اچا وصف ہے۔ بزدل لوگ کا جینا خراب ہے۔“

”ایسی دشمنی سے کچھ بنتا تو نہیں بگڑتا ہی ہے۔۔۔۔۔ سکھیرے ملکوں کے جانی دشمن ہیں، ملک سکھیروں سے بیر رکھتے ہیں۔ دونوں خاندانوں میں کئی قتل ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔ کیا فائدہ۔۔۔۔۔“

”فائدہ کون سوچتا ہے علمے۔۔۔۔۔ بس خون جوش کرتا ہے۔ امارا خود یہی حال ہے۔

غصہ بہت آتا ہے۔ ام سے کوئی بے ایمانی کرے نا۔۔۔۔۔ تو اس کو چوڑا نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”آپ کے ہاں عورتیں بھی مردوں کی طرح دلیر ہوتی ہیں۔“

”ہاں۔ مرنے مارنے پہ آتا ہے نا تو عورت مرد سب برابر ہوتا ہے۔“

علماء مسکرانے لگا تھا۔۔۔۔۔

”سچ علمے جھوٹ نہیں ہے۔ دوسروں کا تو ٹھیک سے ام کیا کہے گا۔ اپنا بات کرتا ہے۔

تمارا سردار نے ام سے کبھی بے ایمانی کیا تو تم دیکھے گا ام اس کا کیا حشر کرتا ہے۔۔۔۔۔“

علماء پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا تھا۔۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ سردار اس سے بے ایمانی کر رہا ہے۔۔۔۔۔ آج بھی اسے گاؤں جانے کا کہہ کر گیا تھا۔ لیکن دوستوں کے ساتھ مل کر نئی لڑکی کے ساتھ وقت گزارنے کا پروگرام تھا۔ وہ گل کی باتوں سے اندر ہی اندر ڈر گیا۔ گل پروشے رات گئے تک تاج کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔۔ یہ پہلی رات نہ تھی اب تو اکثر وہ انتظار کرتے کرتے سو جاتی تھی۔۔۔۔۔ تاج کب آتا تھا۔۔۔۔۔ اسے پتہ نہ چلتا تھا۔

کبھی گاؤں جانے کا کہہ کر اسے مطمئن کر دیتا تھا، کبھی ٹمبر مارکیٹ میں جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے دیر کا بہانہ بنا لیتا۔ کبھی کسی عزیز دوست کی بیماری جلدی نہ آنے کا سبب بن جاتی۔ کبھی کسی کے خاندانی جھگڑے میں منصف بننے کی وجہ سے دیر ہو جاتی۔

لیکن آج وہ معاملے کی تہ تک پہنچنے کو بے تاب تھی۔ آخر وہ روز ہی گاؤں کیوں جانے لگا تھا۔ اگر کوئی دشمن داری تھی تو اسے بھی بتانا چاہیے تھا۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر کو وہ اونگھ گئی۔ لیکن ذرا سا کھٹکا ہوا۔۔۔۔۔ تو بالکل اٹھ گئی۔۔۔۔۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ تاج خواب گاہ میں آ رہا تھا۔

اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ اس نے پی رکھی ہے اور کپڑے بھی بے ترتیب سے ہیں۔ وہ یقیناً گاؤں سے نہیں آ رہا تھا۔

”سردار۔“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

تاج نے بازو سے اسے پرے ہٹایا اور خود ریٹنگ روم میں چلا گیا۔ گل کی انا مجروح ہوئی۔۔۔۔۔ دل میں ابال سا اٹھا، لیکن اپنے اوپر قابو پا کر پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد تاج کپڑے بدل کر آ گیا۔ وہ گل سے بات کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ اک نئی گلبدین سے اتنا دل بہلا کے آیا تھا کہ گل جیسی باسی شے کی اسے ضرورت تھی نہ پروا۔۔۔۔۔

لیکن گل نے تو آج اس کے انتظار میں اتنا وقت ہی اسی لیے کاٹا تھا کہ اس سے دیر سے آنے کا سبب پوچھے گی۔

تاج بستر میں گھس گیا۔۔۔۔۔ گل اس پر جھک کر بولی۔ ”کدر گیا تا۔“

”رات بہت گزر چکی ہے چپکے سے سو جاؤ۔“ تاج نے اس کی طرف رخ موڑ کر کہا۔  
لیکن اک جھٹکے سے گل نے اس کا رخ اپنی طرف کر لیا۔ ”سردار ام سے سیدھا  
سیدھا بات کرو۔۔۔۔۔“

”کیا کروں۔“

”کدر گیا تا۔ اتنی رات ہو گیا۔“

”جدھر میری مرضی تھی گیا تھا۔ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی۔“ وہ نشے اور غصے  
میں چلایا۔

اک لمحہ کو گل ٹھٹک گئی۔۔۔۔۔ اس کے اندر چھن سے شیشے ایسا نازک دل ٹوٹ گیا۔  
”ام کو پوچھنے کا حق بھی نہیں ہے۔“ گل کی آنکھوں میں اندرونی کرب سے دھند  
پھیل گئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

”کیوں ام تمہارا بیوی ہے۔“

”بیوی ہے۔۔۔۔۔ بیوی ہے۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔ تمہیں میں نے خریدا ہوا ہے۔ تم اپنی حد  
ہی میں رہا کرو۔۔۔۔۔ میں چاہوں تو تمہیں آج ہی دفع کر دوں۔۔۔۔۔ ہر وقت اعصاب پہ سوار  
رہتی ہو کم بخت۔۔۔۔۔“

اس نے تکیے میں منہ گھسا کر لحاف اوپر تان لیا۔

گل پروشے تو بت کی مانند ساکت ہو گئی۔۔۔۔۔ یہ تاج تھا۔ اس کا محبوب۔۔۔۔۔ اس کا  
شوہر۔۔۔۔۔ اس کی زندگی۔۔۔۔۔ اس کی تمنا اس کی آرزو۔۔۔۔۔  
اس کا دماغ چکرانے لگا۔۔۔۔۔

پھر

جیسے ان باتوں کا یقین نہ آیا۔۔۔۔۔ آہستگی سے رنگین ریشمی لحاف کا کونہ کھینچا اور اس  
کے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھاتے ہوئے لجاجت سے بولی ”سردار۔ اتنا غصہ کیوں  
کرتا ہے۔۔۔۔۔“

تاج نے اس کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔۔۔۔۔

گل کی نیلگوں آنکھوں میں اندھیرے گھل گئے۔ وہ اسے تکتی رہ گئی۔۔۔۔۔  
تاج نے منہ لحاف میں چھپا لیا۔۔۔۔۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔  
گل کو ساری رات نیند نہ آئی۔۔۔۔۔ اپنے پلنگ پر چپت لیٹی وہ آنکھیں کھولے  
چھت کو تکتی رہی۔۔۔۔۔ اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ طوفان ہلچل مچا رہے تھے۔ قیامت  
کی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی وہ کچھ سوچ نہ سکتی تھی۔ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی۔

اس کی زندگی کا آفتاب دکھ کے اندھیروں میں طلوع ہوا تھا۔ غربت اور افلاس  
سایہ فگن تھے۔ ماں باپ کے پیار کی چاشنی بھی اسے یاد نہ تھی۔ اس نے تو جب سے ہوش  
سنجلا تھا جبر و تشدد ہی سے واسطہ پڑا تھا۔ اس کے اندر اک حساس گل پروشے تھی جو گلوں کی  
طرح نرم و نازک اور شگفتہ تھی۔ وہ پیار و محبت کی پتلی تھی اور خلوص اور پیار کی متمنی تھی۔  
جبر و تشدد سہتے ہوئے بھی اندر کی گل پروشے اک خوبصورت حسین اور پر آسائش زندگی کے  
خواب دیکھتی تھی۔ یہ خواب اک زندہ حقیقت کی طرح اس کے اندر کی گل پروشے سمیٹتی  
رہی۔۔۔۔۔ یہ خواب پورے نہ ہوتے تو بھی یہ گل پروشے انہیں چھین لیتی۔ اس معاملے میں وہ  
ہر مرحلے سے گزرنے کو تیار تھی۔۔۔۔۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی یہ طلب بھی بڑھتی پھیلتی  
گئی۔۔۔۔۔ اس کی ضد اور اکڑ اسی طلب کا رد عمل تھی۔

خوش قسمتی سے کوئی مرحلہ پیش نہ آیا۔ وہ کسی حادثے سے دوچار نہ ہوئی۔ اندر کی  
اہلی کھولتی انتقامی کارروائیوں کو رو پڑیر ہونے کا موقع نہ ملا۔

اور

تاج نے اسے خرید لیا۔

اس کے سپنے حقیقت میں ڈھل گئے۔۔۔۔۔ اس نے وہ پالیا جو اس کے اندر کی عورت  
شدت سے چاہتی تھی۔۔۔۔۔ اور نہ پانے کی صورت میں قیامت ڈھانے پر آمادہ تھی۔ اس نے  
جو کچھ پایا تھا اپنا حق اور اپنا حصہ سمجھتی تھی۔ اس حق اور حصے سے دستبردار ہونا یا اس میں کمی  
بیشی کا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

لیکن

آج

تاج نے اس کے اندر کی دنیا تہس نہس کر دی تھی۔ اس غصیلی اور کینہ ور اور انتقامی عورت کو لاکار تھا..... جو سب کچھ پا کر اطمینان سے بیٹھی تھی۔

وہ رات بھر جاگتی رہی۔

غصے سے پھنکارتی رہی۔

اور تاج کے راہ راست پر نہ آنے کی صورت میں انتقامی منصوبے بناتی رہی۔

وہ تو خاصی نفسیاتی مریضہ تھی۔

صبح تاج کے بیدار ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ گئی۔ نہادھو کر لباس تبدیل کیا..... اپنی ساری خوبصورتی کو جیسے مجتمع کرنے کی کوشش کی.....

حسین وہ کم تو نہ تھی..... اس پر جذبات انگیز لباس اور خوبصورتی..... سنورا ہوا چہرہ ناشتے کے لیے وہ سراپا قیامت بن کر بیٹھی تھی۔

شاید

تاج کو دام میں الجھائے رکھنے کا یہ آخری حربہ تھا جو وہ استعمال کر سکتی تھی۔

تاج گاؤں پہن کر آیا اور کرسی پر اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسکی طرف دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔

گل کی انا پر چوٹ پڑی۔

لیکن

اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے مسکرائی اور سردار کو ناشتہ کر لینے کی دعوت دی۔

ناشتے کے دوران بھی تاج نے ملائمت اور شفقت کا رویہ نہ اپنایا.....

گل اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگی۔

-----○-----

”ماسی راہو۔“

”ہاں بیٹے۔“

”تجھ سے ایک بات کہنی ہے۔“

”کہو میرے لال..... کیا کہنا ہے۔“

”کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ آج خیال آیا کہ تجھ سے ہی مشورہ کر لوں۔“

”کہہ تو سہی۔“

”بات کچھ دل کو لگتی ہے اور نہیں بھی لگتی..... خیر.....“

”کہہ تو سہی.....“

فضل نے مامی کی کہی ہوئی بات ماسی راہو سے کہہ دی۔ وہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئی۔

فضل اس کے قریب ہی چار پائی پردالان میں بیٹھا تھا۔ وہ حقہ گڑ گڑا رہی تھی۔ نجو

رسوئی گھر میں تھی۔ آج اس نے نیاز دلوانی تھی۔ جارو جیلاں اور رقیہ بھی وہیں تھیں.....

سب مل کر کھیر پکا رہی تھیں..... دودھ کی فراوانی تھی۔ چار پانچ بھینسیں تھیں۔ ایک کا دودھ تو

باقاعدگی سے نجو مسجد میں بھیجا کرتی تھی۔ باقی گھر پر ہی استعمال ہوتا تھا..... دہی اور لسی کی

بھی کھپت تھی اور گھی بھی بنایا جاتا تھا۔

لڑکیاں کام میں مصروف تھیں۔ فضل نے موقع غنیمت جانا اور ماسی راہو سے دل

کی بات کہہ دی تھی۔ اب وہ اس کی رائے کا منتظر تھا۔ لیکن وہ تو چپ ہی تھی۔

”ماسی۔“

”ہوں۔“

”کیا خیال ہے تیرا.....“

اس نے یونہی سر ہلایا اور حقے کے کئی کش لے کر بولی۔ ”ہے تو اپنا ہی خون گوشت۔“

”وہ تو ہے۔“

”لیکن وہ لوگ شہر جا بے ہیں۔“

”اور بڑے ٹھاٹھ کے شہری بن گئے ہیں..... پڑھ لکھ کر ان کے طور طریقے ہم لوگوں جیسے تو نہیں رہے ناماسی.....“

”یہی گل میں کہنے والی تھی.....“

”سوچنے کی بھی یہی بات ہے۔ ہم لوگ ٹھہرے اکھڑ قسم کے دیہاتی..... طور طریقے سے آزاد.....“

”ہاں ہمارے اپنے ہی طور طریقے ہیں.....“

”نحو تو بالکل ہی آزاد پنچھی ہے۔“

”اسے شہر کے پنجرے میں ڈالنے سے پہلے اچھی طرح سوچنا پڑے گا.....“

”یہ تو ہے.....“

ماسی را بونے نفی میں سر ہلایا..... پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی ”اچھا ابھی تو چپ رہ..... سوچتے ہیں۔ بات وارہ کھائے گی تو پیغام بھیج دیں گے انہیں..... نہیں تو چپ ہی رہیں گے.....“

”اچھا ماسی.....“

”اچھا۔“

”وہ اٹھ کھڑا ہوا..... بیٹھک میں اس کے انتظار میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ نئی فصل کی بوائی کا معاملہ تھا.....“

صحن میں آیا تو رسوائی گھر پر نظر پڑی ”کیا ہو رہا ہے نجو.....“ وہ ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”کھیر پکا رہی ہوں۔“

”واہ وا.....“

”نیا زولوانی ہے.....“

”اک تو تیری منتیں مرادیں ختم نہیں ہوتیں۔ کبھی نیاز دلواری ہے، کبھی درگاہ پہ دیئے جلانے کے لیے جا رہی ہے.....“

”ابھی تو تجھے پتہ ہی نہیں ہے ویر کہ میں نے کتنی منتیں مانی ہوئی ہیں۔“ وہ بھائی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

”وہ کس بات کی مانی ہوئی ہیں۔“ فضل جان بوجھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ جانتا تھا کہ نجو کی منتیں ہیر پھیر کر اسی کی ذات سے متعلق ہوں گی۔

نجو اتر کر بولی ”مانی ہوئی ہیں رب پوری کرے گا ہی آخر.....“

”سنو تو میں بھی۔ کس کس بات کی مانی ہیں منتیں، میری یگی بہن نے۔“

”اپنے ویر کے سوہنے سہروں کی..... اپنی چند اور گی بھابی کی.....“

فضل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

نجو نے روٹھنے کے انداز میں منہ بنایا.....

فضل ہنسنے لگا تو وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر تنک کر بولی ”ہنسنے کی کیا بات ہے۔“

”یہ کہ.....“ فضل اس کے قریب آ کر اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولا

”سوہنے سہرے تو ٹھیک ہے.....“

”چند اور گی بھابی کہاں سے آئے گی۔“

”کیوں۔“

”ارے تیری بھابی تو ہے کالی کلوٹی بیگاں۔ کیا بیگاں کو بھابی بنانے کا ارادہ نہیں۔“

کوئی چاندی کڑی ڈھونڈ لی ہے میرے لیے۔“

”اے ہے ہے.....“ نجو ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی ”بیگاں کا مقابلہ کوئی

کر سکتی ہے..... سات پنڈوں میں بھی اس ورگی کڑی نہیں کوئی۔“

”اوہو ہو..... یہ بات ہے.....“

”ہاں۔“



کمرے..... کمروں کے سامنے باغیچہ اور پھلے ہوئے درخت۔ گھر کی آن بان ان سب چیزوں سے چھلکتی تھی۔ راجو کی ماں اور صاحبان خاصہ مرعوب اور کچھ کچھ سہمی ہوئی لگ رہی تھیں.....

وہ اندر چلی گئیں..... نجو چادر کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے مسکرائی اور مورنی کی سی چال چلتی رسوئی گھر کی طرف چل دی۔



”ہر لحاظ سے اچھی ہوگی..... پر کالی کلوٹی ہے وہ..... گوری تو نہیں ہے نا.....“  
”ہائے۔ ایسی بانگی ہے۔ اس کی چھب کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا ہے۔ تازی کنک ایسا دمکتا رنگ ہے اس کا۔“

”جی۔“

”آں..... جیسے جانتے نہیں۔“

”کیسے جانوں.....“

”ہٹو جی..... بڑے آئے.....“

بہن بھائی پیار بھری چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے کہ رتو کی ماں آ گئی۔ اونچی لابی موٹی تازی جی تھی وہ..... کالا تہبند نیلا کرتہ اور کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

”سلام چاچی۔“ فضل بولا۔

”وعلیکم سلام۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ فضل کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نجو کے سلام

کا جواب دیا۔

نجو نے دیکھا اس کے ساتھ راجو کی ماں اور پھپھی صاحبان بھی تھیں۔

فضل نے سب کو سلام کیا۔ عورتوں کے آ جانے پر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

نجو کا دل بے اختیارانہ دھڑکنے لگا۔ وہ سر پر چادر ڈالتے ہوئے رسوئی گھر

سے نکل آئی..... راجو کی ماں اور پھپھی کو سلام کیا۔ دونوں نے اس کے خوبصورت سراپا پر نگاہ ڈالی.....

اس کے سر پر باری باری ہاتھ پھیر کر دونوں نے دعا دی۔

”ماسی را بوکھاں ہے۔“ رتو کی ماں نے پوچھا۔

”دالان میں۔“ نجو نے کہا

”آؤ بھین۔“ رتو کی ماں دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ نجو چپ چاپ کھڑی تھی اور

رسوئی کے دروازے میں سے تینوں لڑکیاں جھانک جھانک کر آنے والیوں کو تنک رہی تھیں۔

رتو کی ماں دالان کی طرف بڑھی۔ اس کے پیچھے راجو کی ماں اور صاحبان بھی

اندر گئیں۔ فضل کی اتنی بڑی حویلی کے وسیع و عریض صحن اور گردا گرد بنے پکے

تاج مسکراتا ہوا گھوڑی سے اتر.....

”کدھر جا رہے ہو جی.....“ وہ بولا.....

بیگیاں نے کمرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تند لہجے میں کہا ”تو بار بار میری راہ میں کیوں آ رہا ہے.....“

”میں تو نہیں آ رہا..... قسمت لا رہی ہے.....“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”تو اچھی طرح جانتا ہے میں کون ہوں۔“ بیگیاں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”ہاں جانتا ہوں..... تو سارے پنڈوں کی سب سے زیادہ ہانکی چھیلی ناری ہے.....“

”تاج..... بکو اس بند کر.....“

وہ ہنس کر بولا ”غصے میں تو اور بھی سوئی لگتی ہے.....“

”تیری موت تجھے لگا رہی ہے.....“

”اوائے موت سے کون ڈرتا ہے پگئے..... تیری خاطر مرنا بھی پڑے..... تو کوئی

بات نہیں.....“

”تاج.....“

”سوہنے۔“

بیگیاں نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا ہوا کٹورا تاج کو کھینچ مارا۔ وہ دائیں ہاتھ جھک

کر وار بچا گیا اور اس بات پر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

بیگیاں شعلہ جوالا بنی کھڑی تھی۔ دانت پیستے ہوئے اسے خونی نظروں سے دیکھ

رہی تھی۔

وہ تو پتہ نہیں کس ڈھیٹ مٹی کا بنا تھا۔ برابر ہنسنے جا رہا تھا۔ بیگیاں نے اسے کوسنا

شروع کر دیا۔

”بس بس.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”اس منہ سے تو پیار کے پھول جھڑنے

چاہئیں..... گالیاں جتنی نہیں ہیں.....“

”جنگ آ کر بیگیاں نے چاچے اور دیروں کی دھمکی دے ڈالی.....“

”تاج..... تو اپنی حرکتوں سے باز آ جا..... میں نے چاچے اور دیروں کو اشارہ بھی کر دیا نا..... تو تیری ہڈی بوٹی ایک کر دیں گے۔“ تاج کھلکھلا کر ہنس دیا.....

آج اس نے پھر بیگیاں کا راستہ روکا تھا۔ بیگیاں واڑے سے اپنی بھوری کودکھ کر آ رہی تھی۔ بھوری کل رات سے کچھ بیمار تھی۔ رمضان بابا نے اسے گڑ اور خالص گھی پلایا تھا۔ اب وہ قدرے ٹھیک تھی۔ بیگیاں کی تو یہ بہت پیاری بھینس تھی..... وہ کتنی دیر سے اس کو پیار کرتی رہی تھی۔ تھپتھپایا تھا..... گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی تھی۔

اب وہ خراماں خراماں گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سلور کا کٹورا تھا جس میں رمضان بابا کے لیے گندلوں کا ساگ لے کر آئی تھی۔

کھیتوں کے درمیان درمیان بنی پگڈنڈیوں پر چلتے وہ بھوری کے متعلق سوچ رہی تھی۔ پچھلے دنوں اس کی سہیلی کی بھینس مر گئی تھی۔ اگر اس کی بھوری کو بھی کچھ ہو جاتا..... تو.....

بھوری تو اسے جہیز میں ملنا تھی۔ اس کے چاچے نے تو سونے کا ٹکا بھی بھوری کے ماتھے پر سجانے کے لیے بنوا چھوڑا تھا۔ گولے والی چادر ڈال کر بھوری کو جہیز میں دینا تھی۔

پگڈنڈیاں ختم ہو گئیں تو وہ پرانے قبرستان سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی تھی کہ سامنے سے نسواری اور سفید گھوڑی پر سوار تاج آتا نظر آیا۔

بیگیاں اس سے ڈرتی تو نہیں تھی، لیکن خواہ مخواہ ٹاکرا ہونے سے کتراتے ہوئے اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔ وہ واپس مڑی اور دائیں ہاتھ کے بڑے میدان سے ہو کر گھر جانا چاہا۔

تاج اس کا عندیہ جان گیا۔ گھوڑی کو ایڑ لگائی اور گھوم کر اس کے پھر سامنے آ گیا.....

اب چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ رک جائے۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

پھر بولا..... ”آج ملک فضل کا ڈراوا نہیں دیا بیگاں۔“

بیگاں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ بزدل ملک..... ہا ہا ہا.....“ بڑے تمسخر سے تاج ہنسا تو بیگاں پیچ و تاب

کھاتے ہوئے بولی ”میں نہیں چاہتی تھی بات ملک فضل تک پہنچے لیکن پتہ چلتا ہے تیرے دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں.....“

”واہ واہ.....“

”میں ملک فضل کی منگ ہوں۔ بچپن کی منگ۔“

”دشمن کے ہاتھ سے ہی تو..... چھیننے کا مزہ آئے گا.....“ وہ ہنس کر بولا۔

”یہ بات ہے۔“

”بالکل۔“

”تو پھر تیار رہنا.....“

”ڈرتا کون ہے۔ تجھے حاصل کرنے کے لیے تو میں ہر رکاوٹ سے ٹکرا جاؤں

گا۔ ملک فضل کیا چیز ہے سوہنیو.....“

”تجھے پتہ چل جائے گا وہ کیا چیز ہے۔ غیرت مند جب اپنی آبرو پر آنچ آتے

دیکھیں تو قیامت بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں سمجھے۔“

”سمجھ گیا.....“

”بس پھر تیار رہنا.....“

”تو بھی تیار رہ بیگاں.....“

”منگ تو بے شک فضل کی ہے لیکن حاصل تو تجھے میں ہی کروں گا.....“

”کتیا..... کمینیا..... میں نہیں چاہتی تھی..... کہ پنڈوں میں خون خرابہ ہو..... اور

پرانی دشمنیاں نئے روپ میں پھر سے جاگ پڑیں۔ پر..... تیری موت تجھے پکار رہی ہے.....“

”دیکھیں گے۔ کس کی موت کسے پکارتی ہے..... جو بھی ہو دیکھا جائے گا..... پر

تیرے لیے تاج سکھیرا سب کچھ کر گزرے گا.....“

بیگاں کی برداشت جواب دینے لگی..... وہ خونخوار شیرنی کی طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے گالیاں بکنے لگی۔ اچانک ہی پچھلے کھیتوں میں کچھ آوازیں سنائی دیں۔

بیگاں نے پلٹ کر دیکھا..... کچھ عورتیں کالے تہبندوں، نیلے کرتوں اور کالی چادروں میں ملبوس سروں پر گاگریں اٹھائے آپس میں باتیں کرتی چلی آرہی تھیں..... ان کے ساتھ بچے بھی تھے..... اس لیے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں.....

بیگاں نے گردن گھما کر تاجے کی طرف دیکھا وہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر جانے کو تیار تھا۔

”بزدل۔“

بیگاں نے اک قہقہہ لگایا.....

تاج گھوڑی دوڑاتے دوسری طرف چلا گیا۔

-----O-----

”وے فضل.....“

”جی چاچی۔“

”ہم اس دن تیرے گھر گئے تھے۔“

”ہاں چاچی۔“

”راہو نے بات کی تھی۔“

”ہاں۔“

”پھر۔“

فضل نے کوئی جواب نہ دیا، صرف سر اثبات اور نفی کے بین بین ہلا دیا۔ وہ اس وقت چار پائی پر بیٹھا تھا۔ کھیتوں میں کافی ہلچل تھی۔ نور اتھوڑی دور بیٹھا ٹوکے سے پٹھے کاٹ رہا تھا۔ بھینسوں کے لیے پٹھے کاٹ کاٹ کر اس نے ڈھیر لگا دیا تھا۔ اس سے پرلی طرف شیشم کے درختوں کے قریب بیلنا چل رہا تھا جہاں گنا پیڑا جا رہا تھا۔ اس دفعہ فضل کا گنا بھی بہت ہوا تھا۔ گڑ بنانے میں کافی فائدہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بیلنا اور خرید لے۔

وہ چار پائی پر بیٹھا بھی ابھی بیلنے کے متعلق ہی مہر سے باتیں کر رہا تھا۔ مہر نے بھی اسے یہی رائے دی تھی۔ مہر حقہ گڑ گڑا رہا تھا۔ پھر وہ حقہ لے کر نور کے پاس چلا گیا تھا۔ فضل اٹھنے ہی کو تھا..... کہ رتو کی اماں اپنی سہیلیوں سے ادھر آ گئی۔ وہ فضل کے قریب ہی چار پائی پر بیٹھ گئی۔

آج دن بے حد نکھرا ہوا تھا۔ پیلی پیلی دھوپ چاروں طرف سنہرا پھیلا رہی تھی۔ دھوپ بدن میں تازگی اور نکھار بھر رہی تھی۔ کہر آلود صبح سے جسم ٹھہرے ہوئے جو تھے۔ رتو کی اماں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد قدرے راز داری سے بات شروع کی تھی۔

”منڈا تو بڑا ہی چنگا ہے۔“ وہ فضل کی گوگو حالت دیکھ کر بولی ”ہاں دولت جاسیداد کے لحاظ سے تیری برابری کا نہیں۔“

”ہوں۔“ فضل نے صرف اسی قدر کہا۔

”شرافت ماں بیٹوں کی مانی ہوئی ہے۔ شکل و صورت میں اس کا جواب نہیں گاؤں کے سارے جوانوں میں سے زیادہ جیالا گھرو ہے۔“

فضل مسکرا کر بولا ”چاچی..... کیا رشوت لی ان سے۔“

”تیرا ستیاناس۔“ اس نے پیار سے فضل کے سر پر ہاتھ مارا۔

”میں تو حق کی بات کر رہی ہوں..... لوگ اچھے ہیں..... راجو کا دادا تو اس پنڈ کا

معتبر بندہ تھا۔ بس خدا بچائے..... ایسی انہونی سر پر آن پڑی کہ زررہا نہ زمین.....“

”ہاں چاچی۔“

”یہ تو سب ہی جانتے ہیں نا..... پنڈ والوں سے کون سی گل چھپی ہے۔ یہ لوگ

یونہی برباد ہوئے۔“

”ہوں۔“

”فضلے۔“

”جی۔“

”اک میری بات پلے باندھ لو۔“

”کیا چاچی۔“

”دولت پر گھمنڈ نہیں کرنا.....“

”میں کب کرتا ہوں چاچی..... اپنا بھی تو وہی حال ہوا ہے جو راجو کا۔ سکھیروں

سے دشمنی میں ہمارے پلے بھی کیا رہا ہے۔“

”اللہ جانے ہم پنڈ کے لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ دشمنیوں میں خاک ہو جاتے

ہیں۔ پھر بھی نہیں سمجھتے.....“

”بالکل..... اب میں نے تو سکھیروں کی دشمنی رب دی قسمے دل سے نکال دی

ہے..... پروہ لوگ.....“

”وہ لوگ بھی اس دشمنی سے تنگ آ چکے ہیں.....“

”تا جے میں ذرا تنگ ہے۔“

”ہاں..... باقی بڑے دونوں بھائی تو بہت سادے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے پناہ

ہی مانگتے ہیں.....“

”تا جاجو ہے۔“ فضل نے تا جے کو دہلی زبان میں گالی دی۔

”وہ تو سدا شہر میں ہی رہتا ہے۔ سنا ہے بد معاشیاں کرتا پھرتا ہے۔“

”ہاں چاچی..... اس کے یاروں میں چوٹی کے غنڈے بھی شامل ہیں۔

انگریز افسروں سے بھی دوستی بنا رکھی ہے۔ بس من مانی کرتا پھرتا ہے.....“

”جنہم میں ڈالوا سے..... ہاں تو سناؤ پھر کیا سوچا ہے راجو کے متعلق۔“

”ابھی کچھ بھی نہیں.....“

”کیوں۔“

”بس..... فیصلہ نہیں کر سکا..... دراصل کچھ اور لوگ بھی پوچھ رہے ہیں.....“

”مجھے پتہ ہے سب..... وہ چکرالے کا چودھری غلام محمد بھی آیا تھا نا اپنے بیٹے

کے لیے۔“

”ہاں۔“

”اور شاہ پور کے چٹھوں کے دولڑکوں کا بھی رشتہ آیا ہے۔ منیرے کی ماں نے بھی

پوچھا ہے..... اور اکبر کی بھابی نے بھی۔“

”تو تجھے سب پتہ ہے چاچی۔“

”کیوں نہیں۔ میں کوئی غیر ہوں.....“

”کون بتاتا ہے تجھے.....“

”بس یہ کیوں بتاؤں۔“

”رتو اور نجو سہیلیاں ہیں نا۔“

”بس سمجھ جا پھر.....“

”ایک اور رشتے کا تو تجھے پتہ ہی نہیں چلا۔“

”کس کا.....“

”چودھری نظام دین کے لڑکے شاہد کا۔“

”کون نظام دین۔“

”ماما نظام دین۔ جو شہر چلا گیا ہے۔ اس کا لڑکا وکیل بن گیا ہے۔ مامی نے بہت

زور لگایا..... نجو کا رشتہ شاہد کے لیے لینے آنا چاہتی تھی.....“

رتو کی ماں چند لمحے چپ ہو گئی۔

فضل بولا..... ”چاچی ایک طرف مامی نظام دین نے پوچھا ہے اور دوسری طرف

تو راجو کے رشتے کے لیے کہہ رہی ہے جو مامی نظام دین کی زمینوں پر واہی کرتا ہے.....“

”ہوں۔“ رتو کی اماں نے صرف اسی قدر کہا۔

”باقی سب رشتے تو ایک طرف ان دور رشتوں کی وجہ سے سوچوں میں پڑ گیا ہوں۔“

”بات سوچنے والی تو ہے..... پر.....“

”پر کیا.....“

”گاؤں کی کڑی شہر کے اتنے پڑھے لکھے لڑکے کے ساتھ صحیح گزارہ کر سکے گی؟“

”یہ بھی سوچنے کی بات ضرور ہے۔“

”گل سن فضلے.....“

”سنا چاچی۔“

”تو پنڈ میں اکیلا ہے تیرا نہ ماما نہ چاچا نہ بھائی..... کوئی بھی نہیں.....“

”ہاں۔“

”نجو کو شہر بیاہ دے گا تو وہ شہر ہی کی ہو جائے گی۔“

”ہاں۔“

”پھر پنڈ میں اکیلا ہی رہ جائے گا۔ شہر کے لوگ پنڈوں میں آنا پسند نہیں کرتے۔

اب نظام دین کے خاندان ہی کو دیکھ لے۔ کوئی پلٹ کر آیا ہے کبھی.....“

”ٹھیک کہتی ہے تو چاچی.....“

”پھر نجو.....“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ فضل نے گردن موڑ کر چاچی کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت کچھ سمجھ گیا۔

سمجھ تو اسی دن گیا تھا جس دن ماسی راہو نے بتایا تھا کہ راجو کے لیے اس کی ماں پھپھی اور رتو کی ماں آئی ہیں..... ان کے رشتہ پوچھنے کی جرأت کے پس پردہ ضرور کسی کی تحریک تھی۔ پھر رتو کی ماں کا ساتھ آنا، کڑی سے کڑی مل گئی تھی..... اور اسے محسوس ہوا تھا کہ ضرور نجو اور راجو میں چاہت کا رشتہ استوار ہو گیا ہے۔ وہ سوچوں میں اسی لیے الجھ گیا تھا۔ ذاتی طور پر وہ مامی اور ماما سے متاثر ہوا تھا۔ سلجھا ہوا پڑھا لکھا شاہد بھی اسے بہت پسند آیا تھا۔ شہری زندگی کی آسائشیں بھی نجو کے لیے پانے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔

لیکن

راجو کا رشتہ آنے سے وہ سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ سمجھ نہ پاتا تھا کہ کیا کرے۔ آج چاچی کی باتوں نے بھی یقین دلادیا تھا کہ راجو اور نجو میں کوئی نسبت ضرور ہے..... وہ چپ ہو گیا۔

چاچی اٹھتے اٹھتے بولی ”پترا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا..... تو اکیلا ہے راجو تیرا بازو بن سکتا ہے۔ دولت آئی جانی شے ہے۔ راجو کے دادا کے پاس نہ رہی..... تیرے باپ کے ہاتھوں سے کتنی نکل گئی..... اس کا کیا ہے۔ اصل چیز تو شرافت ہے بہادری ہے چاہت ہے.....“

”ہاں چاچی۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”جلدی کی ضرورت نہیں۔ اچھی طرح سوچ کر ہی فیصلہ کرنا۔“

”اچھا چاچی..... جو رب کو منظور ہوگا..... ہو جائے گا۔“

”نجو کا تو بھائی نہیں باپ بھی ہے.....“

”وہ مجھے بہت پیاری ہے چاچی.....“

”وہ تجھ پر جان دیتی ہے۔ مجھے پتہ ہے۔ تیرے ہر فیصلے پر سر جھکا دے گی۔ کبھی

ہونٹ پر سے ہونٹ بھی نہ اٹھائے گی۔ تیری آن پر ہنسی خوشی قربان ہو جائے گی۔ پر پترا.....

تو بھی..... اس کی آنکھوں میں اس کی خوشیاں پڑھ لینا.....“

چاچی ایک دم مڑی اور سامنے چل دی جہاں راجاں کھیت کی منڈیر پر بیٹھی اپنے چھ ماہ کے بچے کو چھاتی سے لگائے دودھ پلا رہی تھی۔ فضل پھر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ مہر چلم بھر کر لے آیا تھا۔ دونوں گنے اور بیلنے کی باتیں کرنے لگے۔



ہے اس کا مدا کیونکر کرے۔

نحو کچھ نہیں بولی۔ چند لمحے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اپنی سرخ چھینٹ کی چادر کا کونہ مروڑتی رہی۔

”چلتی ہوں۔“ پھر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہے۔“ رتو بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی جھانجھریں بج اٹھیں۔ سراج اس کے لیے آج ہی جھانجھریں لایا تھا۔

نحو اب قدرے سنبھل چکی تھی۔ بولی ”رتو جھانجھریوں کی مبارک ہو۔“

رتو کو قطعاً خوشی نہ ہوئی۔ اس نے مبارک کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

”کہاں جا رہی ہے۔“

”گھر۔“

”کیا کرے گی۔“

”کرنے کو کئی کام ہیں۔“

”ماسی را بوسے تو کچھ نہ کہے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”یہی کہ میں نے تجھے بات بتادی ہے۔“

”اچھا ہی کیا جو بتادیا.....“

”تو..... کیا کرے گی اب۔“

”پتہ نہیں۔“

”بھافضل کو میں کہہ دوں۔“

”نہیں۔“

”ہائے پاگلے۔ اسے کیا پتہ کہ تو راجو سے پیار کرتی ہے۔“

”تو اس کو یہ بات بتائے گی؟“

”اشارہ تو کر دوں گی۔“

”نہیں۔“

رتو نے شاہد کے رشتے والی بات نحو کو بتائی تو وہ جیسے سکتہ میں آ گئی۔ پوری آنکھیں کھولے رتو کو تنگے گئی۔

”میری ماں نے تو بھافضل کو یہی سمجھایا ہے کہ پنڈ پنڈ ہے شہر شہر..... یہاں کی کڑیاں وہاں خوش نہیں رہ سکتیں۔“

نحو کچھ نہ بولی..... اس کے کانوں میں فضل کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”شہری بننا پسند ہے تجھے؟“

وہ اسی دن شہر سے اس کے لیے بہت سی چیزیں لایا تھا۔ بڑا خوش بھی تھا..... ماما کے ہاں جو ہو کر آیا تھا۔

رتو نے نحو کو کندھا پکڑ کر ہلایا۔ وہ اس کے قریب ہی تو رنگین پلنگ پر بیٹھی تھی۔ چھابے میں مونگ پھلی، اخروٹ اور مکئی کے بھنے ہوئے دانے رکھے تھے۔ دونوں مزے سے

کھا رہی تھیں کہ اچانک رتو نے شاہد کے رشتے والی بات جو اس نے اپنی ماں سے سنی تھی اسے بتادی۔

رتو نحو کو یہاں بت بنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ جلدی سے اسے کندھا پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ کر ساتھ لپٹا لیا۔

”نحو میری بھین.....“

”ہائے اللہ..... تیری بات شاہد کے ساتھ طے تھوڑا ہی ہو گئی ہے.....“

”میں خود بھافضل کو بتا دوں گی..... تو کیوں فکر کرتی ہے۔“

”نحو..... خدا کے واسطے..... اتنا تو نہ گھبرا.....“

رتو نحو کو تسلیاں دینے لگی۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ نحو کو بات بتا کر جو صدمہ پہنچایا

”کیوں؟“

”مجھے اپنے ویر کی خوشیوں کے سامنے اپنی کسی خوشی کی پروا نہیں.....“

”نحو.....“

”سچ کہتی ہوں۔ اگر اسے میرا رشتہ شہر میں کر کے خوشی ہوتی ہے تو میں سر

جھکا دوں گی..... اس کی خوشیاں.....“

”پاگلے..... جھلے.....“ رتو نے اس کی بات ادھوری رہنے دی اور اسے کندھوں

سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا.....

”اسے شاہد سے رشتہ کر کے کیا خوشیاں مل سکتی ہیں.....“

وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر آہستگی سے سر اٹھا کر بولی ”راجو غریب ہے رتو.....

شاید میرے ویر کی پگ کا اونچا شملہ اس کے ساتھ بہن کا رشتہ کرنے سے نیچا ہو جائے.....“

”ہائے اللہ.....“

”میں اپنے ویر کی عزت پر کبھی حرف نہ آنے دوں گی.....“

”راجو مر جائے گا نحو..... تو جانتی نہیں تجھے وہ کتنا پیار کرتا ہے.....“

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی ”جی شاید میں بھی نہ سکوں رتو.....“

اس کا جی بھر آیا۔ بڑی بڑی فسوں ساز آنکھیں دھندلا گئیں اور وہ اپنا بازو

آنکھوں پر رکھ کر تیزی سے رتو کے دالان سے نکل گئی۔

چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھتی وہ اپنے گھر آئی تو بکوسا منے ہی کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے بی بی۔“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ دالان میں چلی گئی۔

جیراں اور جیلاں رسوائی گھر میں تھیں۔ بکونے انہیں بتایا تو وہ لپک کر آئیں۔ نحو

اپنے پلنگ پر اوندھی پڑی تھی۔

”ماں صدقے کیوں۔“ جیراں نے جلدی سے اس پر جھک کر پوچھا.....

”نحو..... کیا ہوا کیوں رورہی ہے۔“ جیلاں نے اس کا چہرہ اونچا کرنا چاہا.....

ماسی راہو بھی اپنی لالٹھی ٹیکتی اندر آ گئی۔

”کیا ہوا۔ مجھے بھی بتاؤ کچھ۔“ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

”نحو روتی ہوئی آئی ہے اور پلنگ پر پڑ کر رورہی ہے۔“ جیلاں بولی۔

”ہائے میں مر جاواں.....“ ماسی راہو اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”میری لاڈو کی

آنکھوں میں آنسو کیوں آئے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا۔ تو تو رتو کے گھر گئی تھی، لڑائی ہو گئی سکھی

سے۔ بتانا.....“

نحو آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی..... ”ماسی کچھ بھی نہیں ہوا.....“

”تو رو کیوں رہی ہے۔“ وہ بولی

”کبھی کبھی رولیا جائے تو کیا ہرج ہے۔“ نحو ہنس پڑی۔

”ہائے ہائے۔ تم نے تو میرا کلیجہ ہلا دیا تھا نحو.....“ جیراں نے کہا۔ جیلاں کن

آنکھوں سے نحو کو دیکھ کر اشاروں میں بات پوچھنے لگی۔

نحو نے وقتی طور پر تو ماسی راہو کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ سکھیوں سے ان بن ہو گئی تھی۔

لیکن

فضل کی آنکھوں میں دھول جھونکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کوشش کے باوجود

اپنے چہرے سے دکھ درد کی کیفیت کے آثار نہ مٹا سکی۔ ایک مہیب سی خاموشی اس کے سراپا

پر چھائی تھی۔ فضل کی نظروں سے یہ سب کچھ کیسے چھپ سکتا تھا۔

شام وہ کھیتوں سے واپس آیا تو ماسی راہو نے اسے بتایا..... ”نحو کی سکھیوں سے

ان بن ہو گئی تھی۔ پاگل لڑکی گھر آ کر روتی رہی۔“

فضل کے سینے میں جیسے تیر سا چھ گیا۔ نحو کو اپنے بازو کی لپیٹ میں لے کر بولا

”کیا بات ہوئی تھی۔“

”کچھ نہیں۔“ نحو ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

”تو روئی کیوں تھی۔ رائے.....“ فضل پوچھنے پر بھند تھا۔

”ایسے ہی ویر جی..... روئی تھی..... تو کیا ہوا..... ہر وقت ہنتے ہی تو نہیں رہنا

چاہیے۔“ وہ بچھی بچھی آواز میں بولی۔

”جب تک میں زندہ ہوں نا نحو تجھے ہنتے ہی رہنا پڑے گا.....“ اس نے تھپکا۔



نشے میں دھت اک البیلی حسینہ کو بازو کی لپیٹ میں لیے تاج گاڑی سے اترا.....  
 اس کے دوستوں نے یہ نو خیز کلی اسے بازار حسن سے لا کر دی تھی۔ دولت مند آدمی کو بازار حسن میں جانے کی ضرورت نہ تھی۔ پیسے کے قدموں میں تو پورا بازار حسن سرنگوں ہو سکتا تھا۔ عورت اور شراب تاج کی کمزوری بن چکے تھے۔ اس کے مفاد پرست دوستوں نے اسے ایسی لت ڈال دی تھی زمینیں سونا اگل رہی تھیں اور لکڑی کا کاروبار چمک رہا تھا.....  
 گل پروشے گھر پہ تھی۔ ڈرائنگ روم میں آتش دان میں لکڑیوں پر نظریں جمائے سوچوں میں گم تھی۔ اس کے ذہن پر ان دنوں پریشان کن بوجھ تھا۔ اس کی جنت جس کی وہ متوالی تھی اجڑ رہی تھی۔ تاج اب اس سے بالکل بیگانہ ہو چکا تھا۔ دونوں کے بیڈ روم بھی اب الگ تھے۔ وہ اس گھر میں کسی فالتو اور نا کارہ شے کی طرح پڑی تھی۔  
 جنت جب تک خیالی خیالی تھی گلے پروشے کے جذبات اتنے شدید نہ تھے۔ لیکن جنت پا کر اس میں کچھ عرصہ گزار کر اس کی لذتوں سے آشنا ہو کر اس کی آسائشوں میں ڈوب کر اس سے بچھڑ جانا کسی قیامت کے رونما ہونے سے کم نہ تھا..... قیامت، تو ہوتی ہی ہے لیکن جب قیامت جذبات کی دنیا میں پناہ تو پھر اس کے مہلک اثرات کا اندازہ لگانا ممکن ہو جاتا ہے۔

گاڑی کی آواز پر گل پروشے چونکی..... کرسی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ دبیز قالین پر چلتی کھڑکی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ پردہ ذرا سا سرکایا..... اور باہر دیکھنے لگی۔  
 تاج کے ساتھ نو جوان خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس کا سارا بدن کانپ کانپ گیا۔  
 تاج اسے لے کر کوریڈور سے ہوتا اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔

”ویرجی.....“ وہ اس کے کندھے سے سر لگا کر بولی ”اب کبھی نہیں روؤں گی۔“  
 کچھ بھی ہو جائے نہیں روؤں گی.....“  
 نجو کے الفاظ سے فضل اچانک چونکا۔ نجو کو کندھے سے ہٹا کر چند لمحے اس کا چہرہ سمکھتا رہا..... وہ بھیگی پلکیں جھکائے بے حد اس نظر آ رہی تھی۔ فضل بہت کچھ سمجھ گیا۔  
 آہستگی سے بولا ”میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں خوشیوں کی چمک دیکھنے کا آرزو مند ہوں نجو.....“

پھر۔ اسی رات جب رتو کے گھر کی بیرونی بیٹھک میں لوگ بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے اور سیف الملوک کے خوبصورت بول جامو چٹھہ اپنی سریلی آواز میں الپ رہا تھا..... فضل چپکے سے اندر گیا..... رتو کو بلایا..... اور ساری بات اس سے اگلوالی۔  
 رتو نے ڈرے ڈرے سہمے سہمے ڈھکے چھپے لفظوں میں نجو کی پسند فضل کو بتادی۔  
 وہ چند لمحے چپ رہا پھر آہستگی سے بولا ”رتو بھین۔ نجو کو بتا دینا کہ اس کی خوشیاں مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔“

”سچ بھ فضل۔“

”ہاں رتو۔“

”شکر ہے رب کا۔“

”راجو اچھا لڑکا ہے..... اس کے پاس زمین نہ سہی شرافت تو ہے..... وہ گھرو جوان ہے..... جیالا ہے۔ پھر میں بھی تو اکیلا ہوں۔ وہ بھی اکیلا ہے..... ہم دونوں ایک دوسرے کے بازو بنیں گے.....“  
 ”بھ فضل.....“

”رتو خوشی سے جیسے پاگل ہو گئی.....“

رات کافی ہو گئی تھی..... اور ابراؤد آسمان سے کبھی کبھی بوند باندی بھی ہو رہی تھی..... ہوا بھی ٹھنڈی تھی..... لیکن وہ اتنی بڑی خبر کو کیسے صبح تک سہار لیتی۔ اماں کی گرم چادر کی بکل اچھی طرح ماری..... اور دوڑی ہوئی نجو کے گھر چل دی۔

گل پروشے کھڑکی سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی..... چند لمحے اپنے انٹوٹے کے عالم میں مروڑتی رہی۔

پھر

اسے جتنی گالیاں پشتو اور اردو میں آتی تھیں، تاج کو نکالنے لگی۔ اس پر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو مشتعل ہو کر ڈرائنگ روم سے نکلی تو کوریڈور میں تیزی سے چلتی تاج کے بیڈ روم کی طرف آئی۔

دروازہ بند نہیں تھا..... لڑکی ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑی کرے کا جائزہ لے رہی تھی..... اور تاج قریبی صوفے پر نیم دراز لڑکی کو بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

”ادھر آ جاؤ میری جان.....“ اس نے بازو پھیلائے..... اس کی آنکھوں میں جیسے خون کی سرخی تھی۔ چہرہ متمار ہا تھا اور بہکا جا رہا تھا۔ لڑکی نے اک ادا سے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا..... پھر بولی ”میں ذرا کمرے کا جائزہ لے رہی تھی.....“

”پسند ہے۔“

”بہت زیادہ۔“

”کہو تو ہمیشہ کے لیے تمہیں یہاں رکھ لوں.....“

”جی؟“

”بالکل۔“

”آپ بہت مالدار ہیں؟“

”ہاں۔ جتنا چاہو تم پر لٹا سکتا ہوں۔“

”میری خوش نصیبی ہے سرکار.....“

”آ جاؤ اب ادھر.....“

تاج نے پھر بازو پھیلا دیئے..... لڑکی خراماں خراماں اس کی طرف بڑھی۔

لیکن

اس کی آغوش میں ہمہ سپردگی بن کر گرنے سے پہلے ہی وہ گل پرانے کے شکنجے میں تھی۔ گل پروشے نے اس کے بالوں میں مٹھی بھر رکھی تھی اور جھٹکے سے اسے ہڈا کر کے

اس کا منہ اپنی طرف پھیر لیا تھا۔

وہ اس وقت اک خونخوار شیرنی بنی ہوئی تھی۔

لڑکی اس اچانک وار سے اس طرح بوکھلائی..... کہ بال نوچے جانے کی اذیت پر بلبلابھی نہ سکی..... حیران ہو کر گل پروشے کو دیکھا۔

”کون ہے تم۔“ گل پروشے گرجی۔

لڑکی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گل پروشے کو دیکھا۔

گل پروشے نے اک گندی سی گالی دے کر اسے جھنجھوڑ کر دھکا دیا۔ وہ صوفے کے کنارے سے ٹکرا کر گری۔ گل نے ایک لات جمائی۔

لیکن

دوسرے لمحے تاج صوفے سے اٹھ کر گل پروشے تک پہنچ کر دھاڑا۔ ”ذلیل۔ کمینہ..... کتیا.....“

”سردار۔“ گل پروشے اس سے زیادہ بلند آواز میں چیخی۔

”بکو اس بند کرو۔“ سردار نے ایک زوردار تھپڑ گل کے منہ پر مارا۔ گل کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ اس نے گال پر ہاتھ رکھ کر ساکت نظروں سے تاج کو دیکھا..... آج پہلی بار اس نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب تک تو صرف بک بک ہی ہوتی تھی۔ مار کھانے کی نوبت نہ آئی تھی۔

گل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئی.....

تاج کے ساتھ آنے والی لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاج کے رویے سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا.....

”یہ جنگلی چیز کہاں سے لائے ہو سرکار.....“ اس نے تاج سے کہا۔

تاج مشتعل پہلے ہی تھا اس بات سے بھڑک گیا۔ گل پروشے کے ایک لات رسید کی۔ وہ قالین پر گری۔ تاج نے اس کے اٹھنے سے پہلے ہی دوسری لات جمائی اور پھر وہ اسے لاتوں سے ٹھنڈوں سے مارتا ہی چلا گیا۔ گل پروشے قالین پر ادھر سے ادھر لڑھکتی رہی.....

دوسری لڑکی مسکرا کر ہنس ہنس کر تاج سے کہنے لگی ”بس کرو سرکار بہت ہو گیا.....“

اس نے زبردستی تاج کو بازو سے پکڑ کے صوفے پر بٹھایا۔ تاج کے منہ سے غصے سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت کوئی بھی اسلحہ نما چیز ہوتی تو وہ گل کو قتل کر دیتا۔ وہ خونخوار نظروں سے گل کو دیکھتے ہوئے بولا ”کم بخت نے زندگی حرام کر دی ہے۔“

”یہ کون ہے.....“ لڑکی ادائے دلربا سے بولی۔

”ہے اک چڑیل۔“ تاج نے بیزاری سے تنفر سے کہا۔ لڑکی اس کے کندھے پر بازو ٹکائے ہوئے ادائے دلبری سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرائی۔

گل اب تک ششدر تھی۔ لاتوں اور ٹھڈوں کی بوچھاڑ اس کے وجود کو ہلا گئی تھی۔ لیکن اس کا جیسے ذہن ہی ماؤف ہو چکا تھا۔ محسوس کرنے کی قوت ہی کسی نے سلب کر لی تھی۔ وہ قالین پر پڑی ٹکر ٹکر تاج کو تنکے جا رہی تھی۔

لیکن

اس کے اندر ایسی خاموشی نہیں تھی۔

زلزلے آندھیاں طوفان تخریبی عناصر ہیں۔ جب یہ بپا ہوں تو سب کچھ تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔ گل کے جذبات دنیا میں یہ تخریبی عناصر پوری قوت پوری طاقت اور پوری شدت سے بپا ہو رہے تھے۔

اک بازاری عورت کے سامنے شوہر کے ہاتھوں اتنی ذلت اٹھانے والی گل کے اندر نفرتوں اور محبتوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ بڑی تیزی سے محبتیں مغلوب ہو کر نفرتوں کے پیکر میں ڈھل رہی تھیں۔

”دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ سردار نے غصے سے کہا۔

”اچا۔“ گل اک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

”آئندہ کبھی ایسی حرکت کی تو جان سے مار ڈالوں گا۔“

”ٹیک ہے۔“

اس کے لہجے پر تاج کے پہلو میں بیٹھی لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”یہ ہے کون

سرکار.....“

”ام اس کی بیوی ہے۔“ تاج سے پہلے ہی گل پروشے نے سنگین لہجے میں کہا۔

اب لڑکی ششدر سی رہ گئی۔ اس پر گھبراہٹ کا دورہ پڑا۔ جلدی سے کھسک کر پرے ہو گئی۔

”بکو اس بند کرو۔“ تاج غصے سے پھر دھاڑا.....

”انکار کرتا ہے۔ کیا ام تمہاری بیوی نہیں ہے۔“ گل نے زوردار لہجے میں پوچھا۔

”بیوی۔“ وہ تمسخر سے پھنکارا۔

”ہاں۔“

”چلی جاؤ یہاں سے ورنہ اس طرح مرمت کروں گا کہ ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی.....“

”نہیں نہیں سرکار۔“ لڑکی گھبرا کر بولی۔

”تم نہیں جانتیں..... لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں سدھرتے۔“ تاج بولا.....

”ام یہ بے عزتی بھولے گائیں.....“ گل پھر بولی۔

”جا جا..... نہ بھول.....“ وہ بولا۔

”تاج.....“

”جاتی ہو یا اٹھوں پھر.....“

”نہیں نہیں۔“ لڑکی نے تاج کو بازو سے پکڑ لیا..... پھر گل پروشے سے بولی ”تم

ہی چلی جاؤ..... دیکھتی نہیں سرکار کتنے غصے میں ہیں۔“

”کتے کا بچہ..... تم چپ رہ..... ام میاں بیوی جو دل چاہے بولے گا۔“ گل

بھوکی شیرنی کی طرح غرائی۔

تاج بازو چھڑا کر کھڑا ہوا..... انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

چینا ”نکل جا کمرے سے..... میرے غصے کو مت آزما..... زیادہ تنگ کیا تو گھر سے اسی

وقت باہر نکال دوں گا تو مجھے جانتی نہیں..... میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔“

”کیا کرے گا۔“ گل دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر تنگی۔

”تیری بوٹی بوٹی اڑا دوں گا..... تجھے اغوا کروا دوں گا..... بیچ دوں گا..... بتا کیا

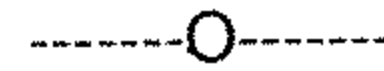
کر لے گی میرا.....“

”ام گل پروشے ہے..... گل پروشے..... گل پروشے نے سینے پر ہاتھ مارا۔  
 ”پھاڑوں کی بیٹی پتھروں کا پالا ہوا ہے۔ کچ کر کے دیکھو ذرا.....“  
 ”ہوں..... تیری یہ مجال..... گل ہی دیکھ تجھے باندھ کر تیرے پچھلوں کے پاس  
 واپس نہ بھجوا دیا تو.....“

گل کو ایک دم چکر سا آ گیا..... آنکھوں کے سامنے سائے لہرا گئے..... سارا  
 غصہ ہرن ہو گیا۔  
 ”تیرا خان بابا تجھے بار بار بیچے گا..... گل ہی تجھے واپس چھوڑ آؤں گا.....“ تاج  
 نے کہا۔

گل اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ ”ام کو اور مت بھیجو سردار۔ ام اور رہے گا“  
 جیسا تم کہے گا کرے گا..... ام کو مت بھیجو..... ام نہیں جائے گا۔“  
 نخوت سے تاج نے گل کو ٹھڈا مارا..... ”اب آئی سیدھی راہ پر..... دھونس یوں جماتی  
 ہے..... جیسے نوا بزاوی ہے..... دو ٹکے کی چھو کری اور سکھیروں کے آڑے آئے۔ ہونہہ.....“  
 گل آہستہ آہستہ اٹھی۔ من میں ہلچل مٹی تھی۔ لیکن صرف اک نگاہ تاج پر ڈالی۔  
 یہ نگاہ کیا تھی؟

تاج جیسے آدمی کا دل کانپ گیا۔  
 لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے لڑکی کو جھٹکے سے گود میں گرا لیا۔  
 گل پروشے منہ پھیر کر چلی گئی۔



”تیرا دل کیا کہتا ہے راجو۔“  
 ”پتہ نہیں۔“  
 ”پھر بھی۔“  
 ”کیا بتاؤں نجو..... اپنی غریبی کا خیال آتا ہے تو دل مذاق اڑاتا ہے..... نالی کی  
 اینٹ چوبارے نہیں لگ سکتی.....“  
 ”ہوں۔“

”اور جب اپنے پیار کا سوچتا ہوں تو دنیا کی کوئی رکاوٹ راہ میں بھائی نہیں  
 دیتی..... آسمان گر پڑے زمین پھٹ جائے کچھ ہو جائے..... میرا پیارا تناسپا اور کھرا ہے  
 کہ اسے ناکامی ہو ہی نہیں سکتی۔“

”تو تو درمیان میں لٹک رہا ہے۔“  
 ”اور کیا۔ بھافضل جب تک کوئی جواب نہ دے گا یہی حالت رہے گی۔“  
 ”اپنی اماں کو پھر بھیجنا میرے ویر کے پاس۔“  
 ”وہ تو بے چاری پہلے ہی ڈرتے ڈرتے گئی تھی۔“  
 ”ماسی رابو کے پاس گئی تھی نا..... میرے ویر سے اس نے خود تو بات نہیں کی.....“  
 ”بات تو ایک ہی ہوئی۔ رشتہ تو لے کر گئی تھی.....“  
 ”ہوں۔“

”ماسی رابو نے بھافضل سے بات تو کی ہوگی.....“  
 ”ہاں..... ضرور کی ہوگی۔“

”تو بھی تو گھر میں رہتی ہے۔ کیا خیال ہے تیرا۔ میرا مان رہ سکے گا۔“

”اوں ہوں۔“

”کیا؟“

”مجھے تو ذرا سی بھی امید نہیں.....“

”کس بات کی۔“

”کہ میرا ویر تیرا رشتہ مان لے گا۔“

”نہو۔“

”بھئی سچی بات کہتی ہوں۔“

”نہو..... تمہیں اس بات کا یقین ہے۔“

”ہاں.....“

”تو..... تو تجھے.....“

”کیا۔“

”تو تو بڑی خوش باش نظر آ رہی ہے۔“

”تو کیا کروں۔“

”تجھے..... کوئی فکر نہیں.....“

”فکر۔“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”بھافضل نے یہ رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو.....“

”تو کیا..... تو جانتا ہے۔ مجھے اپنے ویر سے جتنا پیار ہے میں اس کی مرضی کے

سامنے آواز اٹھا سکتی ہوں بھلا.....“

”نہو.....“

”سوچنے کی بات ہے راجو.....“

”نہو..... تجھے صرف..... اپنے ویر ہی سے پیار تو نہیں۔ مجھ سے.....“

”تجھ سے بھی اتنا پیار ہے کہ.....“

”کہ کیا.....“

”کہ تیرے بغیر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی.....“

”پھر..... پھر تو نے کیا سوچا ہے۔“

”سوچا تو بہت کچھ ہے۔“

”مجھے بھی بتانا.....“

”ابھی ضرورت نہیں۔“

”کیوں ضرورت نہیں.....“

”اچھا سن..... کیا سوچا ہے میں نے۔“

”سن۔“

”اگر ویر نے ہمارا جوڑ باندھنے سے انکار کر دیا نا..... تو.....“

”تو.....“

”تو میں اپنی ریشمی چڑی لے آؤں گی..... اسے پھاڑ کر رسہ سا بٹ لیں گے۔

پھر اسی بوہڑ کی کسی شاخ سے ریشمی رسے کا پھندا بنا کر دونوں ساتھ ساتھ لٹک جائیں گے۔“

”نہو.....“

”کیوں..... ایسا نہیں کر سکتے۔“

”تو کیسی باتیں کرتی ہے.....“

”جو سوچی ہیں.....“

”حرام موت مرنے کا کیوں سوچتی ہے۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔“

”تو پھر یوں کریں گے..... پنڈ سے دونوں بھاگ جائیں گے.....“

”نہو۔“

اس دفعہ راجو اتنے زور سے چیخا کہ نہو ڈر گئی، لیکن دوسرے لمحے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

پھر ہنستی چلی گئی..... راجو اسے دیکھتا رہا..... جب اس کی ہنسی بالکل بے قابو ہو گئی..... تو اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”پاگل تو نہیں ہو گئی۔“

”ہو گئی ہوں..... ہو گئی ہوں راجو ہو گئی ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ زیادہ ہنسنے سے آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔

راجو بے چارہ کچھ بھی تو سمجھ نہ پایا..... اس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ خوبصورت فسوں ساز سیاہ آنکھوں میں اداسی اور کرب کی کیفیت تھی..... وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹے جا رہا تھا۔  
نحو نے اپنے آپ پر بمشکل قابو پایا۔ اپنے کندھے پر رکھے راجو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ”تو کیوں نہیں ہنستا میرے ساتھ۔“

”نحو مجھے ایسی بھول بھلیوں میں ڈال دیا ہے تو نے کہ میں تو رو بھی نہیں سکتا.....“  
”پگلیا.....“

نحو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے کندھے آزاد کراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولی ”ہمارے ازل کے میل جول ہیں راجو..... ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا..... یہ میرا ایمان ہے.....“  
”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں..... میرے ویرنے..... میرے ویرنے.....“  
”کیا نحو کیا؟“

نحو اک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر اپنی حسین آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر بڑے جادوئی انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ”ویرنے تیرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے راجو.....“  
راجو گنگ سا رہ گیا..... نحو نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے اس کے ہاتھ اٹھائے اور سر جھکا کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

”نحو.....“ فرط مسرت سے وہ چیخ اٹھا..... ”کیا سچ ہے یہ.....“  
نحو نے آہستہ آہستہ اپنا سر اثبات میں ہلایا.....

”نحو..... میری نحو.....“ بے اختیار ہو کر راجو نے نحو کو بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا..... وہ دیوانگی کے عالم میں اسے اپنی چوڑی چھاتی سے بھینچ کر چلایا ”جھوٹ تو نہیں کہہ رہی نا.....“

”نہیں.....“ وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔

”رہا..... تیرا شکر کیسے ادا کروں۔“ بے اختیارانہ راجو کے لبوں سے نکلا..... ”تو نے میرے سچے پیار کی لاج رکھ لی.....“

راجو کے جذبات کی شدت اور ان کی تمنا سے نحو اتنی متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔



بیگیاں نے لسی کا خالی گڈوا کھوہ پر جا کر دھویا۔ مکھن والا چینی کا پیالہ اور ساگ والا کٹورہ بھی قریب رکھا۔ کٹورے میں تھوڑا سا ساگ تھا۔ مکھن بھی چھٹانک بھر پیالے میں پڑا تھا۔ اس نے مکھن ساگ پر رکھا اور کھیت کی منڈیر پر بیٹھے بارہ تیرہ سالہ لڑکے کو آواز دی۔

”وے کالو۔۔۔۔۔“

”لے یہ ساگ اور مکھن۔“

”لاؤ بھین لاؤ۔“

کالو نے دونوں ہاتھوں سے پیالہ بنا کر ساگ مکھن لے لیا۔ وہ اس گاؤں کا یتیم لڑکا تھا۔ اب وہ کھیتوں پر جہاں کام ملتا کر لیتا اور روٹی کپڑا بھی انہی چودھریوں کے طفیل پورا ہو جاتا تھا۔

سورج ڈھل رہا تھا۔ سردی کی شام بڑی جلدی اتر آتی ہے۔ بیگیاں برتن خالی کر کے جلدی گھر جانا چاہ رہی تھی۔ آج اس کی بے بے اور چاچا گھر پہ نہیں تھے۔ وہ کسی دوسرے پنڈ دور پار کے رشتہ داروں کی شادی میں شریک ہونے گئے تھے۔ تینوں بھائیوں نے رات کھیتوں پر ہی رہنا تھا۔ ان دنوں گڑ بنانے کا زور تھا۔ وہ یہ کام اپنی نگرانی میں کرواتے تھے۔ ان کے تین تین بیٹے تھے۔ بیک وقت چلتے تھے اور منوں گڑ تیار ہو رہا تھا۔ فضلاں آج گھر پہ اکیلی تھی اس لیے بیگیاں شام اترنے سے پہلے ہی گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

بیگیاں نے پیالہ اور کٹورہ بھی مٹی سے مانجھ کر دھویا۔ کالو روکھا ساگ اور مکھن مزے لے لے کر کھا گیا۔ بیگیاں نے برتن دھو کر دسترخوان کھولا اور اس میں برتن باندھ دیئے۔

”کدھر جانا ہے بھین۔۔۔۔۔ گھر یا واڑے۔۔۔۔۔“ کالو نے پوچھا۔

”کیوں۔“

”برتن میں اٹھا کر چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں کالو۔۔۔۔۔ یہ میں لے جاؤں گی۔۔۔۔۔ تو ایسے کرواڑے چلا جا اور ہمارے

رمضان بابا سے کہہ دے دودھ دہی گھر چھوڑ جائے۔“

”اچھا جی۔“

کالو اٹھ کر پگنڈی پگنڈی واڑے کی طرف چل دیا۔ بیگیاں برتن سر پر رکھ کر گھر کی طرف ہوئی۔ کھیتوں کے کنارے کنارے چلتی گھر جا رہی تھی، راستے میں کئی عورتیں ملیں۔ گاؤں کے مرد بھی آتے جاتے نظر آئے۔ کھیتوں میں بھی اکا دکا لوگ تھے۔ سارا دن ہل چلانے کے بعد بیلوں کو کھول کر چارہ ڈال رہے تھے۔ کہیں کہیں الاؤ ابھی سے جل رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے ہارے کسان حقے تازہ کر کے آگ کے ارد گرد آ بیٹھے تھے۔

وہ اپنی راہ چل رہی تھی۔ سیدھا راستہ اس نے دانستہ چھوڑ کر بیلے والا رستہ پکڑ لیا۔ آج فضل نہر پار گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کے مالٹے کے باغ تھے۔ ان دنوں درخت نیلام کر رہا تھا۔ اس کا واپسی کا رستہ یہی تھا۔ بیگیاں کے دل میں بیا کی لگن تھی۔ شاید ٹکراؤ ہو ہی جائے۔ وہ ادھر آ گئی تھی۔ دودھ بھی اسی لیے لینے نہیں گئی تھی۔

لگن سچی ہو تو منزلیں خود بخود قدموں میں آ جاتی ہیں۔ فضل کی گھوڑی کے سموں کی مخصوص نچ نچ بیگیاں پہچان گئی۔ خوشی سے چہرے پر گلابی رنگ دوڑ گیا۔ اس نے قدموں کی رفتار سست کر دی۔

تھوڑی دیر بعد فضل اس کے سامنے تھا۔ اس نے لگائیں کھینچ کر گھوڑی کو روکا۔ اور پھر کود کر نیچے اتر آیا۔ بیگیاں کو یوں اچانک دیکھ لینے کی خوشی سے وہ بہک سا گیا۔

باگ پکڑے پکڑے وہ بیگیاں کے قریب آ گیا۔ سر تا پا اس پر پیار بھری نگاہ ڈالی اور شوخی سے بولا ”تو بیگیاں ہی ہے نا۔۔۔۔۔“

”بیگیاں نہیں تو اور کون ہوں۔۔۔۔۔“

”میں سمجھا اس ویرانے میں کوئی چڑیل پھر رہی ہے۔“ وہ چھیڑنے لگا۔

”اچھا جی۔۔۔۔۔ بیگیاں نے مصنوعی غصے کا مظاہرہ کیا اور وہ واپس ہونے کو پلٹی۔۔۔۔۔“

فضل نے اس کا راستہ روک لیا ”اوتے ہوئے اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا.....“  
 ”چل ہٹ۔“

”بس بس..... سوہنیو۔ آؤ تھوڑی دیر باتیں ہی کر لیں.....“  
 ”میں نہیں کرتی۔“

”تو نہ کر میں کروں گا۔“

”اپنے آپ سے کرے گا۔“

”نہیں۔ اک کالی کلوٹی سے۔“

”دیکھ فضل۔“

”ہاں۔“

”مجھے کالی کلوٹی نہ کہا کر۔“

”ہے ہی تو کیوں نہ کہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ جا پھر اپنے لیے کوئی گوری چٹی کڑی ڈھونڈ لے۔“

”صلاح تو اچھی دی ہے تو نے۔“

وہ ہنس پڑا اور بیگیاں تھوڑا تھوڑا روٹھ گئی۔ فضل نے گھوڑی کی باگ چھوڑ دی اور بیگیاں کو منانے لگا..... بیگیاں ناز واداد کھانے لگی۔

دونوں بے حد خوش تھے اور جب بیگیاں مان گئی اور دونوں اک ٹوٹی پھوٹی مٹی کی

منڈیر پر بیٹھ گئے تو فضل بولا ”آج ادھر سے کیوں گھر جا رہی تھی.....“

”کیا ہوا گھر ہی جانا تھا۔ ادھر سے نہ گئی ادھر سے چلی گئی۔“

”یہ راستہ ویران ہے۔ آئندہ ادھر سے نہ جایا کرتا۔“

”میں تو تیرے لیے ادھر آئی تھی فضلے۔ مجھے پتہ تھا تو باغوں سے اسی راستے

واپس آتا ہے.....“

”اچھا۔ اب سمجھا..... پر بیگیاں پھر ادھر سے ایسے وقت میں نہ آنا کبھی۔“

”کیوں۔ میں کوئی چھوٹی بچی ہوں جو ڈر جاؤں گی..... اپنا ہی پنڈ ہے..... ڈرنا

کس بات سے۔“

”کبھی کبھی بڑوں کی بات بلا چون و چرا مان بھی لیا کرتے ہیں۔“

”اچھا بابا اچھا..... اب ادھر سے کبھی نہ جایا کروں گی.....“

”شباباش۔“

دونوں باتیں کرنے لگے۔ فضل نے بیگیاں کو بتایا کہ مالٹوں کے باغوں نے اس

دفعہ بہت منافع دیا ہے۔ بولی بہت اچھی لگی ہے۔ بیگیاں خوش ہو گئی..... جلدی سے بولی ”نحو

کے بیاہ کے لیے اب تو تیرے پاس بہت پیسہ ہو گیا ہے نا۔“

”صرف نحو کے بیاہ کے لیے۔“

”اور کس کے لیے۔“

”تیرے لیے نہیں.....“

”میری تو بعد کی بات ہے۔“

”ہوں..... بیگیاں۔“

”ہاں۔“

”ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھو۔“

”تجھے برا تو نہیں لگتا۔“

”کس بات کا۔“

”میں جو کہتا ہوں پہلے نحو کی شادی کروں گا پھر اپنی۔“

”اس میں برا ماننے والی بات ہے کوئی؟“

”تو بتانا.....“

”کبھی کبھی لگتا ہے۔“ وہ چند لمحے رک کر بولی۔

”کیوں؟“

”میرا دل کرتا ہے میں اور نحو کچھ دیر ساتھ ساتھ تو رہیں۔ نحو تیری بہن ہی نہیں

فضلے میری بھی بہن ہے سکھی ہے..... تیری طرح مجھے بھی وہ بہت پیاری ہے۔“

”اوجیو بیگیاں۔“



فضل اس کی بات سے بہت خوش نظر آنے لگا تھا۔

”کب کرے گانجو کی شادی۔“

”کیوں۔ بہت جلدی ہے تجھے اپنی۔“

”ہٹ وے۔ سیدھی بات ہی نہیں کرتا۔ مجھے کیوں جلدی ہوگی.....“

”نحو کے بعد جو تیری باری آئے گی۔“

”پھر وہی۔ میں خفا ہو جاؤں گی فضلے۔“

”نہ نہ..... نہ..... ایسا ظلم نہ کرنا.....“

فضل نے اپنے مضبوط ہاتھ سے بیگیاں کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”وہ تیری مامی اک شہر میں رہتی ہے۔ سنا ہے اس نے بھی اپنے بیٹے کے لیے

پوچھا ہے۔“

”تجھے کس نے بتایا۔“

”بے بے کو مامی راجو نے بتایا تھا.....“

”ہوں۔“

”پھر کیا خیال ہے۔ کہاں کرے گا۔“

”راجو ہے اپنے پنڈ کا ایک گھرو..... بڑا مخنتی بڑا ایماندار اور سارے پنڈ میں اس

جیسا سوہنا بھی کوئی نہیں.....“

”تجھ سے بھی سوہنا ہے۔“ بیگیاں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر وہ شرما بھی

گئی۔ فضل کے چوڑے چکلے سینے میں دل لوٹ پوٹ گیا اس ادا پر.....

کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ راجو کے متعلق بیگیاں کچھ کچھ جانتی

تھی..... خود پیار کرتی تھی اس لیے پیار کرنے والوں کے جذباتوں سے آشنا تھی۔ اسے خوشی

ہوئی کہ فضل نے راجو کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ پنڈ کے دوسرے چودھریوں کی طرح اس

نے اس بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

فضل ابھی آدھ فرلانگ ہی گیا تھا کہ اسے بیگیاں کے چاچے کو پیغام دینا یاد آ گیا۔ بہت ضروری بات تھی..... فضل نے گھوڑی کی باگیں کھینچ لیں..... اور اسی راستے پر واپس لوٹا..... جس پر سے ابھی بیگیاں کے ساتھ مل کر آیا تھا۔

بیگیاں اپنے راستے پر چلی جا رہی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گاؤں کی پہلی گلی تھی جہاں اس نے مڑ جانا تھا۔

لیکن

گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا ٹکراؤ تاج سے ہو گیا۔ حسب عادت اس نے بیگیاں کو دیکھتے ہی آواز اکسا ”کدھر دوڑے جا رہے ہو سوہنیو..... ہماری طرف بھی اک نگاہ ڈال لو.....“

بیگیاں نے اس کی آواز ان سنی کرتے ہوئے نگاہ سیدھے راستے پر رکھی اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ یہ جگہ بالکل سنسان تھی۔ گھنے اور جھکے ہوئے درختوں میں گہری شام الجھ گئی تھی۔ اچھا خاصا ملگجاسا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ درختوں میں پیور بسیرالے چکے تھے۔ ڈوبتے دل کی سی خاموشی چھائی تھی۔

موقع غنیمت جان کر تاج کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ لپک کر آیا اور بیگیاں کا راستہ روک لیا۔

اب بیگیاں کو رکنا ہی پڑا..... ڈرنے والی تو وہ نہیں تھی۔ پھر بھی نہیں چاہتی تھی کہ ایسی ویسی کوئی بات ہو..... لوگ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ وہ اب صرف نمبردار بشیر کی بیٹی ہی نہیں ملک فضل کی منگ بھی تھی..... دو گھرانوں کی عزت کا مسئلہ تھا.....

تاج پکا ڈھیٹ تھا۔ جب سے بیگیاں کو دیکھا تھا اسے حاصل کرنے کی لگن

”تجھے تیری موت بلا رہی ہے تا ہے.....“

”ہر بار یہی کہتی ہے تو.....“

”ہر بار رحم آ جاتا ہے تیری جوانی پر..... آگ سے کھیل رہا ہے تو تا ہے۔ یہ

آگ صرف تجھے ہی نہیں تیرے پورے خاندان کو بھسم کر ڈالے گی۔“

تاج نے اک قہقہہ لگایا..... اور بولا ”سکھیرے آگ سے کھیل کر ہی جوان

ہوتے ہیں..... تو کیا ڈراتی ہے مجھے.....“

”تیرا مطلب کیا ہے آخر.....“

”تجھے حاصل کرنا۔“

”اور تو جانتا بھی ہے کہ میں تیرے وڈے دشمنوں کی بہو بننے والی ہوں۔“

”دیکھ تا ہے باز آ جا۔ بڑا خون خرابہ ہو جائے گا..... پرانی دشمنیاں پھر سے نئی

ہو جائیں گی۔“

”اسی میں تو مزہ ہے.....“

”بس ٹھیک ہے..... تیری اجل تیرے سر پر منڈلا رہی ہے۔ ملکوں کے ساتھ

اب تیرا مقابلہ چٹھوں سے بھی ہوگا۔“

”اوہ چٹھے تو میرے سوہرے بنیں گے۔ جو ایوں سے کوئی دشمنی لیتا ہے.....“

تاج کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی پر بیگیاں کا خون کھول گیا..... ”تجھ سے اب فضل

ہی سمجھے گا.....“ وہ چیخی۔

”ہا ہا ہا..... ہا“ تا ہے نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا ”وہ بزدل ملک..... جو اپنے

باپ کے خون کا بدلہ بھی نہ لے سکا..... ہا ہا..... ہا.....“

”تا ہے.....“ وہ زور سے چیخی۔

تاج ہنسا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک لہرائی، خون میں ابال اٹھنے لگا۔

وہ بے تکلفی سے آگے بڑھا..... اور بیگیاں کی کلائی پکڑ کر بولا ”لے میں نے تیری بانہہ پکڑ

لی ہے۔ کہہ اپنے فضلے سے ہمت ہے تو چھڑا لے..... اب تو فضلے کی منگ نہیں رہی میری

پسند ہے.....“

تھی..... وہ تو بڑے فخر سے اپنے دوستوں سے کہتا تھا ”میں جس لڑکی کو حاصل کرنے کا

تہیہ کر لوں..... وہ مجھ سے بچ نہیں سکتی..... پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں آ کر

گرتی ہے.....“

بیگیاں کے معاملے میں اسے یہ خوش فہمی تو ضرور تھی، لیکن اس سے جو خطرناک

نتائج نکل سکتے تھے وہ ان سے بھی بے خبر نہ تھا..... ملکوں سے خاندانی دشمنی تھی جسے سکھیروں

نے نہیں ملک فضل نے دبا دیا تھا۔ وہ صلح جو اور آشتی پسند تھا۔ اس لیے پنڈ کی روایتوں کے

خلاف اس نے اپنے باپ کا خون بھی سکھیروں کو بخش دیا تھا۔ صدیوں پرانی دشمنی میں کئی

جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ کئی سہاگ اجڑے تھے..... مقدمہ بازی میں زمینیں مٹی کے مول

کی تھیں.....

یہ بات نہیں کہ فضل بزدل تھا اور وہ خون خرابے سے ڈرتا تھا، وہ بہت بہادر

تھا..... لیکن عقل مند انسان تھا..... وہ دشمنی کا بیج اکھاڑ دینا چاہتا تھا۔

تاج کے بڑے بھائی بھی آئے دن خون خرابے اور تو تو میں میں سے تنگ آئے

ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی تعاون کیا تھا۔ یوں بول چال تو بے شک نہ ہوتی تھی، لیکن ایک

دوسرے سے خار بازی بھی نہ رہی تھی..... دونوں گھرانے اپنے اپنے دائرے میں ٹھیک

ٹھاک چل رہے تھے۔

لیکن

تاج اگلی پچھلی ساری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیگیاں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا

تھا..... سانولی سلونی کسے ہوئے بدن اور کھڑے قد والی بیگیاں سے دل ہار بیٹھا تھا..... دل تو

وہ ہر نو جوان لڑکی سے ہار بیٹھتا تھا۔ لیکن بیگیاں شاید اس کے لیے چیلنج تھیں۔ اس لیے جانتے

بوجھتے ہوئے بھی اس سے ٹکر لے رہا تھا۔

بیگیاں رک گئی..... لیکن اس انداز سے رک کی کہ یوں لگا زمانے کا دل رک گیا ہے۔

خشگیں نظروں سے تاج کو دیکھا اور کڑک کر بولی ”بول۔ کیا کہتا ہے۔“

”اوہ واہ..... وا..... نصیبہ جاگ گیا اپنا.....“ تاج اس کے تیور دیکھتے ہوئے بھی

ڈھٹائی سے بولا.....

”کینے کتے..... پرے ہٹا اپنا ناپاک ہاتھ.....“ بیگیاں نے اپنی کلائی چھڑانے کو پورے بازو کو بل دیا، لیکن وہ تہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”دوسرے کی منگ اڑالینا آسان کام نہیں ہوتا پگنے دل گردے کا کام ہوتا ہے..... اور دل گردے والے جب کسی کی بانہہ پکڑ لیں تو چھوڑتے نہیں.....“

”ہوں۔“ بیگیاں پھنکاری اور پھر تیزی سے تاجے کے ہاتھ پر اپنے پورے دانت ساری قوت سے گاڑ دیئے۔

تاج بلبلا یا، لیکن بیگیاں کی کلائی نہیں چھوڑی۔

اور

اسی لمحے فضل اپنی سفید گھوڑی اڑاتا دھڑا گیا۔ وہ بیگیاں کو چاچے کے لیے پیغام دینے آیا تھا۔

لیکن یہاں جو کچھ دیکھا

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”بیگیاں۔“ اس نے گھوڑی سے چھلانگ لگاتے ہوئے زور سے آواز دی۔

تاجے کا ہاتھ بیگیاں کی کلائی سے ایک دم چھوٹ گیا۔ بیگیاں نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا۔

اور پھر دوڑ کر فضل سے لپٹ گئی۔

”فضلے..... یہ..... یہ ہمیشہ مجھے تنگ کرتا ہے۔ میں تجھے نہیں بتاتی تھی، لیکن یہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آج اس نے میری بانہہ پکڑ لی فضلے..... بانہہ“ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

فضل کی آنکھوں میں خون اتر آیا..... دھکے سے بیگیاں کو پرے ہٹاتے ہوئے اس نے تاج کو لاکارا..... ”اوئے سکھیر یا.....“

تاج کے اوسان تو اس گرجدار للکار سے ہی خطا ہو گئے، بھاگنے کی بھی نیت کی، لیکن اب مقابلہ آن ہی پڑا تھا..... اس لیے سینہ تان کر چلایا ”کر لے کیا کرنا ہے ملا.....“

”تیری یہ جرات کہ تو فضل کی منگ کی کلائی پکڑے۔“ فضل آہستہ آہستہ اس کی

طرف بڑھا۔ لیکن اس کے قدموں کی دھمک سے زمین کا دل ہل رہا تھا..... وہ تاج کو مسلسل گھور رہا تھا۔

”ہاں..... پکڑی ہے اس کی بانہہ..... اب یہ تیری نہیں میری ہے.....“ تاج سینہ تان کر چلایا۔

”اوئے اپنی پلید زبان منہ کے اندر کر لے۔ گدی سے کھینچ لوں گا..... پھر نام لیا اس کا تو۔“

”نام ہی نہیں اس کو بھی لوں گا۔ اس کا ڈولہ میری حویلی میں آئے گا..... سن لے تو بھی۔“

”ہوں.....“ فضل بھرا ہوا شیر تھا۔ چھلانگ لگا کرتا جے پر ٹوٹ پڑا..... تاج بھی جوش میں آیا ہوا تھا..... اس کی رگوں میں بھی سکھیروں کا خون تھا..... پنڈ کی فضاؤں میں پلا بڑھا تھا..... طاقت میں بھی فضل سے کم نہیں تھا..... اس لیے وہ بھی پل پڑا.....

دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

فضل کی پگ سر سے اتر کر دور جا گری جسے دوڑ کر بیگیاں نے اٹھا کر سینے سے لگالیا..... وہ ایک طرف کھڑی ہو کر دونوں کو دیکھنے لگی۔

فضل کے خون میں بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ غیرت تلملا رہی تھی۔ باپ کا خون ناحق آنکھوں میں اتر رہا تھا..... وہ تاجے کی ہڈی پسلی ایک کر رہا تھا۔ تاج بھلا اس سے مقابلہ کیسے کر پاتا۔ یوں بھی شراب پی پی کر قوت دم توڑ گئی تھی۔ عورتوں کے ناز وادا اٹھانے والا چند مکوں اور گھونسوں کی تاب بھی نہ لاسکا۔

مار مار کے فضل نے اس کا بھر کس نکال دیا..... اس کے منہ اور آنکھوں کے قریب بھی دو ایک مکے تاج کے لگے، لیکن تاج کے تو چہرے دانتوں اور ٹانگوں سے خون رسنے لگا۔

وہ بے دم ہو کر زمین پر لوٹنے لگا تو فضل نے لاتوں سے اس کو ادھ موا کر دیا..... بڑی بڑی گالیاں دیتے ہوئے فضل نے اپنے کپڑے جھاڑے اور بولا ”اب کبھی

آنکھ اٹھا کر اس پنڈ کی طرف دیکھا بھی تو حشر کر دوں گا.....“

تاج موقع غنیمت جان کراٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے درختوں کے پیچھے چلا گیا.....  
فضل چاہتا تو اس کا تعاقب کر کے اسے اور بھی مزہ چکھا دیتا..... لیکن اس نے اسے جانے دیا، اتنا ہی کافی تھا۔

جاتے جاتے زخمی اور نڈھال تاج نے فضل کو دھمکی دی ”یاد رکھنا..... بدلہ لوں گا..... دیکھوں گا بیگاں کا ڈولہ کون لے جاتا ہے.....“

”اوئے مر جا بے غیر تا.....“ فضل نے اس کی طرف تھوک دیا۔ پھر وہ بیگاں کی طرف آیا..... اور غصے سے بولا..... ”تو نے آج تک مجھے بتایا کیوں نہیں تھا.....“

بیگاں ڈر کر بولی ”تیرے غصے سے ڈرتی تھی.....“

”آج اس کی یہ جرات ہو گئی کہ تیری بانہہ پکڑ لی۔“

”فضلے تاجا بڑا کمینہ ہے۔“

”سمجھ لوں گا..... چل تو گھر..... میں چھوڑ آتا ہوں تجھے.....“

”چل.....“ بیگاں نے پگ اسے واپس پکڑاتے ہوئے کہا۔ فضل نے پگ سر پر

رکھ کر شملہ اونچا کر لیا، وہ بیگاں کو چھوڑنے لگی کے سرے تک گیا ”اب چلی جائے گی نا۔“

”ہاں۔“

وہ جانے لگی ”رب را کھا۔“

”رب را کھا۔“ فضل نے کہا۔

لیکن اس کے قدم اٹھاتے ہی بولا..... ”بات سن۔“

”ہاں۔“

”اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔“

بیگاں نے آنکھیں پھیلا کر فضل کو دیکھا۔ کچھ پوچھنے کو تھی کہ وہ بولا ”میں خود ہی

سمیٹ لوں گا سب کچھ..... تو کسی سے نہ کہنا.....“

”اچھا.....“ وہ بولی۔

”سمجھ گئی نا۔“ فضل نے سختی سے کہا۔

”ہاں۔“ وہ ڈر گئی۔

”جا اب۔“ فضل نے کہا ”میں یہیں کھڑا ہوں۔“

”اب چلی جاؤں گی..... تو جا۔ کہیں وہ راستے میں.....“

”اب دس پندرہ دن تو وہ اٹھنے سے رہا..... خیر..... جا تو۔“

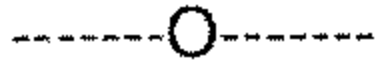
”رب را کھا۔“

”رب را کھا.....“

فضل وہیں کھڑا رہا..... بیگاں گلی کی چکی نالیوں سے ابلتے سلیٹی رنگ کے ملغوبے

سے اپنے پاؤں بچاتی چلی گئی۔ رستے میں اس نے دو تین بار پلٹ کر فضل کو دیکھا۔

جب وہ گلی کی نکر مڑ گئی تو فضل اپنی گھوڑی کی طرف واپس آ گیا۔



”چودھری جی! آپ گھوڑے سے گر کیسے گئے۔“

”گھوڑا اڑی کر رہا تھا علمے۔ بس اب زیادہ باتیں نہ کر..... نکور کے لیے گرم پانی بوتل میں بھر لا.....“

”اچھا چودھری جی۔“ علما پلنگ سے پرے ہٹتے ہوئے بولا۔ تاج کو کافی چوٹیں آئی تھیں..... چہرہ سو جا ہوا تھا۔ آنکھوں پر نیل پڑے تھے۔ جڑے میں زخم تھا..... پسلیاں بے طرح دکھ رہی تھیں.....

وہ گاؤں کی حویلی جانے کی بجائے فضلے سے مارکھا کر سیدھا شہر ہی آ گیا تھا۔ ڈاکٹر کھنہ کو بلا بھیجا تھا..... سانس لینے میں کچھ دقت محسوس ہوتی تھی..... یوں لگتا تھا اک پسلی پھپھڑے کے اندر ٹوٹ کر جا گھسی ہے۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ پسلی ٹوٹی نہیں تھی دب کھا گئی تھی۔ اس نے دوائیاں دی تھیں۔ مالش کے لیے بھی اور کھانے کے لیے بھی..... سوزش زدہ جگہوں پر نکور کرنے کے لیے کہا تھا۔

گل پروشے بھی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ جب سے وہ آیا تھا اس کے پاس بیٹھی تھی..... گوان دنوں تاج کے لیے وہ گھر کے کونے کھدرے میں پڑی بیکار سی شے تھی لیکن جس ہمدردی سے وہ اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی وہ دل ہی دل میں متاثر بھی ہو رہا تھا۔

گھر میں کسی عورت کا ہونا بے حد ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی موجودگی سے بڑا سہارا ملتا تھا۔ تاج نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اب گل پروشے کو واپس سوات بھیج دینے کی دھمکی نہیں دے گا۔

علما گرم پانی کی بوتل لینے گیا۔ گل پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ کر تاج کے پاؤں دبانے لگی۔

وہ بغور اس کی ٹانگوں پر پڑے نیل کے نشان دیکھ رہی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔“ تاج نے پوچھا۔

”تمارا ٹانگ بھی نیلا ہو گیا ہے۔“

”ہاں۔ سخت تکلیف ہے۔“

”تم گھوڑا کی سواری نہیں جانتا تو بیٹھا کیوں تھا؟“

”چپ رہو۔“

”اچا سردار۔ تمہارا طبیعت خراب ہے ام نہیں بولے گا۔“

وہ آہستہ آہستہ اس کے پاؤں دبانے لگی۔

علما پانی کی بوتل لے آیا۔

”ادھر رکھ۔ میری پسلیوں کے پیچھے۔“ وہ کروٹ کے بل ہو کر بولا۔

”لا..... اور..... دے علمے۔“ گل پروشے نے اٹھ کر بوتل اس سے لے لی اور تاج کی پشت پر پلنگ کے اوپر بیٹھتے ہوئے بوتل اس کی پسلیوں کے ساتھ لگا دی۔

”ایک کپ چائے بنا لاؤ..... میں گولیاں کھا لوں۔“ تاج نے علمے سے کہا۔

”اچھا چودھری جی.....“ وہ بولا۔ پھر قدرے رک کر بولا۔

”میرا تو خیال تھا۔ دودھ میں پھٹکری ڈال کر پی لیتے آپ..... جی شاید اندر بھی زخم آ گئے ہوں۔ دودھ پھٹکری تو پھٹ میل دیتا ہے چودھری جی۔“

”بک بک نہ کر۔“ وہ جھلایا ہوا تھا۔

”اچھا جی۔“

علما چلا گیا۔ گل پروشے اس کے کندھے آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی..... تاج بے حد جھنجھلایا ہوا تھا..... اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔

گل پروشے اور علمے کو تو اس نے کہا تھا کہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا ہے۔ لیکن فضل نے جو اسے تو مکر رکھ دیا تھا وہ دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا رہا تھا.....

تاج کمینہ دشمن تھا۔ اس کے دل میں کینہ تھا۔ ایک ہی مقابلہ میں اس نے جان لیا تھا کہ فضل سے دودھ ہاتھ نہیں کر سکتا..... وہ تو جیسے فولاد کا بنا ہوا تھا..... اک اک ضرب ایسی

پڑی تھی کہ کچھ مر نکل گیا تھا۔ ایسے آدمی سے اکیلے نیٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

ہاں

اس کو نیچا دکھانے اور زک دینے کے لیے اس کا دماغ تیزی سے منصوبے بنا رہا تھا۔

اس مار کٹائی کے بعد تو بیگیاں اس کے لیے چیلنج بن گئی تھیں۔ غصے اور اندھے انتقامی جذبے نے اس کے سینے میں ہلچل مچا دی تھی۔

وہ بیگیاں کو ہر قیمت پر حاصل کرے گا۔

بیگیاں کا ڈولہ ملکوں کی حویلی کی بجائے سکھروں کی حویلی میں آئے گا۔

ایسا ہوگا۔

ضرور ہوگا۔

دل کی باتیں زبان پر بھی آ گئیں۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔

”کیا بولتا ہے تاج.....“ گل پروشے کچھ نہ سمجھ سکی۔

”اوچپ رہو.....“ تاج گرجا..... ”خبردار جو ایک بات بھی کی۔“

”بوت غصہ میں ہے سردار..... گھوڑے پر غصہ ہے.....“ گل پروشے نے ہلکی سی

چوٹ کی۔

تاج غرایا اور پلٹ کر تھپڑ گل پروشے کے چہرے پر مارنے کو ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ

درد سے بے حال ہو گیا.....

ہائے وائے سے اس نے کمرہ سر پر اٹھالیا.....

گل پروشے کے اندر کی عورت اس کی تکلیف پر کھلکھلا اٹھی..... انتقام کسی رنگ

میں بھی لیا جاسکتا ہے نا.....

علما چائے کی پیالی لے آیا۔ چودھری کی تکلیف دیکھ کر پریشان ہو گیا.....

تاج نے بمشکل سر ہانے پڑی میز پر سے دوائیاں اٹھائیں اور چائے پرچ میں

ڈال کر ٹھنڈی کر کے اس کے ساتھ نکل لیں۔

گل پروشے یلنگ کی برنی پٹی برہنہ رہی۔

تاج چت لیٹ گیا..... وہ سانس آسانی سے نہیں لے سکتا تھا، پسلی میں کافی تکلیف تھی.....

گل نے اب کچھ بھی نہ کہا۔ چپ چاپ اسے تگے گئی۔ اس کی نظریں تاج کے گال پر تھیں جہاں پانچوں انگلیوں کے سرخ سرخ نشان تھے۔ اسے پہلے بھی شبہ تھا، لیکن اب تو شبہ یقین میں بدل گیا کہ تاج کہیں سے پٹائی کروا کے آیا ہے۔

علما سر جھکا کر کھڑا تھا۔

کئی لمحے گزر گئے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ دوائی میں شاید خواب آور گولیاں بھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تاج کی آنکھیں بند ہو گئیں..... اور وہ نسبتاً سکون سے سانس لینے لگا۔

گل پروشے نے لحاف اس کے سینے تک کر دیا اور خود آتش دان کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھی۔ قریب ہی قالین پر علما بھی اپنے کھیس کی بکل مار کر بیٹھ گیا۔ رات کافی گزر چکی تھی، لیکن نیند دونوں ہی کو نہ آ رہی تھی۔

”علمے۔“ گل پروشے ہاتھ سینکتے ہوئے بولی لکڑیاں جل کر کوئلہ بن گئی تھیں۔ یہ کوئلے دہک رہے تھے۔ ان کا عکس گل پروشے کے خوبصورت چہرے پر پڑ رہا تھا.....

”جی بی بی۔“ علما بولا.....

”سردار گھوڑے سے گرا ہے؟“

”یہی کہہ رہے تھے۔“

”تمارا کیا خیال ہے؟“

”جی.....؟“

”یہ کدر سے پٹائی کرا کے آیا ہے۔“

علما صرف گل پروشے کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا..... اس نوعمر

لڑکی کے قیافے پر وہ حیران رہ گیا۔

”اس کا سارا بدن پر نیل کا نشان ہے۔“

”ہاں۔ میں نے کپڑے تبدیل کروائے تھے تو دیکھا تھا۔“

”گر بیان بھی اور قیص بھی پھٹا ہے۔“

”ہاں جی۔“

”یہ گھوڑے نے تو نہیں پھاڑا.....“

”ہاں بی بی.....“

”اس کا چہرہ دیکھو انگلی کے صاف نشان ہیں۔“

”دیکھا تھا میں نے.....“

”اس کا کس سے دشمنی ہے۔“

”گاؤں میں تو ملکوں کے ساتھ ہی ہے۔“ مختصر لفظوں میں علمے نے خاندانی

دشمنی کا ذکر کیا۔

”یہ آج گاؤں گیا تھا نا۔“

”ہاں۔“

”اُد رہی جھگڑا کیا۔“

”پتہ نہیں بی بی.....“

”سردار اچا آدمی نہیں ہے۔“

علمے نے پھر چونک کر گل پروشے کو دیکھا۔

”اس نے ام سے شادی کیا امارا خاوند ہے..... لیکن یہ ام کو پوچھتا نہیں ہے.....“

اور عورت کے پیچھے دوڑتا ہے.....“

علما چپ رہا۔

گل بولی ”گاؤں میں اب یہ بوت جاتا ہے۔ اُد بھی کوئی لڑکی کا چکر ہے.....“

امارا دل کہتا ہے.....“

علما سر جھکا کر بیٹھا رہا..... گل پروشے کی باتوں سے اس کی سوچوں کی کئی گرہیں

کھل گئی تھیں..... بیگاں کے متعلق چودھری نے اسے ایک دفعہ بتایا بھی تھی..... علمے کو پتہ تھا

بیگاں ملک فضل کی منگ ہے۔ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں چودھری کو معاملے کی سنگینی کا

احساس دلانے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن اس کا مالک اک جابر آقا تھا۔ اس بے چارے کی

کہاں سنتا تھا۔ وہ سوچوں کی کڑی سے کڑی ملانے لگا۔

اور

جب سوچیں اس نقطے پر رکھیں کہ آج تاج کا سامنا بیگاں کے بھائیوں یا ملک  
فضل سے ہو گیا ہوگا تو وہ سر تا پا کانپ گیا۔ اگر یہ بات ہے تو

تو

اس کے جوہلناک نتائج ہوں گے اس کا تصور بھی لرزادینے کو کافی تھا۔

-----○-----

دروازے پر آ کر بکونے گھوڑی کی باگ فضل کے ہاتھ سے پکڑ لی۔ فضل صحن میں آ گیا۔

اندھیرا کافی پھیل چکا تھا۔ دالان میں لائین جل رہی تھی۔ رسوئی گھر میں بھی تیل کا دیا جل رہا تھا۔ فضل دالان میں ماسی راہو کے پاس جانے کی بجائے سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں بھی مٹی کے تیل کا پیتل کا لیپ روشن تھا۔ بتی نیچے کی ہوئی تھی۔ اس لیے ہلکی ہلکی روشنی پھیلی تھی۔

وہ آ کر پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پگ اتار کر سر ہانے رکھ دی اور کندھوں پر ڈالی شال بھی اتاری۔

فضل کا کمرہ صاف ستھرا تھا۔ دیواریں لپی پتی تھیں۔ فیروزہ اور پیلے رنگ کی دیواروں پر گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ چھت کے بالوں اور شہتیروں پر بھی کھدائی سے تیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پٹ بھی رنگین لکڑی اور پیتل کے پھولوں سے آراستہ تھے۔ سامنے دیوار کیساتھ چھتی (مینٹل پیس) تھی جس پر بڑا سا شیشہ لگا تھا۔ شیشے پر کروشیے کا رومال پڑا تھا۔ چھتی پر کاڑھا ہوا کپڑا تھا۔ پلنگ کی چادر اور چھتی کا کپڑا انجھونے دیر کے کمرے کے لیے اپنے ہاتھ سے کاڑھا تھا۔ ایک طرف دو رنگین پیڑھا نما کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ کھوٹیاں تھیں جن پر فضل کے کچھ

کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف لکڑی کے صندوق اوپر تلے رکھے تھے جن پر جھالروں والا سفید کپڑا پڑا تھا۔ دائیں ہاتھ کے کونے میں دیوار کے اندر الماری تھی اس میں موٹا سا قفل تھا۔ اس الماری میں روپیہ زیور اور زمین کے اہم کاغذات رکھے رہتے تھے۔

فضل نے اک سرسری سی نگاہ کمرے پر ڈالی اور پھر جوتا اتار کر پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ سر تلے رکھ کر وہ خالی خالی نظروں سے چھت کی کڑیاں دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گیا۔

آج کا واقعہ ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ بے شک وہ صلح کل اور آشتی پسند انسان تھا لیکن آج تاہے نے اس کی غیرت اور حمیت کو لٹکا رہا تھا۔ وہ مشتعل ہو گیا تھا اور اس نے سکھیرے کوروئی کی طرف دھنک دیا تھا۔

لیکن

یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس سے مسئلہ اور سنگین ہو گیا تھا۔

اور

یہی

سنگینی اسے پریشان کیے ہوئے تھی۔ وہ ٹھیک طرح سوچ نہ پا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں آگ لگی تھی۔ دھوئیں اٹھ رہے تھے۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھال رہا تھا۔

اسے اب کیا کرنا چاہیے؟

صورت حال سے کیونکر پنپنا جائے؟

بات گاؤں کی پنچایت میں پیش کرنی چاہیے؟

یا

خاموشی اختیار کر لینی چاہیے؟

وہ اس وقت صرف سوچ رہا تھا۔ کبھی ایک بات، کبھی دوسری فیصلہ کرنے کو اس

وقت ہمت ہی نہ تھی۔

وہ سوچوں میں گم تھا کہ سامنے دالان سے ماسی راہو کی آواز آئی۔

”جیراں! جیراں!“



”جی ماسی۔“ جیراں شاید رسوئی گھر میں تھی۔

”کون آیا ہے ابھی۔“ ماسی نے پوچھا۔

”ملک جی آئے تھے۔“

”فضل۔“

”ہاں۔“

”بیٹھک میں چلا گیا؟“

”نہیں اپنے دالان میں گئے ہیں۔“

”خیر ہے۔ میری طرف کیوں نہیں آیا۔“

”آتا ہوں ماسی۔“ جیراں کی بجائے فضل نے جواب دیا۔ اس نے اپنے لہجے

میں بشارت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

وہ پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔ انگلیاں الجھا کر بال درست کیے۔ چادر جھاڑ کر لپیٹی اور جوتی پہن کر کمرے سے نکل آیا۔

”جیراں۔“ اس نے آواز دی۔

”جی ملک جی۔“

”نہو کہاں ہے۔“

”شادو کے گھر گئی ہیں سب۔“

”کیوں؟“

”اس کی بہن کا سوہریوں جوڑا آیا ہے۔“

”جیلاں جارو بھی۔“

”سب گئی ہیں۔“

”پکایا کیا ہے؟“

”مٹراں والے چاول اور آلو۔۔۔۔۔“

”نہو کھانا وہیں کھائے گی۔“

”توبہ کرو ملک جی۔ بھلا آپ کے بغیر وہ کھانا کھا سکتی ہے اور وہ بھی آپ کو بتائے بغیر۔“

”پگلی ہے۔“

”ویر کی دیوانی ہے۔“

فضل نے اک گہری سانس لی اور آہستہ آہستہ چلتا ماسی راہو کے پاس آ گیا۔

دائیں ہاتھ پڑی رنگین چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا ”کیا حال ہے ماسی۔“

”آج تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔“ ماسی نے اپنی چندھیائی نظروں سے

فضل کو دیکھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ ہاں ماسی۔۔۔۔۔ پیسے لایا تھا الماری میں رکھنے گیا تھا۔“ اس نے جلدی

سے بات بنائی۔

”ہو گیا سارے پھل کا نیلام۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ باقی کل ہوگا تقریباً ہو ہی گیا ہے۔“

”اچھے پیسے ملے۔“

فضل نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا دماغ اپنی سوچوں ہی میں الجھا ہوا تھا۔

ماسی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔۔۔۔۔

”کیا ماسی؟“ وہ چونک کر بولا۔

”سن نہیں رہا۔ کیا سوچ رہا ہے۔“

”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔“

”میں پوچھ رہی تھی اچھے پیسے ملے ہیں۔“

”کہاں سے؟“

”باؤلا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ پھل کے نیلام سے اور کہاں سے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماسی راہو اس کی پریشانی بھانپ لے۔۔۔۔۔

”کدھر چلے ہو۔“

”ذرا باہر۔۔۔۔۔ بیٹھک میں۔۔۔۔۔ لوگ آئے بیٹھے ہوں گے۔۔۔۔۔“

”گل تو سن۔“

”کیا؟“

”آج راجو کی پھپھی پھر آئی تھی..... جواب لینے۔“

”اور ماسی..... ابھی ٹھہر جا..... دے دیں گے جواب بھی۔“

”وہ الجھ کر بولا..... اور پھر دالان سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ باہر جانے ہی کو تھا

کہ نجو گرم چادر میں منہ سر لپیٹے آ گئی..... اس کے پیچھے جیلاں جا رو اور رقیہ بھی آ گئیں۔

”ویر جی آ گئے.....“ اس نے فضل کو دیکھ کر کہا۔

”تو کہاں تھی؟“

”شادو کے گھر۔“

”میں ذرا بیٹھک میں جا رہا ہوں۔“

”روٹی نہیں کھانی۔“

”کھالوں گا..... بھوک نہیں۔“

”بہت مالے کھا لیے تھے۔“

”شاید..... تو کھالینا روٹی۔ میں ذرا بیٹھک میں جا رہا ہوں۔“

”اوں ہوں تجھے پتہ بھی ہے ویر.....“

”حد ہو گئی..... اب مجھے بھوک ہی نہ ہو تو تو کھانا ہی نہیں کھائے گی۔“

”نہیں۔“

فضل چپ ہو گیا۔ پھر بولا ”چل جلدی لے آ کھانا..... میں بھی کھالوں گا پاگل

لڑکی ورنہ بھوکی رہ جائے گی۔“

نحو سوئی گھر کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سینی میں چاولوں کی دو پلٹیں اور

آلوؤں کا پیالہ رکھے اندر آ گئی۔ اچار کے آم اور مرچیں بھی ایک پیالے میں ڈال کر لے

آئی۔ جیلاں پانی کے گلاس بھر کر لے آئی۔

دونوں بہن بھائی آمنے سامنے رکھ کر کھانے لگے۔ نجو فضل اور ماسی راہو کو شادو کی

بہن کے سسرال سے آئے جوڑے کے متعلق بتاتے ہوئے نوالے لینے لگی۔

لیکن

وہ چونک گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ فضل کھانا بے دلی سے کھا رہا تھا۔ ایک نوالہ

منہ میں ڈالتا..... تو دوسرا اٹھانا ہی بھول جاتا.....

وہ چند لمحے غور سے اسے دیکھتی رہی۔

پھر بولی ”کیا بات ہے ویر۔“

”کچھ نہیں۔“

”کچھ پریشان لگ رہا تھا۔“

”ہٹ پگلی۔“

”نہ چھپا مجھ سے..... میرا دل کہہ رہا ہے..... تو پریشان ہے۔“

”بس تو تو نری جھلی ہے جھلی.....“

فضل نے ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا۔ گلاس اٹھایا۔ آدھا پانی پیا اور باقی آدھے

سے دروازے کے قریب آ کر صحن میں ہاتھ دھو لیا۔ گلاس جیلاں کو پکڑا کر وہ باہر چلا گیا۔

نحو کا دل اندر ہی اندر ڈوب گیا..... کوئی بات ضرور تھی..... ویر پریشان تھا..... وہ

اس سے کچھ چھپا رہا تھا.....

وہ سوچوں میں ڈوب گئی..... کھانا اس سے بھی نہ کھایا گیا۔

”پھر۔“

”پھر..... تو بتائیں کیا کروں۔“

”یقین رکھ۔“

”اچھا بھئی..... اب مایوسی کی باتیں نہیں کروں گا۔“

راجو خوش ہو گیا۔ نجو چادر کی بکلی مارے ٹوٹی پھوٹی سرخ مٹی کی دیوار پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ راجو اس کے قریب کھڑا تھا..... دونوں پیر صاحب کی درگاہ کے پچھواڑے ملے تھے سہ پہر کا وقت تھا دھوپ کی حدت ختم ہو چکی تھی۔ اب سائے کچھ لائے ہوئے تھے۔ کرنوں کا سنہری پن زردی میں بدل رہا تھا۔ آج صبح سے کچھ جھکڑ قسم کی ہوا چل رہی تھی۔ پیڑوں کے سوکھے پتے جھڑ رہے تھے..... مٹی کے ساتھ ساتھ سوکھے پتے بھی ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔

”بنسری سنے گی۔“ راجو نے نجو سے پوچھا۔

”اس وقت۔“

”ہاں۔“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”جی نہیں چاہ رہا۔“

”کیا ہوا جی کو۔“

”بس۔“

نجو نے اک گہری سانس لی اور پہلی بار راجو کو احساس ہوا کہ نجو کچھ اداس کچھ پریشان ہے۔ وہ جلدی سے بولا ”کیا بات ہے نجو..... اداس کیوں ہے۔“

نجو اپنی خوبصورت آنکھیں راجو کے چہرے پر جما کر بولی ”میں بڑی پریشان ہوں راجو۔“ کیوں۔“ راجو کا بنسری والا ہاتھ نیچے ہو گیا۔ نجو کے چہرے پر جھکتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا ”کیوں پریشان ہے۔“

نجو نے سر جھکا لیا اور گود میں رکھے ہاتھ مسلنے لگی۔ پھر ہاتھوں میں پڑے چاندی

”نجو۔“

”ہوں۔“

”کیا بات ہے۔“

”کچھ نہیں۔“

”کوئی گڑبڑ تو نہیں۔“

”کیسی؟“

”تیرے ویر نے ہمیں کوئی جواب نہیں دیا۔“

”ہوں۔“

”پچھی ماسی راجو کے پاس گئی تھی۔“

”مجھے پتہ ہے۔“

”اس نے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دیا۔“

”دے دیں گی۔“

”انکار تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں۔“

”یقین ہے تجھے۔“

”ہاں۔ ویر نے فیصلہ تیرے حق میں دے دیا ہے۔ تجھے بتا تو چکی ہوں۔“

”جب تک وہ میری ماں یا پچھی سے نہیں کہے گا میں بے یقینی سے ڈولتا رہوں گا۔“

”تجھے ایسا نہیں سمجھنا چاہیے راجو..... ملک فضل قول کا دھنی ہے سب جانتے ہیں۔“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“

کے چھن کنگن آگے پیچھے کرتے ہوئے بولی ”تجھے کیا بتاؤں۔“

”بتا تو سہی..... کیا بات ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں۔“

”تجھے تو بس اپنی پڑی ہے۔“

”پھر تجھے پریشانی کس بات کی..... تیرے ساتھ جچتی نہیں ہے پریشانی۔“

”ٹھیک ہے، لیکن میں بھی کیا کروں پتہ نہیں کیا بات ہے میرا ویر بڑا پریشان ہے۔“

”فضل؟“

”ہاں۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”پتہ نہیں۔“

”زمین کا تو کسی سے جھگڑا نہیں۔“

”پتہ نہیں..... ویسے میں نے پوچھا تھا اس سے۔“

”پھر کیا کہا۔“

”کہتا ہے کسی سے کوئی جھگڑا نہیں.....“

”پانی کے بٹارے کا؟“

”وہ بھی نہیں.....؟“

”مالٹوں کے نیلام میں کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہوئی۔“

”وہ کہتا ہے یہ بات بھی نہیں.....“

”ہوں۔“

راجو کی شرتی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ریگننے لگیں۔ چند لمحوں بعد بولا

”اس کا سکھیروں سے تو کوئی جھگڑا نہیں۔“

”نہیں۔ سکھیروں سے تو اس نے معاملہ ہی ختم کر دیا ہوا ہے۔ بات تو کبھی نہیں

ہوئی کوئی۔ نہ ہی سننے میں آیا ہے..... بلکہ پچھلے مہینے تو رفیق سکھیرا ہماری بیٹھک میں آیا تھا۔“

”واقعی۔“

”ہاں۔“

”فضل سے ملا۔“

”لو ہماری بیٹھک میں کیا دیواروں سے ملنے آیا تھا۔ وہی تو بڑا بھائی ہے۔ سب

کا کرتا دھرتا..... ویر سے اس نے چھٹی ڈالی تھی.....“

”پھر..... پھر کیوں پریشان ہے فضل؟“

”یہی تو بتاتا نہیں۔“

”ایسے ہی تیرا وہم ہوگا.....“

”نہیں یہ وہم نہیں راجو وہ بے حد پریشان ہے۔“

”کب سے۔“

”دو تین دن سے۔“

”میرا تو خیال ہے تیرا وہم ہی ہے تو ذرا اپنے بھائی کی زیادہ ہی دیوانی ہے.....

ہو سکتا ہے اسے کوئی جسمانی تکلیف ہو تجھے نہ بتانا چاہتا ہوں۔“

”یہ بات ہے تو بتانے میں کیا ہرج ہے۔“

”تو اس کی تکلیف برداشت جو نہیں کر سکتی۔ یاد ہے سراجے کی شادی پر جو اسے

پیٹ میں درد کی شکایت ہوئی تھی.....“

”ہاں.....“

”تیری حالت جو تھی، لگتا تھا پیر فضل کے نہیں تیرے ہو رہی ہے۔“

”ہاں راجو۔ واقعی میرے پیٹ میں تین دن مروڑ پڑتے رہے تھے.....“

”اسی لیے تجھے بتاتا نہ ہوگا، ہو سکتا ہے پیٹ ہی میں کچھ تکلیف ہو۔“

”نہ بتا کر مجھے زیادہ پریشان کر رہا ہے..... لیکن نہیں..... راجو۔ پیٹ کی تکلیف

نہیں اسے بات کچھ اور ہی ہے۔“

”اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”یہی تو پتہ نہیں چل رہا..... نہ ہی کچھ بتاتا ہے۔ بہت پوچھتی ہوں تو ہنس کر کہتا

ہے تو تو نری جھلی ہے پاگل ہے۔“

”زیادہ نہ پوچھا کر شاید خود ہی بتا دے۔“

”اوں ہوں..... بات ضرور ہے کوئی..... اور ہے بھی ایسی جسے مجھ سے چھپانا چاہتا ہے۔“

”یہ کیسے جان گئی تو.....“

”بھئی میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ کوئی بات بھی تو مجھ سے نہیں چھپاتا۔ اپنی اور بیگاں کی باتیں بھی بتا دیتا ہے.....“

”اوہ ٹھیک۔“

”کیا۔“

”بیگاں سے روٹھا ہوگا۔“

”یہ بھی میں پوچھ چکی۔“

”کیا کہتا ہے۔“

”وہی تو تو جھلی ہے، نری پاگل ہے۔“

”تو بیگاں سے ملی ہے۔“

”نہیں۔“

”اسی سے مل کر پوچھ لیتیں۔“

”کل جاؤں گی۔ میں نے بھی یہی سوچا ہے کہ اس سے مل کر پوچھوں۔“

”لڑکیاں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں، ضرور سب کچھ بتا دے گی۔“

”اور اگر اسے ویر فضل کی پریشانی کا علم ہی نہ ہوا تو.....“

”تو وہ پوچھ لے گی فضل سے، شاید اسے بتا ہی دے، تیرے بتانے کی بات ہی نہ ہو۔“

”ہوں۔“

راجو ہنسی ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے سوچنے لگا۔ نجو کے چہرے پر اداسی اور پریشانی پھیلی تھی..... سوگوار اور اداس نجو بے حد اچھی لگ رہی تھی۔

”دیر کی پریشانی کا راز جب تک میں جان نہ لوں گی مجھے چین نہ آئے گا راجو۔“

”ہوں۔“

”آج رات میری آنکھ کھل گئی۔ صحن میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ میں نے ذرا سی کھڑکی

کھول کر دیکھا تو دیر صحن میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا.....“

”واقعی وہ بہت پریشان ہے۔“

”ہاں۔“

”اللہ جانے کیا بات ہے۔“

”یقین کر راجو! میں مرغوں کی بانگوں تک باری میں اسے دیکھتی رہی، وہ صحن میں برابر ٹہلتا رہا، کبھی رک کر سوچنے لگتا، کبھی ہاتھ ملتا، کبھی آسمان کی طرف دیکھتا۔“

”یہ بات ہے..... پھر تو ضرور اسے کوئی بہت بڑی فکر لگی ہے.....“

”تو بتا، میں پریشان نہ ہوؤں۔“

راجو نے اثبات میں سر ہلایا اور نجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔



”لے۔“ نجو کے سامنے چنگیری رکھتے ہوئے جیلاں بولی۔  
 ”میں نہیں کھاؤں گی..... تم لوگ کھا لو.....“ نجو نے چنگیری واپس کرتے ہوئے کہا۔

”نجو..... تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ جیلاں بولی۔  
 ”بڑی چپ چپ رہتی ہو۔“ ہمسایہ لڑکی نے گنا چوستے ہوئے کہا۔  
 ”پتہ نہیں کیا بات ہے۔ بھافضل بھی آج کل چپ چپ رہتا ہے۔“ رقیہ بولی  
 ”ہنتا ہے نہ بولتا ہے۔“  
 ”جیلاں بھی کچھ کہنے کو تھی کہ نیچے صحن سے فضل کی آواز آئی۔ ”ویر آ گیا ہے۔“  
 نجو چھلانگ لگا کر چارپائی سے اتری اور صحن میں جھانکا۔  
 فضل ماسی راہو کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نجو نے دیکھا وہ اب بھی پریشان تھا۔  
 ”ماسی۔“ فضل نے چند لمحوں چپ رہنے کے بعد کہا۔  
 ”کیا ہے بیٹے۔“  
 ”ماسی.....“

”ہاں ہاں کیا کہنا ہے..... جھجک کیوں رہا ہے۔“  
 ”میری شادی کا بندوبست کرو ماسی۔“  
 ”ہیں.....؟ کیا کہا“ ماسی نے پہلے حیرت پھر مسرت بھری آواز میں پوچھا۔  
 فضل بدستور سنجیدہ تھا۔ ”میں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔“  
 ”اور جو تو ہر وقت کہتا تھا پہلے نجو کی کروں گا۔“ ماسی نے اپنی چندھیائی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔  
 ”بس۔ اب اپنی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی بھی کر دوں گا۔“  
 ”ہائے پتر اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہوگی۔ نجو کو پتہ چلا تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی.....“

فضل اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے سوچوں میں ڈوبے ڈوبے بولا ”اسی چاند کی چودھویں کو..... دن مقرر کر لے جا کر پھپھی سکی نہ کے ہاں۔ کہتی ہے تو میں خود چلا جاؤں گا وہاں۔“

ماسی راہو کے سر میں سرسوں کا تیل ڈال کر جیلاں نے گھنٹہ بھر مالش کی پھر اس کی چارپائی صحن کے مشرقی کونے میں دیوار کے ساتھ لگا دی اور اوپر چوکور خانوں والا کھیس ڈال دیا۔ اس کے کپڑے بدلائے اور کنگھی پٹی کر کے اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔

”بس ماسی۔“

”بس جیتی رہو۔“

”اب میں جاؤں چھت پر۔“

”جا.....“

”کچھ کھائے پئے گی۔“

”ابھی نہیں۔“

”مالٹا چھیل دوں۔“

”نہ نہ..... بڑی ٹھنڈ ہے۔ بس حقہ دے دو مجھے.....“

جیلاں نے حقہ ماسی کے قریب رکھ کر اسے پکڑا دیا اور خود رنگدار چنگیری میں گڑ اور اخروٹ ملے ملکی کے دانے ڈال کر نجو کے لیے اوپر لے گئی۔

نجو بے مندر کے کوٹھے پر چارپائی ڈالے بیٹھی تھی۔ قریب ہی رقیہ اور جارودری بچھائے بیٹھی تھیں۔ محلے کی تین چار لڑکیاں اور بھی آ بیٹھی تھیں۔ رقیہ چرخہ کا تنے کی مشق کر رہی تھی۔ باقی لڑکیاں گنے چوس رہی تھیں۔ ان کے پھینکے ہوئے چھلکوں پر کھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

گاؤں کے ایک منزلہ مکانوں کی چھتوں پر دھوپ سنہری جال بچھائے تھی۔ عورتیں اور بچے کام کاج سے فارغ ہو کر چھتوں پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔

”اسی چاند کی چودھویں کو.....“ حیرت سے ماسی بولی۔

”ہاں ماسی جیسے میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو.....“

”لیکن پترا.....“

”ماسی..... لیکن ویکن کچھ نہیں، پھپھی تو پہلے ہی تیار ہے، ہم نے کیا کرنا ہے.....“

بس جا کر کڑی لے آئی ہے۔“

”ماسی کچھ نہ بولی عالم اضطراب میں حقے کے پے در پے کش لینے لگی۔

اتنے میں نجو سیرھیاں اتر کر صحن میں آ گئی۔ بھائی کی طرف دیکھا اور پھر چپکے

سے ماسی راہو کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”نجو بیٹی۔“

”ہاں ماسی۔“

”یہ فضل کیا کہہ رہا ہے۔“

نجو کے کچھ پوچھنے سے پہلے فضل بولا ”کہہ رہا ہوں کہ میری شادی کر دو۔“

”سچ۔“ نجو فرط حیرت سے چیخی۔

”ہاں۔“ فضل نے بمشکل مسکرا کر کہا۔

”ہائے میں صدقے جاواں.....“ نجو دونوں ہاتھ الجھا کر آنکھیں بند کر کے بولی۔

”لیکن یہ بھی تو سن پگی۔“ ماسی راہو اس کو خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے دیکھ

کر بولی۔

”کیا؟..... کیا ماسی؟“

ماسی کی جگہ پھر فضل نے کہا ”اسی چاند کی چودھویں کو شادی کرنے کا کہہ رہا ہوں۔“

”اسی چاند کی چودھویں کو؟“ اب نجو نے حیرانگی سے کہا اور

ماسی راہو انگلیوں پر دن گنتے ہوئے بولی ”پورے نو دن بعد آج چن کی

پانچویں ہے۔“

”اتنی جلد ویرا.....“ نجو نے فضل کی طرف غور سے دیکھا۔ ”ہاں.....“ اس نے

جواب دیا۔

”تیار کیسے ہوگی؟“ نجو اب بھی حیران تھی۔

”ملک فضل کی شادی اور ہفتہ کی تیاری کے لیے کیسی باتیں کرتا ہے پترا.....“

ماسی نے آواز میں سارا پیار سمیٹ لیا۔

”تیار سے زیادہ شادی ضروری ہے۔“ فضل اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا

”کل جا کر پھپھی سے دن مقرر کر لو..... بس.....“ وہ اٹھ کر اپنے دالان میں چلا گیا۔ نجو چپ

بیٹھی سوچتی رہی اور ماسی راہو اتنے کم وقت میں پنڈ کی یادگار شادی کے نہ ہو سکنے کے امکان

پر بڑبڑ کرتے حقہ گڑ گڑانے لگی۔

چند لمحے بوجھل سے گزر گئے۔ چھت پر لڑکیاں اودھم مچا رہی تھیں۔ مٹی کے دانوں

گنے اور مالٹوں کی لوٹ کھسوٹ ہو رہی تھی..... بے فکری سے سب قہقہے لگاتے ہوئے

چھپا چھپی کر رہی تھیں۔

نجو اپنے آپ سے الجھنے لگی۔ اب اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ فضل کی پریشانی

کا تعلق کسی نہ کسی طور بیگاں سے ہے۔

لیکن

ایسی کیا بات ہے؟

”اس نے تو بیگاں کی کوئی بات کبھی اس سے نہ چھپائی۔ جب بھی اسے مل کر آتا

بتا دیا کرتا تھا.....“

”کیا وہ اس سے روٹھ گئی ہے؟“

”لیکن۔“

روٹھنے کا علاج شادی تو نہیں۔

پھر؟

وہ الجھتی ہوئی چارپائی سے اٹھی اور فضل کے دالان میں گئی۔ فضل سر تلے دونوں

ہاتھ تکیے پر رکھے جو توں سمیت بستر پر لیٹا چھت پر نظریں جمائے سوچوں میں گم تھا۔

ایسا گم کہ

اسے نجو کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔

نحو کتنی دیر چپ چاپ پلنگ کے پائنتی والے ٹیک کو پکڑے کھڑی رہی۔  
اچانک فضل نے اسے دیکھا..... تو

اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بالوں کو سلجھاتے ہوئے خفت سے مسکرایا اور بولا ”کیوں چلا کو  
ماسی۔ کیا لینے آئی ہے؟“

نحو اس کی بات پر ہنسی نہ مسکرائی..... بت کی طرح خاموش اسے تنگ لگی۔  
”آ جانا“ کیا بڑ بڑمنہ تک رہی ہے ادھر آ بیٹھ میرے پاس۔“  
فضل پلنگ کی پٹی پر ایک طرف ہو کر بولا.....

نحو ساکت سی کھڑی رہی۔

فضل نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑی اور گھما کر اپنے قریب بٹھا کر بولا  
”کیوں جی..... میری شادی کی خوشی نہیں تجھے..... میں..... میں سمجھتا تھا یہ بات سن کر تو  
خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ دوڑ کر سہیلیوں کو بلالائے گی اور ڈھولک پیٹ پیٹ کر گلا پھاڑ  
پھاڑ کر گانے گائے گی۔“

”ویر جی۔“ اس کی ساری باتیں جیسے نحو نے سنی ہی نہیں۔ سنجیدگی سے بولی۔

”ہوں۔“ فضل نے اسے ہنسانے کے لیے اس کا سراپنے ہاتھ سے پکڑ کر ادھر

ادھر ہلایا۔

”ایک بات بتاؤ۔“

”کیا؟“

”بات کیا ہے؟“

”تو جھلی ہے بالکل۔“

”جو مرضی ہے کہہ لے لیکن میں پوچھ کر ہی رہوں گی.....“

”کیا پوچھے گی پگئے۔“ فضل پہلی بار سنجیدگی سے بولا۔

”کیا چھپا رہا ہے مجھ سے کیا پریشانی ہے تجھے..... اس پریشانی کا حل شادی

کیوں ہے؟“

وہ مسکرایا..... ”اتنی ذرا سی تو تو ہے اور باتیں لقمان حکیم سی کر رہی ہے۔“

”میری بات نہ ٹالو ویر جی۔“

”تجھے بتاؤں کیا..... بس تو میری شادی اس چاند کی چودھویں تک کر دے۔“

”اتنی جلدی کیوں۔“

”اک مصلحت۔“

”مجھے نہیں بتائے گا تو۔“

”بعض باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔“

”مجھے غیر سمجھتا ہے یا کم عقل۔“

”نہیں، نہیں، نحو رانی۔“

”تو پھر.....“

”بس..... اوہ رہا..... کیا بتاؤں تمہیں.....“ فضل شش و پنج میں پڑ گیا۔ نحو اس کا

منہ تکتی رہی۔ معاملے کی سنگینی کا اسے احساس تھا۔

”بات یہ ہے میری بھین۔“ کئی لمحوں کی کشمکش کے بعد فضل نے کہا۔ نحو کو مطمئن

کرنا ضروری تھا..... ورنہ وہ پاگل تو سوچ سوچ کر ہی مر جاتی۔

”ہاں۔“

”بات معمولی سی ہے لیکن آن کا معاملہ بن گیا ہے۔“

نحو ہمہ توجہ بن کر بھائی کا منہ تکتے لگی۔

”کیسے۔“ وہ بولی۔

”کسی سے کہے گی تو نہیں۔ لڑکیاں پیٹ کی بہت ہلکی ہوتی ہیں۔ کوئی راز راز نہیں

رہنے دیتیں۔“

”مجھ پر اعتبار کرو ویر جی۔“

”ہاں تو..... شادی میں جلدی سے جلدی کرنا چاہتا ہوں۔ بیگاں میری منگ

ہے..... اسے عزت آبرو سے گھر لے آؤں تو اچھی بات ہے.....“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ بیگاں ہماری عزت ہے اس کی طرف کوئی

آنکھ اٹھا کر دیکھ کیسے سکتا ہے۔“



”بس یہی تو بات ہے۔ کسی نے بری نگاہ سے اسے دیکھا ہے۔“ نجو کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ بھائی کا منہ ششدری تکے گئی..... پھر اس کے لبوں سے نکلا ”کس نے.....“

”ہے کوئی پلید.....“ فضل نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا.....

”کسی کی یہ مجال.....“ وہ رونے لگی۔

”بی بی“ فضل نے ملائمت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”بات بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں بیگاں کو گھر لے آؤں۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اس ذلیل کتے سے نپٹنے کی طاقت ہے مجھ میں.....“

نجو سر جھکا کر چند لمحے بیٹھی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی ”تجھے کیسے پتہ چلا دیر۔“

”کیا مطلب۔“

”یہی بات..... کہ بیگاں پر کسی نے بری نگاہ ڈالی ہے۔“

فضل جوش میں آ کر بولا ”کہتا کون۔ اس نے خود مجھے تڑی (دھمکی) دی ہے۔“

”تڑی۔“

”ہاں۔“

”ہوں۔“

”کہا ہے..... دیکھوں گا بیگاں کا ڈولا تم لے جاتے ہو یا میں.....“

”نجو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا اور بولی ”اس نے کہا..... اور تم

نے سن لیا“ ملک فضل.....

”ہونہہ.....“

”تیرا بھائی بزدل نہیں..... کھال ادھیر دی ہے اس کی۔ مہینہ بھر چار پائی سے نہ

اٹھ سکے گا.....“

نجو کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا..... ”عزتوں کے رکھوالے ایسے ہی ہوتے ہیں.....“

”اچھا اب تو تیاری شروع کر دے شادی کی۔ عزت و آبرو سے بیگاں کو پہلے گھر

لے آئیں..... میں نہیں چاہتا کہ کوئی گڑبڑ ہو اور بیگاں بدنام ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اچھا..... اب راز تو تجھے پتہ چل گیا..... اسے راز ہی رکھنا نجو بی بی.....“

”تو مجھے بالکل ہی سچی سمجھتا ہے۔“

”میں تجھے سب کچھ ہی سمجھتا ہوں۔ تو ماں ہے بہن ہے بیٹی ہے۔“ فضل نے

اس کا سراپنی چھاتی سے لگا کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔

نجو کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ محبتوں چاہتوں اور عقیدتوں کو سہارا لینا آسان تو نہیں ہوتا.....



کو بتادی تھی۔

نحو ماسی را بو اور رشتہ کے ایک تایا تائی کے ساتھ بیگاں کے ہاں تاریخ طے کرنے آئی تھی۔ بزرگ تو دالان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پچھلی کوٹھڑی میں جہاں بیگاں چار پائی پر لحاف اوڑھے بیٹھے تھے آگئی تھی۔ آج سردی بہت تھی آسمان ابر آلود

تھا۔ کہیں بارش ہوگئی تھی جو خنک ہوا چل رہی تھی..... نحو بھی اس کے پاس گرم لحاف میں گھس گئی تھی..... اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کام کی بات پوچھی تھی۔  
وہ مردود کا نام سننا چاہتی تھی جس نے اس کے گھرانے کی عزت اور آبرو پر بری نگاہ ڈالی تھی۔

”بتانا بیگاں۔“

”کیا؟“

”کس نے یہ حرکت کی تھی۔“

”فضل نے منع کیا تھا۔“

”منع؟“

”ہاں اس نے کہا تھا کسی کو نہ بتانا۔ میں نے تو اپنے چاہے بے اور بھائی کو بھی نہیں بتایا.....“

”اچھا کیا۔“

”پر میرا دل اسی دن سے بیٹھا جا رہا ہے نحو..... خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔“  
”تیرا بیاہ ہونے والا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔“ نحو نے اسے چھیڑا..... لیکن وہ خوفزدہ تھی.....

”وہ بڑا ذلیل آدمی ہے..... کہنے دشمن کا کیا پتہ کیا کر بیٹھے.....“

بیگاں ہر اسات تھی.....

نحو بستر میں اونچا ہوتے ہوئے بولی ”دشمن کا واسطہ ملکوں سے پڑا ہے ملک کسی سے ڈرتے نہیں.....“

”لیکن نحو.....“

”کیا۔“

”پرانی دشمنیاں۔“

”تو کیا تجھے..... نحو لحاف پرے ہٹا کر اٹھ بیٹھی..... غصے سے پھرتے ہوئے بولی۔

”تجھے کسی سکھیرے نے چھیڑا ہے۔“

”ہاں۔“

”کس نے۔“

”تا جے نے۔“

نجو کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

”دیکھو نجو۔“ بیگیاں جلدی سے بولی ”فضل سے نہ کہنا کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے“

وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ اس نے مجھے سختی سے منع کیا تھا.....“

”لیکن نجو تو اس کی بات جیسے سن ہی نہ رہی تھی۔ اسے پتہ نہیں کیا ہونے لگا تھا۔

بزدل تو وہ ہرگز نہ تھی۔ لیکن.....

پرانی نسل در نسل دشمنی کے خیال سے وہ کانپ گئی۔

فضل نے تو یہ باب ہی بند کر دیا تھا۔

لیکن

اس کمینے تا جے نے پھر وجہ نزاع پیدا کر دی تھی.....

وہ سوچوں میں گم ہو گئی..... تا جے کے متعلق کون نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسا آدمی

ہے..... اس کی بدمعاشی اور غنڈہ گردی کی داستانیں شہر سے اڑتی تھیں اور کئی گاؤں میں

بڑھ چڑھ کر پھیل جاتی تھیں۔

نجو کے ذہن میں خونی وارداتیں ابھرنے لگیں۔ ہر سال چھ ماہ دونوں خاندانوں

میں کوئی نہ کوئی قتل ہو جاتا تھا..... کبھی وہ لوگ ملکوں کا بندہ قتل کر دیتے تھے اور کبھی ملک

سکھروں کا کوئی فرد ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔

آخری قتل ملک رحمت علی کا ہوا تھا۔ بدلہ اب فضل نے لینا تھا لیکن اس نے یہ

روایت توڑ دی تھی۔ اس نے قتل و غارت کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ اس نے باپ کا خون

سکھروں کو معاف کر کے دوستی اور امن کی راہ ہموار کی تھی۔

لیکن

لیکن

اب تاج سکھیرا پھر فضل سے ٹکرا گیا تھا۔

نجو نے گھبرا کر بیگیاں کو دیکھا جس کا رنگ بجھا بجھا سا تھا اور جس کی آنکھوں میں حیرانی پھیل ہوئی تھی۔

”اس سکھیرے کی موت نے اسے فضل کی راہ میں لا کھڑا کیا ہے بیگیاں۔“ نجو

نے کئی لمحوں کے سکوت کے بعد کہا ”ہم نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ ان سے لینا ہے نا“

باری ان کی ہے۔ فضل نے صلح اور آشتی کی جو راہ اختیار کی تھی لگتا ہے سکھیروں کو اس نہیں

آئی.....“

”وہ بڑا کمینہ بندہ ہے نجو۔“ بیگیاں صرف اسی قدر کہہ سکی۔

”ہم پٹنا جانتے ہیں۔“ وہ سینہ تان کر بولی۔

”رب رحم کرے۔ میرا تو دل اسی سے ڈوب رہتا ہے۔“

”تو بزدل ہے..... حوصلہ رکھ..... تو فضل کی منگ ہے۔ اس جن کی چودھویں کو

اس کی بیوی بن جائے گی..... پھر تو دیکھے گی وہ کتنا بہادر..... کیسا جیالا اور عزت کا کتنا بڑا

رکھوالا ہے۔“ بیگیاں نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا..... نجو اس کی پشت آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

باہر دالان میں بیٹھے فضل اور بیگیاں کے بزرگ شادی کا دن اور لین دین کا مسئلہ

طے کر رہے تھے۔

بیگیاں کی بے بے چاہتی تھی تیاری کے لیے کم از کم ایک مہینہ تو مل جائے ”بھئی

آٹھ دنوں میں ہم لوگ کیا کچھ کریں گے..... فضل نے تو اتنی جلدی شادی کرنے کا حکم دے

بھیجا ہے جیسے یہ گڈی گڈے کا کھیل ہو۔“

”بس یہی سمجھو.....“ ماسی راہو بولی ”شادی اس جن کی چودھویں کو طے ہے۔

جہیز تو تم نے اتنے عرصے سے تیار کر رکھا ہے۔“

”پھر بھی..... ماسی جہیز کی سوئی سلائی ہی.....“ بیگیاں کی بے بے نے کہا۔

”کوئی بات نہیں اپنی بیٹی ہے۔ ساری عمر لینا ہی ہے اس نے۔“ تایا ظہور بولے۔

”چلو جی جو کچھ ہو سکے گا کر دینا“ کون سے غیر ہیں سوہرے۔ پھر جلدی میں یہی

کچھ ہوگا.....“ تائی حلیمہ نے کہا۔

”بیگیاں کی بے بے تو دھوم دھام کی قائل تھی۔ نمبردار بشیر کی بیٹی کی شادی اور

چرچے نہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ جہیز تو اس نے بے شک اک عرصے سے تیار کر رکھا تھا، لیکن پھر بھی تیاری کے لیے وقت چاہیے تھا.....

اب یہ لوگ مصر تھے۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

کپڑا لٹا تیار تھا۔ سو بستر بھی اس نے بنا کر پیٹیوں میں ڈال رکھا تھا۔ سوا سیر سونا بھی بیگاں کے حصے کا الگ پڑا تھا۔ بھوری کے لیے گوٹے والی چادر اور ماتھے کا سونے کا ٹکے بھی پچھلے ہفتے ہی بنوایا تھا۔ رنگین چار پائیاں ابھی منگوا رکھی تھیں، برتن بھانڈا بھی کافی تھا..... پوری پوری نہ سہی کچھ نہ کچھ تیاری ہو ہی سکتی تھی۔

اسے ماننا ہی پڑا..... تاریخ مقرر ہو گئی..... سب نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ فضلاں گرم گرم دودھ گلاسوں میں ڈال کر لے آئی۔ بیگاں کا بھائی تازہ تازہ جلیبیاں لے آیا۔ مبارک سلامت کے شور میں دودھ اور جلیبیاں سب نے مزے سے کھائیں۔

دن مقرر کر کے نجوسب کے ساتھ واپس گھر آ گئی۔ پنڈ میں سب کو خبر ہو گئی، نانی میراثی گھر گھر جا کر پیغام دے آئے۔

زور و شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں..... دن کام میں گزرتا اور سر شام گاؤں کی الہڑٹیاں جمع ہو جاتیں۔ گانے گائے جاتے۔

سوانگ بھرے جاتے..... نجوبھی ہر بات میں بھرپور حصہ لیتی۔ اس نے تو کیسری گوٹے والے کپڑے اسی دن سے پہن لیے تھے جس دن تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ وہ گاتی ناچتی، ہنستی مسکراتی۔

لیکن رات جب یہ سارے ہنگامے سو جاتے تو وہ کھلی آنکھوں سے چھپ کر گھورتے ہوئے سوچوں میں گم ہو جاتی۔ اک نامعلوم سادھڑ کا جی کو لگا رہتا تھا..... اک دوسرے سا پریشان کرتا رہتا تھا۔

علما کوٹھی کے بیرونی لان میں گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھا حقہ گڑ گڑا رہا تھا۔ مالی پھولوں کی کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ کچھ پنیریاں لایا تھا۔ وہ بھی کیاریاں ٹھیک کر کے لگا رہا تھا۔ علما اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کام کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔

تاج ابھی تک بستر میں تھا۔ پسلیاں دکھتی تھیں۔ زیادہ چلنے پھرنے سے ریڑھ کی ہڈی میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن پسلیوں اور ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف ابھی اسی طرح تھی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے رات کو درد بڑھ جاتا تھا۔ گل پروشے اور علما اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

علما ابھی ناشتہ کروا کے باہر آیا تھا، کئی دنوں سے وہ گاؤں جانا چاہ رہا تھا۔ لیکن مالک کی وجہ سے نہ جاسکتا تھا۔ اس وقت مالی بابا سے بھی وہ یہی باتیں کر رہا تھا۔

”چودھری صاحب کی وجہ سے پنڈ جا ہی نہیں سکا۔ خدا کرے وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں تو چکر لگا آؤں.....“

”چل پھر نہیں سکتے صاحب۔“ مالی نے پوچھا۔

”اٹھتے ہیں لیکن زیادہ چلیں تو تکلیف ہوتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے خاصی چوٹیں آئی ہیں۔“

”ہاں۔“

”اللہ رحم کرے۔“

”آمین.....“

”سردیوں میں چوٹ.....“

”السلام علیکم۔“ مالی کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیاری کی پرلی طرف ایک تنومند

دیہاتی نے زوردار سلام مارا..... تو علمے نے حقہ منہ سے ہٹاتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا.....

پھر خوشی سے اچھل پڑا..... ایک دم اٹھا کیاری پھلانگی اور آنے والے سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولا ”آ..... بیلیا..... کیسے آنا ہوا۔“

”شہر آیا تھا۔ تجھ سے ملنے کو جی چاہا دھری آ گیا۔“ مصافحہ کرتے ہوئے رحمونائی بولا..... ”آ بیٹھ.....“ وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر لان میں لے آیا..... دونوں نکھری دھوپ میں لان کے مخملی فرش پر آئے سامنے بیٹھ گئے..... علمے نے حقے کی نے اس طرف کرتے ہوئے پوچھا سنا سب خیر خیریت ہے نا۔“

”ہاں فضل ہے مولا کا..... تو چنگا شہری بن گیا۔ دل ہی نہیں کرتا پنڈ آنے کو.....“

”بس مجبوری ہے رحمور نہ اپنی دھرتی سے بچھڑنے کو کس کا دل کرتا ہے۔“

”چودھری صاحب خیر خیریت سے ہیں؟“

”ہاں..... ویسے تو خیر خیریت سے ہی ہیں کچھ طبیعت خراب ہے ان کی۔ اسی لیے تو میں گاؤں نہیں آیا.....“

”دونوں باتیں کرنے لگے۔ رحمو حقے کے دو تین کش لے کرنے علمے کی طرف پھیر دیتا اور علما کش لینے کے بعد رحمو کو حقہ پیش کرتا۔ علمے نے چائے پانی بھی پوچھا رحمونے ملائمت سے انکار کر دیا۔

دونوں گاؤں کی باتیں کرنے لگے..... ”علمے وہ چودھری اکبر تھانا.....“

”ہاں ہاں..... پٹلاں والی کا چودھری۔“

”ہاں وہی۔“

”کیا ہوا اسے۔“

”کل فوت ہو گیا۔“

”اوہو ہو..... کیا ہوا تھا اسے۔“

”پیٹ ہی میں درد اٹھا..... پتہ ہی نہ چل سکا اسے کیا ہوا..... بیچارہ..... اچھا

آدمی تھا عمر بھی تو کچھ زیادہ نہ تھی۔“

”بالکل جوان تھا ابھی۔“

”بڑا ہی افسوس ہوا۔ کل جنازہ اٹھا تو قیامت مچ گئی۔ کئی پنڈ جنازے میں

شریک ہوئے۔“

”ہاں بھئی۔ اچھا بندہ تھا۔ رشتہ داری دوستی میل ملاپ کون رہ سکتا ہے ایسی خبر سن کر.....“

رحمو قدرے آگے ہو کر کچھ راز داری کے انداز میں بولا ”بڑی بات تو پتہ ہے کیا ہوئی کل.....“

”کیا۔“ علمے نے سر کے اشارے سے پوچھا۔

”جنازے میں سارے سکھیرے اور ملک شریک ہوئے۔ چودھری رفیق اور شفیق تو ملک فضل کے سنگ ہی رہے سارا وقت۔“

”اچھا؟“

”ہاں پنڈ کے لوگ ان کو ساتھ ساتھ دیکھ کر واقعی خوش ہوئے شکر ہے پرانی دشمنی تو ختم ہوئی۔“

”علما سوچ میں ڈوب کر صرف ہوں کہہ سکا۔“

”اب ملک فضل کی شادی ہے.....“ رحمونے حقہ گڑ گڑاتے ہوئے پوچھا۔

”کب؟“ علما چونک کر بولا۔

”اس چن کی چودھویں کو بارات ہے۔ بارات دو دن کوٹلی رہے گی..... پھر تیسرے دن ولیمہ ہے۔“

”اچھا۔“

”بڑے ٹھاٹھ کا ویاہ ہوگا علمے وہ تیاریاں ہو رہی ہیں وہ تیاریاں ہو رہی ہیں کہ کیا بتاؤں؟“

”پنڈ کے مانے ہوئے چودھری ہیں دونوں طرف..... وہ شادیاں دھوم سے نہ کریں گے تو کیا ہم تم کریں گے بھئی.....“

”ہاں علمے..... وہاں تو ابھی سے دیگیں پکنا شروع ہو گئی ہیں۔“

حلوائی گھر بٹھالیا ہے۔ وہڑیاں (جوان بھینسیں) ذبح ہو رہی ہیں۔ لوگ صبح شام وہیں کھاتے پیتے ہیں جو چلا جائے پیٹ بھر کر کھانا کھا آتا ہے.....“

دل کی بات بھی ہوتی ہے رھو..... دوسروں کو کھلایا یونہی نہیں جاتا.....“ ملک اچھا بندہ ہے۔“

”ہوں۔“

”سوہرے بھی اچھے ملے ہیں..... وہاں بھی دھوم دھڑکا شروع ہے۔ سنا ہے داج تو جو ہوگا سو ہوگا دوسرے زمین بھی لڑکی کے دے رہے ہیں۔“

”واہ واہ..... موج ہوگئی ملک فضل کی۔“

”ساری واہی والی زمین ہے بڑی فصل دیتی ہے۔“

”ہاں ہاں.....“

”رھو آدھ گھنٹہ وہاں رہا اور کوٹلی پہلاں والی اور ہڑیا لے کی کئی خبریں علمے کو سنا گیا۔

علمے کے لیے سب سے اہم خبر ملک فضل کی شادی تھی۔ اسی دن علما جب چودھری

تاج کے پاؤں دبار ہاتھا، کوئی گاؤں کی بات ہوئی تو اس نے چودھری اکبر کے مرنے کی خبر تاج کو سنائی۔

”نہیں، نہیں۔“ تاج کو یقین نہیں آیا۔

”اللہ دی قسمیں چودھری جی رھونائی بتا گیا ہے۔“

”رھونائی۔“

”اپنا یار بلی ہے پہلاں والی کار بنے والا ہے۔ کبھی کبھی شہر آتا ہے تو ملے بغیر

نہیں جاتا۔“

”پہلاں والی۔“ تاج زیر لب بڑبڑایا۔ ”ملکوں کے پنڈ کا۔“ ”ہاں جی..... ملک

فضل کی شادی کا بھی بتا گیا ہے..... وہ.....“

اس کی پوری بات سنے بغیر تاج اچھل کر بیٹھتے ہوئے بولا ”کیا کہا؟ ملک فضل کی

شادی کا بھی بتا کر گیا ہے۔

”ہوں۔“ وہ خوفناک طریق سے پھنکارا..... ”شادی کر رہا ہے وہ.....“

”جی..... جی..... چودھری جی..... اس چاند کی چودھویں کو بارات ہے۔ رھو بتا

رہا تھا۔ بڑی رونقیں ہیں بڑی گہما گہما ہے۔“

”تاج نے مٹھیاں بند کر کے پلنگ کی پٹی پر زور زور سے ماریں۔ دانت بھیج لیے اس کی آنکھوں میں درندوں کی آنکھوں کی چمک لہرائی۔

”وہ سمجھتا ہے مجھے مات دے لے گا..... ہونہہ..... میں تاج ہوں تاج..... سکھیرا۔“

علما اس کی وحشیانہ حرکت اور بھڑکے ہوئے جذباتی جملوں کو سن کر کانپ گیا۔

”چودھری صاحب.....“

”علمے۔“

”جی۔“

”بیگاں کا ڈولا فضل کے گھر نہیں جائے گا۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے

تاج نے خونخوار انداز میں کہا۔

علما پوری آنکھیں کھول کر تاج کو دیکھنے لگا۔

تاج عالم اضطراب میں کبھی بستر پر لیٹ جاتا، کبھی مٹھیاں کس لیتا، کبھی خوفناک

سی پھنکار میں ”ہونہہ“ کہتا اور کبھی بڑبڑانے لگتا۔ اور

پھر

اسی شام اس نے اپنے دو تین ہم پیالہ ہم نوالہ دوستوں کو بلا بھیجا۔ رات گئے تک

یہ دوست بند کمرے میں بیٹھے راز داری سے باتیں کرتے رہے۔

فضل جب بڑی سڑک سے گاؤں جانے والی نسبتاً کم چوڑی سڑک پر آیا تو شام کے دھند لکے پھیل چکے تھے۔ آج اسے کئی ضروری کاموں کے لیے شہر جانا تھا۔ یوں تو اس کے کامے (نوکر) اور رشتے کے بھائی ماموں تائے چاچے سبھی کام کر رہے تھے۔ شادی کے سلسلے میں تو ساری ذمہ داری انہی لوگوں نے اٹھائی تھی۔ وہ تو صرف پیسہ دے دیتا تھا۔ باقی سب کچھ یہی لوگ کرتے تھے۔ کوئی شہر سے چیزیں لا رہا تھا۔ کوئی گاؤں میں چیزوں کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ کوئی دودھ اکٹھا کر رہا ہے۔ کوئی گھی کے ٹین لا رہا ہے۔ عورتیں اعلیٰ باسیتی کے چاول چھان پھنک رہی ہیں۔ حویلی کی لپیا پوتی کر رہی ہیں۔

مل جل کر سارے کام ہو رہے تھے۔ فضل کو آج شہر آڑھتیوں کے پاس جانا پڑا تھا۔ گڑ اور چاول کے ہزاروں روپے کا حساب کتاب تھا۔ پیسہ تو اس نے دو پہر ہی کو وصول کر لیا تھا۔ اس کے بعد بازار چلا گیا تھا۔ نجو کی کئی فرمائشیں تھیں۔ پیٹنٹ کی دو گرگابیاں لینی تھیں۔ ایک نجو کے لیے دوسری بیگیاں کے لیے۔ دودن پہلے نجو تو کی ماں کے ساتھ آئی تھی اور گرگابیاں پسند کر گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ زیور بھی بننے کو دے رکھا تھا۔ وہ بھی لینا تھا۔

یوں سارے کام پنپاتے سہ پہر اتر آئی..... اور گاؤں کی اس سڑک پر آتے آتے شام کے دھند لکے پھیل گئے۔

سڑک کا یہ حصہ ویرانے میں سے گزرتا تھا۔ دونوں طرف غیر آباد زمینیں تھیں جن پر جنگلی پودوں کی بھرمار تھی۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں اور درختوں کے کئی جھنڈا ایسے تھے جن کے تلے دن کو بھی اندھیرا ہی رہتا تھا..... اسی سڑک سے آگے چل کر چار گاؤں کے راستے نکلتے تھے..... اور یہ سڑک سیدھی جا کر کسی اضافی سڑک سے مل جاتی تھی۔

فضل کی سفید گھوڑی اپنی مخصوص رفتار سے چلی جا رہی تھی کہ اچانک کسی نے فضل کو لاکار.....

”او ملکے۔“

”اک جھٹکے سے فضل نے گھوڑی کے لگام کھینچ کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”کون ہے.....“ اوئے۔“ فضل کی جوابی آواز سنسان فضا میں گونج گئی.....

”تو پھر سامنے آ۔“ فضل نے اپنی ڈب میں رکھی ہوئی پستول پر ہاتھ رکھا۔ ان دنوں وہ بھرا ہوا پستول اپنے پاس رکھتا تھا۔ سکھیرے سے اس دن والا جھگڑا ذہن میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ کینے دشمن سے کوئی بات بھی متوقع تھی۔ اس لیے حفاظت کے لیے وہ ہر وقت اپنے ساتھ پستول رکھتا تھا۔

تاج کی طرف سے اسے کل بھی ایک دھمکی کا پروانہ ملا تھا۔ رفتے پر نام و مقام تو درج نہیں تھے صرف یہی لکھا تھا ”بیگیاں سے دستبردار ہو جاؤ ورنہ۔“

اور

فضل کو بغیر نام و مقام کے پتہ چل گیا تھا کہ رقعہ بھیجنے والا کون ہے۔ فضل چاہتا تو اس رقعے کا جواب شہر تاج کی اقامت گاہ پر پہنچ کر دے سکتا تھا۔ اس کے خون میں بھی جوش تھا اور بے غیرت بن کر جینے سے مر جانے کو بہتر سمجھتا تھا۔

لیکن

وہ ابھی کوئی جھگڑا کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیگیاں کو جب تک بیاہ کر گھر نہ لے آتا اسے صبر و تحمل سے کام لینا تھا..... اس کے بعد؟

اس کے بعد

فضل کے ذہن میں بھی کئی منصوبے تھے۔ اپنے باپ کا خون کبھی کبھی ایسی لاکار بن کر ذہن میں گونجتا کہ فضل کو اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا۔

اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے اور اس تنازعے کو پنپانے کے لیے اس کے ذہن میں بھی خونیں منصوبے پل رہے تھے۔

دشمن نے ابھی اسے لاکار تھا۔ فضل جان گیا تھا کہ یہ خود تاجا ہے یا تاجے کے

کرائے کے غنڈے اور تو اس کی کسی سے دشمنی ہی نہیں تھی اور ان راستوں سے وہ ہزاروں نہیں لاکھوں بار گزرا تھا۔ یہ تو دھندلے پھیلائی شام تھی وہ تو ان راہوں سے بالکل اکیلا اور نہتا آدھی آدھی رات کو بھی گزرا تھا۔

فضل گھوڑی کی لگامیں کھینچے سڑک کے عین درمیان رکا ہوا تھا ”اتر آ گھوڑی سے“ جھاڑیوں کے پیچھے سے پھر آہنی آواز آئی۔

”اوہمت ہے تو سامنے آ..... بزدلوں کی طرح چھپ کر کیوں لگا رہا ہے.....“ فضل نے زوردار آواز میں کہا۔

دونوں سمت کی جھاڑیوں سے دو نقاب پوش ڈاکو پھلانگ کر سڑک پر اس کے عین سامنے آ گئے..... ان کے ہاتھوں میں بلم تھے.....

فضل نے لگامیں پھینک کر گھوڑی سے اڑتی ہوئی چھلانگ لگائی..... اور دونوں کے درمیان آن کھڑا ہوا..... ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے دائیں ہاتھ والے نقاب پوش کی ٹانگ میں ٹانگ اڑائی وہ منہ کے بل گرا۔ فضل نے اسی اثنا میں دوسرے پر حملہ کر دیا۔

جھک کر اس نے گرے ہوئے ڈاکو کی بلم اٹھائی اور پھر باقاعدہ بلموں سے لڑائی شروع ہو گئی.....

گرا ہوا بد معاش بھی کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا..... اب فضل کا ایک نہیں دو سے مقابلہ تھا۔ فضل نے پستول نکال لیا۔

سچائی اور حق کی قوت فضل کے ساتھ تھی۔ ویسے بھی بڑا جی دار اور بہادر آدمی تھا..... چند منٹ کی لڑائی کے بعد ایک ساتھی تو بھاگ نکلا..... دوسرے کو فضل نے قابو کر لیا..... یہ بد معاش زخمی ہو گیا تھا..... بازو سے خون بہہ رہا تھا اس لیے مقابلے کی ہمت نہ تھی۔

فضل نے اسے زوردار دھکا دیا ”دفع ہو جا..... کرائے کے غنڈے۔ تجھے پتہ نہیں کس سے واسطہ پڑا ہے.....“

پھر اس نے تاجے کو ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے کہا ”تاجے کو کہنا کالک مل لے منہ پر..... ملکوں سے دو دو ہتھ کرنا آسان نہیں..... تو م کے رکھ دوں گا اس کے سارے

قبیلے کو..... کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔“

دونوں حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ پستول دیکھ کر تو دونوں حواس باختہ ہو گئے تھے۔ فضل نے کپڑے جھاڑے پستول ڈب میں رکھا اور اچک کر گھوڑی پر بیٹھ گیا۔ گھوڑی کی گردن کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے اس نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

گھوڑی صاف سڑک پر سینہ تان کر چلنے لگی۔ فضل گھر پہنچا تو چراغ جل چکے تھے۔ گھر اور گلی میں گہما گہمی تھی۔ لڑکیاں بالیاں ہرے پیلے لال اور نیلے آنچل لہراتی پھر رہی تھیں۔ دیکیں اتاری جا چکی تھیں اور اینٹوں کے بنے عارضی چولہوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

صحن بھی لوگوں سے بھرا تھا۔ چار پائیاں بچھی تھیں۔ حقے گڑ گڑا رہے تھے۔ اونچی آوازوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ کوئی کسی کو چھیڑ رہا تھا، کوئی پرانے قصے دہرا رہا تھا، کسی کو اپنی شادی کے واقعے یاد آ رہے تھے، کوئی دوسروں کی شادی کے لطیفے سن رہا تھا.....

عورتیں دالان میں جمع تھیں۔ گوٹے کنارے والے آنچل لہرا رہے تھے۔ ڈھولک پیٹی جا رہی تھی۔ تہتہوں اور تالیوں کی گونج تھی۔ نچوٹ لال گوٹے کے جال والا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ بھی سب لڑکیوں کے ساتھ گاجا رہی تھی۔

لیکن بار بار اس کی نظریں فضل کے انتظار میں دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں..... اس کا دل اس کے دیر سے آنے پر ڈانوا ڈول ہو رہا تھا..... خوشی کے بھرپور لمحوں میں بھی وسوسہ جاگ رہا تھا

اور

جب

فضل صحن میں آیا تو وہ دیوانہ وار باہر دوڑی..... فضل سے لپٹ گئی..... ”تو نے اتنی دیر لگا دی ویر..... کبھی تو سوچا کر کہ تیری بھین تیرے انتظار میں کیسے گھڑیاں گزارتی ہے۔“

”بھین جھلی ہو تو اس کا میں کیا کروں۔“ فضل نے دلی پیار سے اسے سینے سے لگا کر اس کا سر تھپکا.....



ارد گرد کھڑے بیٹھے لوگ بہن بھائی کے اس پیار سے بہت متاثر ہوئے۔ لیکن مائی جیناں ہنس کر بولی ”بھیناں سنگ اتنا پیار نہ پا فضل یہ تو اڑتے پکھیر وہیں..... کل کو اسے بیاہ دے گا..... تو کیسے رہے گا اس کے بغیر..... اور کیسے رہے گی یہ تیرے بغیر.....“

اور

بھابی زینے ہنس کر بولی ”اسی لیے تو بیاہ نہیں کرتا بہن کا.....“

”نہیں بھابی.....“ جلدی سے فضل نجو کو الگ کرتے ہوئے بولا ”انشاء اللہ اگلے جن میں اس کی ڈولی اٹھا دوں گا۔“

”سچ۔“ کئی آوازیں آئیں۔ نجو شرما کر بھاگ گئی..... ”ہاں۔“ فضل نے کہا۔

”رشتہ طے کر لیا ہے۔“ کسی نے پوچھا۔

”بس کر ہی لیا ہے۔“ فضل نے دوسری چارپائی کے قریب کھڑے راجو کی طرف ہنس کر دیکھا۔

”کہاں..... کہاں کیا ہے.....“ کئی آوازیں آئیں۔

فضل نے آگے بڑھ کر راجو کا ہاتھ پکڑ لیا..... اور قدرے اونچا کرتے ہوئے بولا۔

”راجو میری بانہہ ہے۔“

کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا۔ فضل نے نجو اور راجو کے بندھن کا یہ غیر رسمی سا اعلان کر دیا۔

ہاں راجو کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا..... اور وہ بے اختیارانہ جذبوں کی شدت سے مغلوب ہو کر فضل سے لپٹ گیا۔

کچھ لوگ بے انتہا خوش ہوئے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے۔ یہ بے جوڑ سامیل انہیں پسند نہ آیا۔

لیکن فضل اور راجو دونوں ہی خوش تھے۔

”ہاں نجو۔ آج تیرے ویر کی بارات ہے نا اور مجھے پتہ تھا تو درگاہ میں چڑھاوا چڑھانے ضرور آئے گی۔“

”اچھا۔ تو تو میرے انتظار میں یہاں بیٹھا تھا۔“

”ہاں۔“

”جو میں نہ آتی تو.....“

”کیسے نہ آتی۔ سب لڑکیاں اپنے ویروں کی بارات سے پہلے یہاں چڑھاوا

ارد گرد کھڑے بیٹھے لوگ بہن بھائی کے اس پیار سے بہت متاثر ہوئے۔ لیکن مائی جیناں ہنس کر بولی ”بھیناں سنگ اتنا پیار نہ پا فضل یہ تو اڑتے پکھیر وہیں..... کل کو اسے بیاہ دے گا..... تو کیسے رہے گا اس کے بغیر..... اور کیسے رہے گی یہ تیرے بغیر.....“

اور

بھابی زینے ہنس کر بولی ”اسی لیے تو بیاہ نہیں کرتا بہن کا.....“

”نہیں بھابی.....“ جلدی سے فضل نجو کو الگ کرتے ہوئے بولا ”انشاء اللہ اگلے جن میں اس کی ڈولی اٹھا دوں گا۔“

”سچ۔“ کئی آوازیں آئیں۔ نجو شرما کر بھاگ گئی..... ”ہاں۔“ فضل نے کہا۔

”رشتہ طے کر لیا ہے۔“ کسی نے پوچھا۔

”بس کر ہی لیا ہے۔“ فضل نے دوسری چارپائی کے قریب کھڑے راجو کی طرف ہنس کر دیکھا۔

”کہاں..... کہاں کیا ہے.....“ کئی آوازیں آئیں۔

فضل نے آگے بڑھ کر راجو کا ہاتھ پکڑ لیا..... اور قدرے اونچا کرتے ہوئے بولا۔

”راجو میری بانہہ ہے۔“

کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا۔ فضل نے نجو اور راجو کے بندھن کا یہ غیر رسمی سا اعلان کر دیا۔

ہاں راجو کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا..... اور وہ بے اختیارانہ جذبوں کی شدت سے مغلوب ہو کر فضل سے لپٹ گیا۔

کچھ لوگ بے انتہا خوش ہوئے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے۔ یہ بے جوڑ سامیل انہیں پسند نہ آیا۔

لیکن فضل اور راجو دونوں ہی خوش تھے۔

چڑھانے آتی ہیں..... اور تیرا تو دیر تیرا پیارا بھی بہت ہے۔“

نحو نے اک گہری سانس لی اور سر جھکاتے ہوئے بولی ”ہاں راجو! بہت پیارا اور بہت عزیز ہے بھائی مجھے..... آج اس کی جنج ہے۔ وہ بیگاں کو بیاہنے جا رہا ہے..... دعا کرو خیر خیریت سے وہ بیگاں کو لے آئے۔“

راجو نے غور سے نحو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک نہیں رہا تھا۔ اک نامعلوم سی اداسی اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی تھی۔

راجو نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ”ویر کی بارات ہے اور تو اتنا اداس کیوں ہو رہی ہے۔“

”نہیں اداس تو نہیں۔“ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور درگاہ کے احاطے کی کچی دیوار پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں آٹے کے دیے تھے جن میں گھی ڈال کر روٹی کی بتیاں ڈالی ہوئی تھیں..... اس نے پانچ دیوں والا تھال بھی دیوار پر رکھ دیا۔

راجو اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے نحو۔“

”کچھ نہیں۔“

”پھر تو اتنی اداس کیوں ہے۔“

”راجو۔“

”ہاں۔“

”آج مجھے اپنی ماں اور اپنا باپ بہت یاد آ رہے ہیں.....“ وہ بے اختیار ہو کر

گلوگیر آواز میں بولی۔

راجو نے بھی سر جھکا لیا..... پھر آہستگی سے سر اٹھا کر نحو کو دیکھا جو آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

”آج میری ماں ہوتی..... یا باپ ہی ہوتا تو.....“ اس نے سسکی بھری۔

”نحو۔“ راجو جلدی سے بولا ”تو تو بڑی بہادر تھی۔ تیری آنکھوں سے آنسو بہتے

اچھے نہیں لگتے..... پگلی..... اس میں رونے کی کیا بات ہے۔“

”بس راجو۔ پتہ نہیں کیوں۔ دل بار بار بھرتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب روؤں۔“

”بد شگنی نہ کرو نحو..... پونچھ لے آنسو۔ خوشیاں منا..... ماں باپ کی قسمت میں

یہ دن دیکھنا نہیں تھا..... رب کی یہی مرضی تھی۔“

”ہاں۔“ اس نے اک گہری سانس لی اور آنسو پونچھ لیے۔ ”چل درگاہ میں

دیے رکھ کر دعا مانگ..... خدا تیرے بھائی کو یہ خوشی نصیب کرے..... وہ پھلے پھولے.....

اور اپنی بیگاں کے ساتھ زندگی کی بہاریں لوٹے۔“

”آمین۔“

نحو دیوار سے اتر کر دیوں والا تھال اٹھاتے ہوئے بولی ”ہاں میں دیے رکھ کر دعا

کرنے ہی تو آئی ہوں..... تو بھی دعا کر راجو میرے ویر کی خیر ہو۔“

”خیر ہوگی..... سب خیر ہوگی.....“

”اچھا میں اندر جا رہی ہوں تو بھی چلا جا..... لوگ آ جا رہے ہیں۔“

”تو کیا ہوا.....“

”باتیں بنائیں گے۔“

”اب کسے پروا ہے بنانے دے۔“

”واہ وا..... اب کیا ہو گیا۔“

”راجو تیرا ہو گیا تو راجو کی ہو گئی۔ فضل نے ساری برادری میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہا

”راجو میری بانہہ ہے.....“

”نحو مسکرائی اور پھر نظریں جھکاتے ہوئے بولی ”بانہہ کہنے کا یہ مطلب ہے کو

تو.....“

”ہاں ہاں..... ہاں“ راجو شوخی سے بولا..... اب تو دنیا کی کوئی طاقت تجھے مجھ

سے چھین نہیں سکتی.....“

”ہاں راجو.....“ نحو نے آہستگی سے کہا ”میرا ویر میری خوشیاں میری آنکھوں

میں پڑھ لیتا ہے۔ اس نے یہ رشتہ دل سے منظور کر لیا ہے.....“

”یہ میری دعاؤں کا نتیجہ ہے نحو تو کیا جانے..... اس درگاہ میں میں نے آدھی

آدھی رات کو آ کر اپنے رب سے کتنی دعائیں مانگی ہیں..... میں اس قابل تو نہیں تھا پر میرے مولانا نے میرے پیار کی لاج رکھ لی ہے۔“

”بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔“ نجو نے قدم اٹھاتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”یہ تو جب تو اگلے چن میری بن جائے گی اس وقت بتاؤں گا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

نجو نے شرما کر منہ پھیر لیا اور دیے اٹھائے درگاہ کی کچی پکی سیڑھیوں کی طرف چل دی۔

نجو نے بڑی عقیدت سے دیے مزار کے سرہانے رکھ دیئے۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے..... آج جانے اسے کیا ہو رہا تھا۔ اداسی اندر ہی اندر کنار بن کر اتر رہی تھی..... دل بیٹھا جا رہا تھا..... بار بار اسے اپنی بے یاد آ رہی تھی۔ ابایا د آ رہا تھا۔

دعا مانگتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنائے آنکھیں بند کیے آنسوؤں سے تر گالوں سے وہ دعا مانگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی۔

گھر میں بارات کے لیے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ مہمانوں کا شور و غل تھا۔ بیٹھک میں بھی لوگ تھے، صحن میں بھی، گلی میں بھی.....

بارات نے کوٹلی جانا تھا..... لوگوں کی سہولت کے لیے شہر سے تانگے بگھیاں منگوائی گئی تھیں۔ گھوڑے بھی سجائے گئے تھے۔ بیل گاڑیوں کو بھی آراستہ کیا گیا تھا۔ بارات چونکہ رات کو جانا تھی اس لیے روشنی کے لیے شہر سے بڑے بڑے گیس منگوائے گئے تھے۔

سب لوگ تیاری کر رہے تھے۔ شام ڈھلے بارات نے روانہ ہونا تھا۔ ابھی دن کی روشنی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں دالانوں میں بھری تھیں۔ کچھ رسمیں ہونا تھیں..... فضل کو دولہا بن کر گھوڑے پر بیٹھنا تھا۔ نجو نے باگ پکڑ کر بھائی سے باگ پکڑوائی لینا تھی۔ رشتے ناطے کی سب بہنوں نے فضل سے باگ پکڑائی لینا تھی۔ بھابیوں نے سرمہ ڈالنے کی رسم کرنا تھی۔

اسی لیے سب تیار ہو رہی تھیں..... افراتفری سی مچی تھی۔ کوئی کپڑے بدل رہی

تھی۔ کوئی کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ کوئی بالوں میں کنگھا کر رہی تھی اور کوئی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے لگا رہی تھی..... چودھرائیاں جمع تھیں۔ سر سے پیر تک سونے میں پہلی ہو رہی تھیں۔

نجو بھی دالان میں آ گئی۔ جیلاں نے اس کے کپڑے کھوٹی سے لٹکا دیئے تھے۔ خوب بھاری چمکیلے کام والے کپڑے تھے۔ رتو کی ماں کے ساتھ شہر جا کر وہ خود بنوا کر لائی تھی۔ جاروزیور کا ڈبہ پکڑے کھڑی تھی۔ نجو نے کپڑے بدل کر زیور بھی پہننا تھا۔



لیٹا رہتا..... رات اپنے بیڈروم میں ہی سونے کے لیے کہہ دیتا۔  
لیکن

دونوں ذہنی طور پر ایک دوسرے سے دور ہی دور تھے..... گل پروشے کے خوابوں کی جنت تہس نہس ہوتی جا رہی تھی۔

وہ سہ پہر بڑی سرد تھی۔ مطلع کئی دنوں سے ابر آلود تھا۔ برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دھوپ کی حدت تو جیسے ختم ہو گئی تھی۔ کمروں میں ابھی سے تپش کے لیے لکڑیاں جلادی گئی تھی۔ آتش دانوں میں دھڑا دھڑا آگ جل رہی تھی۔ تاج کا کمرہ تو خاصا گرم تھا.....

گل پروشے اس کے لیے چائے بنا کر لائی۔ تاج باتھ روم میں تھا۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر آتش دان کے قریب ہو بیٹھی..... تاج کمرے میں آیا تو گل نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کئی دنوں کے بعد کہیں جانے کو تیار ہو کر باہر آیا تھا۔

”کیوں سردار.....“ گل پروشے نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیوں؟“ وہ بولا۔

”کدر جاتا ہے۔“

”ہاں۔“

”ڈاکٹر کے پاس۔“

”نہیں۔“

”اور کدر۔“

”گاؤں۔“

”گاؤں۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”کام ہے۔“

”کیسا کام ہے۔ تم ابھی ٹیک نہیں ہوا، تمہارا پسلی.....“

”سب ٹھیک ہے۔“

تاج کی پسلیوں میں ابھی تکلیف تھی۔ وہ زیادہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ مالش، ٹکڑ اور ڈاکٹر ہیپسٹنگز کی تجویز کردہ دوائیاں بھی کھا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے زیادہ چلنے جلنے سے منع کر رکھا تھا.....

تاج ان ہدایات پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ اب وہ دوستوں کو بھی گھر پہنچا دیتا۔ پینے پلانے کا بھی یہیں اہتمام ہوتا..... کبھی کبھی کوئی بازاری حسینہ بھی یہیں آ جاتی۔

گل پروشے تاج کی یہ ساری حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ اسے کب یہ سب کچھ پسند تھا۔ وہ تو ایک پرامن گھر کی شدت سے خواہاں تھی، جہاں وہ ہوتی، تاج ہوتا اور اس کے پھول ایسے پیارے پیارے بچے ہوتے۔

لیکن

یہ خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ ان ٹوٹے پھوٹے بکھرے خوابوں کی کرچیاں گل پروشے کے حساس دل میں چبھتی رہتی تھیں۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی جنت کی متلاشی تھی۔ اس کے اندر کی عورت تلملاتی تھی۔ اپنا حق مانگتی تھی۔ اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کی محبت پر کسی دوسرے کو حق جماتے دیکھ کر بگڑ جاتی تھی۔ تڑپ جاتی تھی اور انتقام کی بھٹی بھڑک اٹھتی تھی۔

ویسے گل پروشے کو جب سے تاج نے سوات واپس چھوڑ آنے کی دھمکی دی تھی، وہ چپ چاپ رہنے لگی تھی۔ اس نے اپنے اندر کی عورت کی آواز پر کان نہیں دھرا تھا۔

تاج کی خدمت کرنے میں اس نے کوتاہی نہیں کی تھی..... بے لوث خدمت کر رہی تھی..... اس کی ہر زیادتی برداشت کر رہی تھی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی تاج اس سے ہنس بول لیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر

”اس وقت کیوں جاتا ہے۔ بار دیکو کتنا سردی ہے۔ اس سے درد بڑھے گا سردار.....“

”جانا ضروری ہے سمجھیں۔“

گل نے دیکھا تاج کی آنکھوں میں شیطانی سی چمک اور خوفناک سا ارادہ تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی.....

”آج وہاں ایک شادی ہے۔“ وہ جیسے گل سے نہیں کسی اور سے مخاطب تھا۔  
”شادی۔“

”ہاں میرے سب سے بڑے دشمن کی شادی۔“

”سردار.....“

”ہاں۔“

”تم اور کیا کرے گا..... سردار.....“

”شادی میں شرکت کروں گا گل پروشے۔ ملکوں نے سکھیروں کو اس شادی میں شرکت کی دعوت دی ہے.....“

تاج کھلکھلا کر ہنس پڑا اس کے قہقہوں میں وحشیانہ پن تھا درندگی تھی.....  
سردار۔“

”لا چائے بنا۔“

”سردار تمہارا صحت ٹیک نہیں ہے۔ اتنا خراب ہے مت جاؤ اس وقت۔“ وہ پھر ہنسا اور بولا ”وہاں میرا حاضر ہونا بہت ضروری ہے.....“

”گل چپ ہو گئی.....“

”چائے بنا دے۔“ تاج نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گل نے چائے بنا کر پیالی اس کی طرف بڑھادی۔ اپنے لیے اس نے چائے نہیں بنائی۔ اس کے ذہن میں متضاد سوچیں تھیں۔

کئی دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ تاج اور اس کے چندا و باش دوست بند کمرے میں بیٹھ کر صلاح و مشورے کرتے رہتے ہیں۔ وہ یہ تو نہ جان پائی تھی کہ صلاح مشوروں کی

نوعیت کیا ہوتی ہے۔ لیکن یہ احساس کبھی کبھی ضرور جاگتا تھا کہ کسی تخریبی عمل کے پروگرام بنتے ہیں۔

اس نے ایک دو بار علمے سے بھی اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا لیکن علما سے بھلا یہ سب کچھ کیسے بتا دیتا۔ اسے اپنی جان کی ضرورت تھی ورنہ جانتا تو وہ سب کچھ تھا.....

چائے پی کر تاج نے علمے کو آواز دی۔

”جی چودھری جی۔“ وہ دروازے میں آ کر بولا۔

”ڈرائیور سے کہہ گاڑی نکالے۔“

”اچھا جی۔“

وہ پلٹ گیا..... گل پروشے چپ چاپ تاج کا منہ تنکے گئی۔ ”کیا تک رہی ہے۔“ تاج نے مسکرا کر کہا۔

”تمہارا ارادہ اچا نہیں ہے۔“ گل ڈوبے ڈوبے بولی۔

”گل پروشے۔“ تاج نے چیخ کر کہا..... اسے گل کی یہ بات بالکل نہیں بھائی.....  
”اپنی حد میں رہا کرو.....“

”سردار۔“ گل نے اٹھ کر اس کا راستہ روکنا چاہا۔

لیکن

تاج نے اسے دھکا دیا۔ وہ کرسی کی پشت پر گری..... تاج غراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

گل پروشے اپنی کمر میں لگنے والی کرسی کی پشت پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے دانت پیس کر رہ گئی.....

”گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔“

وہ دروازے کی طرف آئی، علما ادھر ہی آ رہا تھا۔

”علمے۔“

”جی۔“

”یہ تمہارا چودری کد رہ گیا ہے۔“

”گاؤں۔“

”کس کی شادی ہے۔“

”ملک فضل کی۔“

”وہ اس کا دشمن ہے۔“

علمی نے نظریں اٹھا کر گل پروشے کو دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولا ”بی بی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ملکوں اور سکھیروں کی صدیوں پرانی دشمنی ہے۔“

”پر تم نے یہ بولا تھا کہ اب ملک نے سکھیروں سے صلح کیا ہے۔“

”ہاں۔“

”پھر۔“

علمی نے پھر گل کو دیکھا..... وہ خود بھی اس وقت خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ تاج کے ارادے اسے معلوم تھے۔ جو پلان وہ بنا چکا تھا اس کی بھی اسے کچھ کچھ

خبر تھی۔

تاج آج ملک فضل کی شادی میں شریک ہونے گاؤں گیا تھا۔ یہ بھی اس کی اک چال تھی۔ وہ برادری اور گاؤں کے لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ملک فضل سے اس کی کوئی پر خاش نہیں..... اور وہ سکھیروں کو ملک فضل کی طرف سے بلاوا دینے پر خوش ہے۔ اس کی خوشی میں شریک ہونے آیا ہے۔

لیکن

اس کے ارادے کیا تھے؟

علما ان ارادوں کی خوفناکی ہی سے پریشان تھا۔

اسی پریشانی ہی میں اس نے گل کو بھی بتا دیا۔

وہ حیرت زدہ سی علمی کو تکتے لگی۔

”ملک فضل بے قصور ہے۔“ وہ کئی لمحوں کی چپ کے بعد بولی۔

”ہاں جی۔ وہ بڑا بیباک بندہ ہے..... اس نے تو اپنے باپ کا خون بھی بھلا دیا تھا۔

وہ خون خرابے کو بند کرنا چاہتا تھا..... اس نے صلح کا ہاتھ خود ہی سکھیروں کی طرف

بڑھایا..... حالانکہ اس کے خاندان کے دوسرے لوگوں کو یہ بات پسند بھی نہ تھی..... پھر بھی..... وہ.....“

”وہ بزدل ہے۔“ گل نے پوچھا۔

”نہیں بی بی..... اس جیسا بہادر اور جی دار پوت تو مائیں صدیوں میں جنتی ہیں.....“

”اچا.....“

”ہاں۔“

”اس کا اور بھائی بند.....“

”صرف ایک بہن ہے۔ ماں نہ باپ نہ ماما نہ چاچا..... آج اس کی شادی ہے۔“

”اور سردار اس کی شادی میں گڑ بڑ کرے گا۔“

علمی نے ایک گہری سانس لی..... اور بولا ”خود تو نہیں کرے گا“ کروائے گا.....“

”ہوں۔“

وہ سوچوں میں ڈوبی ڈوبی پلٹی اور کمرے کے اندر چلی گئی..... علما براہِ مدے میں آگیا اور کمبل کی بکل مار کر حقہ گڑ گڑانے لگا۔

تھے۔ بیگیاں کے بھائی دوڑے پھر رہے تھے۔ بہنیں بھی ادھر ادھر جا رہی تھیں۔ اس کی بے اور چاچے کو تو آج اپنا ہوش ہی نہیں تھا.....

حویلی مہمانوں سے کھپا کھچ بھری تھی۔ ڈھولک یہاں بھی لڑکیاں بالیاں پیٹ رہی تھیں۔ اونچے سروں میں ماہیا اور سہاگ گیت گارہی تھیں۔

بیگیاں پچھلی کوٹھڑی میں اپنی سہیلیوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے جہیز کے بکس پیٹیاں اور گٹھڑیاں یہاں ہی رکھی تھیں۔ ایک طرف دو چار پائیاں ساتھ ساتھ جڑی پچھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ والی چار پائی پر بیگیاں تھیں۔ اس کے ارد گرد اس کی سہیلیاں اور رشتے ناٹے کی بہنیں بیٹھی ہنسی مذاق میں مشغول تھیں۔

بیگیاں نے میلا سا پیلا مایوں کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ پنڈ کے دستور کے مطابق اس کو کئی دن پہلے پیلا جوڑا پہنا کر مایوں کی طرح بیٹھا دیا گیا تھا۔ کنگھی پٹی بھی اتنے دنوں سے نہ کی تھی..... یہ خیال عام تھا کہ لڑکی مایوں سے بارات تک جتنی میلی کچیلی رہے گی دلہن بننے پر اتنا ہی زیادہ روپ آئے گا۔

بیگیاں کو ایک دن پہلے مہندی بھی لگائی گئی تھی۔ اس کے سارے ہاتھ اور پاؤں مہندی میں رنگ دیئے گئے تھے۔ مہندی اتنی رنگیلی تھی کہ سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی..... لڑکیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ اس کی ہمزاسہیلیاں فضل کے حوالے سے باتیں کر رہی تھیں۔

”نی بیگیاں۔ آج تو تیرے من میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔“

”فضل آنے والا ہے۔“

”تو جج دیکھے گی نا۔“

”سنا ہے۔ بیاہ کا جوڑا اس نے شہر سے بنوایا ہے۔ بڑا مہنگا بڑا سوہنا.....“

”کیا گھرو جوان ہے۔ دولہا بن کر تو قیامت ڈھائے گا۔“

”بیگیاں پر بھی دیکھنا کیسا روپ آئے گا۔“

”پر فضل فضل ہی ہے۔“

”کیوں بیگیاں کم ہے اس سے..... ایسی چھیلی دلہن دیکھے گا تو آنکھیں کھل

کوٹلی میں کسی تہوار کی سی رونق تھی۔ بشیر نبردار کی حویلی دلہن کی طرح سچی تھی۔ رنگ برنگی کاغذی جھنڈیاں، کاغذی پھول حویلی ہی میں نہیں پوری گلی میں لگائے گئے تھے۔ گلی صاف ستھری تھی، چونے کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔

ہر گھر سے دیواروں پر لگے اپنے اتر وادیئے گئے تھے۔ کچی نالی کو لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ روشنی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ جا بجا گیس رکھوادیئے گئے تھے۔

حویلی کے پچھواڑے دیگیں پک رہی تھیں۔ ایک طرف تنور لگا ہوا تھا، حلوائی بھی بیٹھے تھے۔ مٹھائی کے تھال پہ تھال تیار کر رہے تھے۔ دودھ کے بڑے بڑے دیگیچے بھی چولہوں پر چڑھے تھے۔ چھوہارے ڈال کر دودھ ابالا جا رہا تھا۔ منتظم اپنی نگرانی میں سب کچھ کروا رہے تھے.....

آج نبردار کی بیٹی کی شادی تھی۔ پورا گاؤں جیسے الٹ آیا تھا۔ گاؤں کی کسی بھی بیٹی کی شادی ہو گاؤں والے کام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بیٹی سب کی سانجھی ہوتی تھی، لیکن یہ تو اک تکرے زمیندار کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس لیے ہر کوئی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔

آج بارات آنے والی تھی..... نبردار کی کا نہیں پورے گاؤں کی عزت کا معاملہ تھا۔ خاطر مدارت میں کوئی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کمی رہ جائے۔ بارات کو دو دن ٹھہرانا تھا اس لیے قیام و طعام کا صحیح اور پورا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔

کئی گھروں کے دالان خالی کروا کے رنگین پائیوں والی چار پائیوں پر ابلے ابلے کھیس اور نئے لحاف رکھے گئے تھے۔ حقے تازہ کر کے رکھ دیئے گئے تھے۔ عورتوں کو حویلی ہی میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

مصرفیت گھبراہٹ بنی ہوئی تھی۔ جوان لڑکے اور مرد بھاگم بھاگ کام کر رہے

جائیں گی..... بیہوش ہو کر گر پڑے گا۔“

”کیوں بیگاں؟“

سہیلی نے اسے گدگدایا، لیکن وہ ہنس نہ سکی۔ لڑکیاں پھر باتیں کرنے لگیں۔

”بہت اداس ہے تو بیگاں۔“

”بھئی بابل کا گھر چھوڑنا آسان تو نہیں۔“

”بابل کے گھر سے بچن کے گھر تو جا رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر یہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔“

”آج پرانی ہو رہی ہے نا۔“

”چھوڑ دیجی..... پرانی کیا ہو رہی ہے اپنے مامے کے گھر جا رہی ہے۔“

”مامے کے گھر جائے یا چاچے کے..... شادی ہو کر کڑی پرانی ہو جاتی ہے۔“

”بیگاں جیسی پرانی تو ہر کڑی ہو.....“

”کیوں؟“

”بھائی شادی تو ہوتی ہے۔ دل کے مالک سے ہو تو بات ہی اور ہے.....“

”بیگاں کے ارد گرد بیٹھی لڑکیوں نے پھر اسے گدگدایا، لیکن اب بھی وہ ہنس

نہ سکی۔

”اے ہے بیگاں..... کیا منہ لٹکائے بیٹھی ہے۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”بھئی تیری مرضی نہیں تو بے شک اب بھی بتا دے۔“ دوسری نے ہنس کر شوخی

سے چھیڑا۔ ”میں چاچی سے کہہ دیتی ہوں..... بارات واپس کر دے۔“

”ہائے ہائے..... کیسے برے لفظ منہ سے نکال رہی ہے۔“ کوئی بولی۔

”یہ جو منہ بنائے بیٹھی ہے۔ ہنستی ہے نہ بولتی ہے، یہی تو چھیڑ چھاڑ کا وقت

ہوتا ہے۔“

”جب سے اس کے بیاہ کی تاریخ مقرر ہوئی ہے..... ایسے ہی گم صم ہے.....“

”ہاں بیگاں..... تجھے تو چہکتے پھرتے رہنا چاہیے.....“

”ہر لڑکی پر یہ وقت آتا ہے ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑنا ہی پڑتی ہے..... پر کوئی

تیری طرح اس طرح اداس نہیں ہوتا۔“

”کڑیاں تو اپنی شادی کے سہاگ گیت بھی خود ہی گاتی پھرتی ہیں.....“

”وہ خدیجہ ہے ناما سی مریم کی دھی، بھئی اس نے کوئی گانا چھوڑا تھا اپنی شادی

پر.....“

”ہاں ہاں، میں بھی گئی تھی..... حالانکہ اس کا بیاہ بالکل غیروں میں ہو رہا تھا۔“

لڑکیاں آپس میں ہی باتیں کرنے لگیں۔

بیگاں نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور اس کی خشک ویران آنکھیں جلنے لگیں۔

”بیگاں، اے بیگاں۔“ اس کی عزیز ترین سہیلی شمو نے اس کا سر اٹھاتے ہوئے کہا

”کیا بات ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ وہ پہلی بار بولی۔

”کیا ہو رہا ہے۔ جی تو ٹھیک ہے نا۔“

”میرا جی گھبرا رہا ہے شمو۔“

”پانی پئے گی۔“

شمو نے ناصو کو پانی لانے کے لیے کہا..... سب لڑکیاں چپ ہو گئیں۔ ناصو سلور

کے گلاس میں پانی لے آئی..... شمو نے گلاس بیگاں کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا ”حوصلہ

رکھ بیگاں، تیری انوکھی تو شادی نہیں ہو رہی۔“

”شمو..... پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے..... جی چاہتا ہے چیخ چیخ کر روؤں۔“

”تو رو لے..... دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔“

”میرے پیٹ میں مروڑ بھی اٹھ رہے ہیں..... دل ڈوب رہا ہے شمو، میں

مر رہی ہوں۔“

”دفع دفعان..... کیا پاگلوں والی باتیں کر رہی ہے۔“

”کچھ ہونے والا ہے شمو.....“

”خیر مانگ جھلی۔“ جیہ بولی۔

”کچھ ہونے والا ہے..... کچھ ہونے والا ہے..... مان جاؤ کچھ ہونے والا



ہے۔“ بیگیاں نے دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرا لیا..... شمو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ سردی کے باوجود اس کے ہاتھوں میں پسینے آ رہے تھے۔

اس کی سکھیاں بھی گھبرا گئیں۔ کوئی دودھ لینے لگی۔ کسی نے تکیہ ٹھیک کیا۔ بیگیاں کو بستر میں لٹا کر سب نے لحاف اس پر ڈال دیا۔ شمو ہولے ہولے اس کا بدن دبائے لگی..... ساتھ ساتھ حوصلے بھی دینے لگی۔

بیگیاں کا سارا وجود پسینے پسینے تھا۔ پھر بھی لرزہ سا لگ رہا تھا۔ یوں جیسے زوروں کا بخار چڑھ رہا ہو۔

-----○-----

کہتے ہیں کنوارے بچے کا اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ لیکن جب کنوارا پنا از دواجی زندگی سے ہمکنار ہونے لگے تو یہ حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ حوریں اور فرشتے اپنا حسن و نکھار بننے والے دولہا اور ہونے والی دلہن پر نکھار کرتے ہیں.....

شاید یہی بات تھی۔

فضل نے جب شادی کا نیا جوڑا پہنا اور سون سہرے اور پھولوں کی لڑیاں اسکے ماتھے پر سجیں تو اس بانگے چھیلے گھرو پر وہ روپ آیا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے..... دہشتی ہوئی رنگت، خوبصورت پیشانی پر جھکے ہوئے بال خوابوں کو اپنی گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی جھیل ایسی گہری گہری آنکھیں، تنومند اور مشقت سے لوہے کی طرح مضبوط جسم، چوڑی چمکی چھاتی اور اونچا قد۔ آج تو فضل نے اک نیا ہی روپ دھارا تھا۔ رشتے کی بھابیوں نے سرمہ لگانے کی رسم ادا کی۔ منہ مانگے پیسے لیے..... ہنسی مذاق ہوا..... تائیوں چچیوں نے صدقے اتارے بڑی بوڑھیوں نے دامن پھیلا کر دعا دی.....

نوجو بن ٹھن کر بھائی کے سامنے آئی تو اس کا رنگ و روپ دیکھ کر ششدر رہ گئی..... دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

لیکن

جانے کیوں مسکرا نہیں آ نسو بن گئیں۔

پچھڑ جانے والے ایسے موقعوں پر ہی تو یاد آتے ہیں۔ کسی نے چودھری رحمت کا نام لیا۔ کسی نے ان کی ماں کا، بس پھر کیا تھا۔ نوجو کے صبر و ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور فضل بھی اپنی گیلی آنکھوں کو الٹی ہتھیلی سے صاف کرنے لگا۔ نوجو بھائی کے سینے سے لگ کر بے اختیار

ہو کر رودی۔ ارد گرد کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ لیکن بزرگوں نے اس طرح رونے دھونے سے برامانا۔ بارات کی روانگی کے وقت یوں بلک بلک کر رونا اچھا نہیں لگا۔ کسی نے نجو کو کندھے سے پکڑ کر فضل کے بازوؤں اور سینے سے الگ کر دیا۔  
نجو تو خیر نوعمر لڑکی تھی اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ فضل کو بھی یوں لگا جیسے کسی نے نجو کو اس سے جدا نہیں کیا۔ اس کا کلیجہ جھپٹ لیا ہے۔

فضل کے دوست و احباب باہر جمع تھے۔ کچھ بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ وہ دولہا بنا بیٹھک میں آ گیا۔ یہاں لوگ جمع تھے فضل کو دیکھتے ہی مبارک سلامت کا شوراٹھا۔  
”دودو مبارکیں پترا۔“ بوڑھے اور معتمد چودھری نصیر نے فضل سے کہا۔  
”دودو؟“ فضل نے سہرا ذرا سا ہاتھ سے اٹھایا۔

”ہاں بھی..... آج تیری شادی میں دیکھ تو سہی کون کون آیا ہے۔“ ملک الدین نے خوشی سے تمنا تے چہرے کے ساتھ مہمانوں کی طرف اشارہ کیا۔  
فضل کی نظر سب سے پہلے تاج سکھیرے پر پڑی..... وہ بڑی تیکھی اور شیطانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فضل نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا۔ اس کی نظریں بھی تیکھی ہو گئیں۔  
دونوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو نگل لیا۔  
تاج کے ساتھ رفیق اور دوسرا بھائی شفیق بھی کھڑا تھا۔ رفیق دل کا نیک اور ایماندار آدمی تھا۔ پورے خلوص سے فضل کی طرف بڑھا اور دونوں بغلگیر ہو گئے.....

اس خوشی میں کسی نے زندہ باد کا زوردار نعرہ لگایا۔ مبارک سلامت کا غلغلہ مچا..... اور اسی شور شرابے میں شفیق اور اس کے بعد تاج فضل سے بغلگیر ہوئے..... تاج کے ملنے کے انداز سے فضل کو جانچ لینا مشکل نہ تھا کہ اس کے دل میں کینہ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہہ رہا ہے.....

”کہو کیسے ہو..... طبیعت ٹھیک ہے نا۔“ فضل نے مصافحہ کرتے ہوئے تاج کا ہاتھ اپنی پوری قوت سے دبایا۔ اس کی آواز میں کاٹ تھی اور آنکھوں میں تسخرانہ چمک۔  
تاج بھی ہنس کر آنکھوں سے شیطانی چمک لہراتے ہوئے بولا ”ایسے ہی تو ٹھیک نہیں ہوگی۔“ جو اب تاج نے بھی اس کا ہاتھ پوری طاقت سے کچلنے کی کوشش کی.....

فضل کچھ کہنے کو تھا کہ اس کے تایا زاد بھائی نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا۔ وہ اسے مبارکباد دیتے ہوئے بغلگیر ہو گیا۔  
اب فضل لوگوں سے مل رہا تھا۔ لوگ ملکوں اور سکھیروں کے ملاپ کی خوشی سے مغلوب مغلوب تھے۔ کوئی فضل کی تعریف کر رہا تھا۔ بھئی اس کی ہمت ہے۔ دوستی کا ہاتھ فضل ہی نے بڑھایا۔“

”بہت اچھا آدمی ہے فضل..... خدا نے اسے دریا ایسا دل دیا ہے۔“  
کچھ لوگ سکھیروں کے حامی تھے..... ان میں سے ایک بولا ”ٹھیک ہے۔ پر سکھیروں کی بھی بڑی دریا دلی ہے یارو.....“  
”ہاں کیوں نہیں۔“  
”فضل نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انہوں نے ہاتھ تھام لیا۔“  
”بالکل بالکل۔“

”خدا کرے یہ دوستی اب ہمیشہ قائم رہے۔ دونوں خاندانوں کی نبھ جائے۔“  
”انشاء اللہ نبھے گی..... دونوں طرف سمجھدار نوجوان ہیں۔“ خدا کرے بھائی ہم تو دونوں کی خیر چاہتے ہیں..... اللہ پاک انہیں توفیق دے۔“  
”آمین۔“

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ لوگ اس دوستی پر خوش تھے اور دل سے امن و امان کے خواہشمند تھے۔ جو ذرا جو شیلے اور غیرت کو انا کا مسئلہ بنانے والے تھے وہ چپ رہے..... معاملہ فضل اور تینوں سکھیروں کا تھا..... اس لیے خاموشی ہی میں مصلحت تھی۔  
گلی میں شہر سے آئے ہوئے خاکی وردیوں اور لال پگڑیوں والے بینڈ باجے والے کھڑے تھے۔ فضل کے لیے گہنوں سے لدی گھوڑی دروازے پر آ گئی تھی۔ باراتی گلی میں نکل رہے تھے..... بارات کی روانگی کے وقت پنڈ کے نائیوں میراشیوں نے گیس ساتھ ساتھ اٹھا کر چلنا تھا۔

فضل کو دوست یار بیٹھک سے نکال کر حویلی کے دروازے پر لے آئے۔ یہاں اس نے گھوڑی پر بیٹھنا تھا..... عورتیں اور مرد گھوڑی پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ بمشکل جگہ بنا کر

چند جوانوں نے فضل کو گھوڑی تک پہنچایا۔ ان میں راجو بھی تھا۔ اس نے بھی خوب سج دھج نکالی تھی۔ وہ گھوڑی کے قریب اس لیے کھڑا تھا کہ ابھی نجو نے باگ پکڑنی تھی۔ وہ اس سراپا قیامت کو قریب سے دیکھنے کے لیے ہی تو یہاں کھڑا تھا۔ دھکے لگ رہے تھے۔ لوگ پل پڑے تھے۔ لیکن وہ فضل کے قریب ہی کھڑا رہا۔

فضل گھوڑی پر چڑھا۔ نجو جوم کو ہٹاتی بمشکل آگے آئی۔ اس کا گوٹے سے بھرا دوپٹہ سر سے کھسک گیا اور سونے کے جڑاؤ کلپ جو بالوں میں لگا رکھے تھے گوٹے کی تاروں میں الجھ گئے۔

راجو نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے جذب کرنے لگا۔ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ گوٹے سے بھرے کپڑوں اور زیور میں.....

نجو نے آگے بڑھ کر باگ پکڑ لی۔ میرا شیوں نے گانا شروع کیا۔ بینڈ باجے والوں نے سریلی سی دھن چھیڑ دی..... لوگوں کے شور و غل بینڈ باجے کی آواز اور میرا شیوں کے گانوں کی لے میں نجو باگ پکڑے بولی ”میری باگ پکڑوائی دے ویرا.....“

”کیا لے گی۔“ گھوڑی پر سوار فضل نے سہرا قدرے اونچا کرتے ہوئے نجو سے ہنس کر پوچھا.....

”اونچے شملے والے ملک فضل کی خیر.....“ قریب کھڑے میراٹی نے نعرہ لگایا۔ نجو نے ہاتھ میں پکڑے چاندی کے بہت سارے روپے فضل کے اوپر سے نچھاور کر کے میرا شیوں اور نائیوں کی طرف پھینک دیئے۔

”دے دے ویرا باگ پکڑوائی۔“ عورتیں تالیاں بجا بجا کر گانے لگیں۔ فضل نے کنو اب کی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی نجو کی طرف بڑھادی۔ نجو نے اس کی مٹھی کے سامنے ہاتھ کر دیا۔ فضل نے چاندی کا ایک روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا.....

اس مذاق پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نجو بھی ہنسی۔ جلدی سے روپیہ اونچا کرتے ہوئے کہا ”دیکھو لوگو! ملک فضل نے بہن کو باگ پکڑوائی دی ہے..... اپنی ایک اکیلی بہن کو..... چاندی کا روپیہ..... ایک روپیہ.....“

سب ہنسنے لگے۔

چند لمحے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ فضل نے دوسری دفعہ دو روپے دیئے۔ تیسری دفعہ تین.....

پھر اس نے سونے کے جڑاؤ کنگن نجو کے حوالے کر دیئے..... نجو خوشی سے پھولی نہ سمائی..... بہن بھائی کی البیلی اکھیلیاں سب ہی دیکھ رہے تھے۔ راجو کی تو باچھیں کھلی جا رہی تھیں..... اس کا بس چلتا تو نجو کو بازوؤں میں بھر کر پیار کر لیتا.....

کچھ ایسی ہی خواہش دیوار کے ساتھ کھڑے تاج سکھیرے کے من میں بھی جاگ اٹھی تھی۔ اس نے آج پہلی بار ملک فضل کی بہن کو دیکھا تھا۔

صرف دیکھا ہی نہیں تھا۔

اس پر دل بھی آ گیا تھا۔

اور جس لڑکی پر اس کا دل آ جاتا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

اور یہ تو ملک فضل کی بہن تھی۔ ملک فضل جس نے تھوڑی دیر پہلے ہاتھ کے دباؤ سے اسے چیلنج کیا تھا اس نے دل ہی دل میں اک فیصلہ کر لیا۔

-----O-----

”مر گئے۔“

”لٹ گئے۔“

”دوڑو۔“

”پہنچو۔“

گلے پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہوئے بدحواس جوان بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بارات کے استقبال کے لیے لڑکی والے گلی کے سرے والے میدان میں جمع تھے۔ روشنی کے لیے گیس جل رہے تھے۔ پھر بھی اندھیرے میں بھاگتے دوڑتے آنے والوں کی صحیح شناخت نہ ہو سکی۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا۔“

”کون ہو تم۔“

”بتاؤ تو صحیح۔۔۔۔۔“

لوگ ان لوگوں کی طرف دوڑے۔۔۔۔۔ وہ سخت بدحواس تھے۔ منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ بس چیخے جارہے تھے۔

”چار پائی لاؤ۔۔۔۔۔ ان کو بٹھاؤ۔۔۔۔۔ آرام سے پوچھو۔“ لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔۔۔۔۔ کچھ لوگ چار پائی لینے دوڑے۔

”بارات۔۔۔۔۔ بارات۔“ بدحواس نوجوان سینہ پیٹتے ہوئے چیخا۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ فضل کی بارات آگئی ہے۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔“ اک بزرگ نے دھڑکتے

دل سے کہا۔

”بارات پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ فضل۔“ وہ بمشکل بولا۔

”کیا ہوا فضل کو۔۔۔۔۔“ کئی چیخیں ابھریں۔

”گھوڑے سے گر پڑا ہے۔ شاید ڈاکوؤں نے اسے مار ڈالا ہے۔۔۔۔۔ شاید گرنے سے مر گیا ہے۔۔۔۔۔“ دوسرا جوان سر پر ہاتھ رکھ کر بین کرتے ہوئے چیخا۔۔۔۔۔ ”اوئے فضل مر گیا ہے۔۔۔۔۔“

اس خبر سے جیسے کھرام مچ گیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔۔۔۔۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔۔۔۔۔ حویلی کی چھت پر عورتیں بارات دیکھنے کے لیے سردی اور وقت کی پروا کیے بغیر بیٹھی تھیں۔ باہر افراتفری مچی تو ان میں بھی کھلبلی مچ گئی۔

”کیا ہوا ہے۔“ کوئی بولی۔

”باہر بڑا شور ہے۔“

”بارات آگئی ہوگی۔“

”بارات آتی تو باجے بجتے۔۔۔۔۔ نہ کہ یہ شور۔۔۔۔۔“

”ہاں لگتا ہے کوئی روپیٹ رہا ہے۔۔۔۔۔“

”دوڑ بھاگ رہے ہیں سب۔“

”کوئی پتہ تو کرے جا کر۔“

”اللہ خیر کرے۔۔۔۔۔“

عورتیں قیاس آرائیاں کر رہی تھیں کہ نیچے صحن میں جیسے قیامت مچ گئی۔ کسی نے آ کر خبر بد سنادی۔

بیگیاں کی ماں نے دو ہنڑ سینے پر مارا اور بدحواسی کے عالم میں ”ہائے میں مر گئی۔“ کہتے ہوئے باہر دوڑی اور پھر آگے پیچھے ایک دوسرے کو دھکے دیتے پرے ہٹاتے پہلے باہر جانے کی کوشش میں عورتیں گرتے پڑتے باہر دوڑنے لگیں۔ کوئی سینہ پیٹ رہی تھی، کوئی سر پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے بین کر رہی تھیں۔ کوئی صرف چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی۔

لیکن ایک دوسرے کی سننے اور بتانے کا ہوش کسے تھا۔ سب بھاگ رہے تھے۔ مردوں کے ہاتھ میں جو چیز آئی تھی لے بھاگے تھے۔ کچے راستے گھپ اندھیرا، گھنی جھاڑیاں، خاردار جھنڈ بھی کو پھلانگتے دوڑے بھاگے جارہے تھے۔ اس اچانک خبر نے دماغ

سن کر دیئے تھے۔ کسی کو یقین نہ آیا تھا۔ کوئی یقین کر کے جیسے حواس کھور ہا تھا۔ اک قیامت مچی تھی۔

جائے وقوعہ پر کھرام مچا تھا۔ لوگ اونچی آوازوں میں روپیٹ رہے تھے۔۔۔۔۔ باتیں کر رہے تھے۔ حادثے کی روئیداد سنار ہے تھے۔ روشنی کے لیے لائے ہوئے سارے گیس ایک جگہ رکھے ہوئے تھے اور اس کے قریب فضل کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ کھواب کی کرتی بوسکی کی قمیص خون سے بھری تھی۔ سہرے کی سنہری اور معطر پھولوں کی لڑیاں خون میں ڈوبی تھیں۔ چہرے کا وارایسا ہوا تھا کہ سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملی تھی۔ بہنوں بھائیوں نے۔۔۔۔۔ چاچے مامے نوحہ کناں تھے۔ بزرگوں کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں۔۔۔۔۔ کچھ لوگ ٹولیوں میں بٹ کر حملہ آوروں کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔۔۔۔۔ کچھ جوان ان کے تعاقب میں بھاگے تھے۔

عورتوں کی سینہ کوبی اور مردوں کی دھاڑیں مار مار کر رونے کی صداکیں بلند ہو رہی تھیں۔۔۔۔۔ بین ہو رہے تھے باتیں ہو رہی تھیں، کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ۔۔۔۔۔

”ہائے کس نے ظلم کیا۔۔۔۔۔“

”تیرے بدلے میں مر جاتا فضل۔“

”تیرے سوہرے تو تیری راہ دیکھ رہے ہیں بھ فضل۔۔۔۔۔“

”یہ کیا ہو گیا۔“

”ظلم ڈھا دیا کسی نے۔۔۔۔۔“

”او گھرو جوانا۔۔۔۔۔“

”اوئے میر یا بچیا۔۔۔۔۔“

لوگ بلک بلک رو رہے تھے۔ ڈھائیں مار رہے تھے۔ خون سے لت پت لاش سے لپٹ رہے تھے۔۔۔۔۔ خون آلود چہرے پر بوسے دے رہے تھے۔

ہاں

اک

نچو تھی، جو بالکل بے حس و حرکت لاش کے قریب بیٹھی تھی۔ پلکیں جھپکائے بغیر

پوری آنکھیں کھولے اپنے ویر کو تکے جا رہی تھی۔ اسے سکتہ ہو گیا تھا۔ لیکن سب کو فضل کی پڑی تھی۔ اس کی طرف کسی نے دھیان ہی نہ دیا تھا۔

ویر کی لاڈلی۔

ویر کی جان۔

ویر کی چہیتی۔

نچو

پتھر کا بت بن گئی۔ بنارس گپڑی پر بندھا سنہری لڑیوں اور خوشبودار پھولوں والا خون آلود سہرا فضل کے سر کے قریب ہی پڑا تھا۔ وہ سہرے اور چہرے کو مسلسل تکے جا رہی تھی۔

سسرال والے لوگ دوڑتے بھاگتے جائے وقوعہ پر آ پہنچے تو جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔۔۔۔۔

پھوپھی سیکنہ نے کپڑے پھاڑ ڈالے بال فوج لیے پیٹ پیٹ کر سینہ زخمی کر لیا۔

بیگاں کے بھائیوں نے، بہنوں نے دوسرے رشتہ داروں نے تو کھرام مچا دیا۔

کئی دنوں سے بارات کے استقبال کی تیاریاں کرنے والوں نے اس ویران میدان

میں مجمع کر لیا تھا۔۔۔۔۔ باراتی کون تھا۔۔۔۔۔ استقبال کرنے والا کون، کچھ پتہ نہ چل رہا تھا۔۔۔۔۔

حملہ آوروں کے تعاقب کو جانے والے نو جوان ناکام واپس آ گئے۔ اس ویران

اور درختوں سے بھری جگہ میں اندھیرے میں ان کو ڈھونڈا بھی کیسے جاسکتا تھا۔۔۔۔۔ کچھ کیا

جاسکتا تھا۔۔۔۔۔ تو گاؤں پہنچ کر ہی کیا جاسکتا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ فضل کی لاش واپس پھلاں والی لے جائی جائے یا کوٹلی۔ کوٹلی

یہاں سے قریب ہی تھا، بمشکل فرلانگ بھر دور ہوگا۔۔۔۔۔ اکثریت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ابھی کوٹلی

ہی لاش لے جائی جائے، صبح پھلاں والی جنازہ کر کے دفن کیا جائے۔

لاش ایک نیل گاڑی پر رکھی گئی

اور

فضل جو باجے گا بے اور ناچتے گاتے لوگوں کے ساتھ سسرال بیگاں کو بیاہنے

جا رہا تھا، نیل گاڑی پر پڑا خون میں نہایا سینہ پیٹتے بین کرتے اور دھاڑیں مارتے لوگوں کے

ہجوم میں سرال جا پہنچا.....

قیامتیں ہی تو ٹوٹ پڑیں۔

”ہائے فضلے۔“

”وے فضل۔“

”اوے فضلا۔“

”سوہنیا فضلا۔“

”شیر جوانا۔“

پچھاڑیں کھا کھا کر گرنے والے چیخ چیخ کر فضلے کو پکار رہے تھے۔ بیگیاں تو پہلی خبر سنتے ہی کوٹھڑی سے دیوانہ وار باہر نکلی تھی، لیکن دالان میں پہنچتے ہی پچھاڑ کھا کر گری تھی۔ اس کا فضل اب اس کے گھر آ گیا تھا۔ صحن میں چار پائی پر پڑا تھا۔ دولہا بن کر آیا تھا، سہرے باندھ کر آیا تھا، خون کی ندیاں چیر کر آیا تھا۔

لیکن

اسے گرد و پیش کا ہوش ہی کہاں تھا۔

-----○-----

”نصیباں جلئے..... اٹھو ویر کا آخری بار منہ تو دیکھ لے..... کل تو باگ پکڑی تھی، راہ روکی تھی، آج بھی روک لے ویر کی راہ نہ جانے دے اسے روک لے راہ نہ جانے دے اسے..... چہرہ تو دیکھ لے آخری بار..... عمر بھر تڑپے گی..... روئے گی۔ پھر فضلے کو کہاں دیکھے گی..... نجو..... جارہا ہے تیرا ویر، جارہا ہے تیرا بھائی..... جارہا ہے روک لے رستہ نہ جانے دے اسے۔“

ماسی راہونجو کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بین کر رہی تھی۔ لوگ چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ جنازہ اٹھنے کو تیار تھا۔ ساری تیاریاں ہو گئی تھیں۔ شہر والے ماما جی اور ان کے وکیل بیٹے شاید نے تھانہ میں رپورٹ درج کروادی تھی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھی لے گئے تھے۔ اب شام ہونے کو تھی۔ کفن دفن کا انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا۔

کل جس صحن میں فضل دولہا بن کر بیٹھا تھا، آج بے حس و حرکت سفید کفن میں لپٹا پڑا تھا۔ تیاریاں کل بھی زوروں سے ہوئی تھیں۔ آج بھی زوروں سے ہو رہی تھیں۔ کل فضا قہقہوں سے معمور تھی۔ آج آہوں اور آنسوؤں سے بھر پور تھی۔ عود و عنبر کی ماتمی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ میت پر ڈالے گئے بے شمار پھولوں کی مہک بھی سوگوار تھی..... ایسی قیامت کب کہیں ٹوٹی تھی..... جس گھر میں شادیاں بچتے تھے وہاں آہ و بکا اور نالہ و شیون تھا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو مسلسل برس نہ رہی ہو..... اپنے تو اپنے بیگانے بھی اس خونیں حادثے پر اٹکنا رہے۔ اپنے بھائی کی اتنی حسین چہیتی اور لاڈلی بہن..... جو بھائی کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی جس کا پیار سارے پنڈ میں مشہور تھا، جو اس کے بغیر کھانا نہ کھاتی تھی، جو اس کے دم سے دم لیتی تھی۔ آج اکیلی رہ گئی تھی۔ ماں تھی نہ باپ، قریبی چاچا ماما بھی نہ تھا..... بھائی بھی اتنی خاموشی اور ایسے چپ چاپ منہ موڑ گیا تھا۔ ایک ہی وار میں ختم ہو گیا تھا۔

نحو کی حالت جوں کی توں تھی۔ بیگیاں کے گھر سے اسے یہاں اپنے گھر لایا گیا تھا..... اسے ہلایا جلا یا تھا، ہر ممکن کوشش کی گئی تھی لیکن سکتے کی کیفیت نہ ٹوٹی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔

جنازہ اٹھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لوگ کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے آگے بڑھ بڑھ کر آخری دیدار کر رہے تھے اور تاب ضبط نہ لا کر چیخیں مارتے ہوئے پلٹ رہے تھے۔

”وقت جا رہا ہے۔ اب جنازہ اٹھالیں.....“ کسی بزرگ نے آنسوؤں سے تر چہرے سے کہا۔

”ہاں..... اب کس کا انتظار ہے؟“ کسی اور نے کہا۔

”لے چلیں؟ سرہانے کھڑے راجو نے ہچکیوں سے روتے ہوئے کہا۔

”اس نصیبوں جلی..... کرموں والی کو تو بھائی کا چہرہ آخری بار دکھا دو.....“ سینہ پیٹتے ہوئے پھوپھی سیکنہ نے نحو کی طرف اشارہ کیا۔

اور

ماسی راجو نے جوش گریہ سے بے حال ہوتے ہوئے نحو کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ روئے جا رہی تھی اور نحو کو جھنجھوڑے جا رہی تھی۔

”روک لے راستہ ویرکا نہ جانے دے اسے..... دیکھ لے منہ اس کا کہاں سے دیکھے گی پھر..... اٹھ..... اٹھ ماں ماریے۔“

جنازہ اٹھانے کے لیے ڈھیر سارے مرد صحن میں آگئے..... اور پھر زوردار آوازوں میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے چار آدمیوں نے فضل کا جنازہ اٹھایا..... اک کہرام مچ گیا۔

اور

اس کہرام میں نحو چلائی ”کہاں جا رہے ہو ویرا جی..... کیا ہو گیا ہے..... کدھر جا رہے ہو.....“

وہ دیوانہ وار دوڑی اور پلنگ کے پائے کو پکڑ کر چیخ ”چھوڑ دو..... چھوڑ دو میرے

ویرا کو..... ظالمو کہاں لے جا رہے ہو..... کیا ہو گیا ہے اسے..... چھوڑ دو.....“

حویلی کے دروازے کے باہر جنازہ رکھ دیا گیا۔

اور

پھر

جونجو پر بیتی اور اس کا اظہار اس نے جس جس طرح کیا انسان تو انسان درود یوار بھی کانپ اٹھے۔ زمین کا کلیجہ شق ہونے لگا۔ آسمان کا رنگ کالا پڑ گیا۔

وہ پانی بن کر مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ لوگوں کے قابو نہ آ رہی تھی بال کھل کر بکھر گئے تھے..... دوپٹہ جانے کہاں گیا تھا، چیخ چیخ کر گلا بیٹھ گیا تھا.....

مر جائے گی کڑی اسے سنبھالو.....“ چودھری نذر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”مر تو گئی ہے اور کیا مرے گی۔“

”رہ ہی کیا گیا ہے اس کے پاس۔“

”ویرا ہی کو تو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی.....“

”حوصلہ دوا سے۔“

”نہیں جی..... رو لینے دو جی بھر کے.....“

”رات سے سکتے میں تھی۔ اب کھل کر بین کر لینے دو..... ورنہ اس کا دل پھٹ جائے گا.....“

”پیار کر لے فضل کو..... جی بھر کر دیکھ لے اسے..... پھر کہاں دیکھے گی۔“

رو رو کر بے حال ہوتے ہوئے لوگ نحو کے متعلق کہہ سن رہے تھے۔ اسے رتو کی اماں نے بازوؤں میں بھر لیا تھا، لیکن وہ اپنا آپ چھڑا کر جنازے پر گری جا رہی تھی.....

جنازہ اٹھانے ہی نہ دیتی تھی.....

”ویرا!“

”بیگیاں کو کیوں نہیں لایا۔“

”بزدلا۔“

”دشمنوں سے نیٹ بھی نہ سکا۔“

”میں پنوں گی..... میں پنوں گی.....“

اس نے سینے پر ہاتھ مارا..... اور ہاتھ مارتے مارتے بیہوش ہو گئی..... یہی موقع غنیمت تھا جنازہ اٹھالیا گیا..... نجوکار شتے کا ماما اسے ہاتھ پراٹھا کر اندر لے گیا..... پلنگ پر ڈال کر ارد گرد کھڑی عورتوں سے کہا ”اسے ہوش دلاؤ دودھ کے گھونٹ منہ میں ڈالو.....“ عورتیں اس کے پلنگ کے گرد جمع ہو گئیں۔ ماما جنازے کو کندھا دینے کے لیے باہر چلا گیا۔

نجو کی حالت بے حد تشویش ناک تھی۔ تسلی و تشفی تو کوئی کیا دیتا۔ اس کے تو انداز مجنونانہ تھے۔ کبھی بے تحاشا رونے لگتی، کبھی بالکل چپ ہو جاتی، کبھی مٹھیاں بند کر کے دانت پیستے ہوئے شعلہ برساتی آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے بڑبڑانے لگتی۔

غشی تو دوروں کی صورت طاری تھی۔ بار بار غش کھا جاتی۔ دانت بند ہو جاتے مٹھیاں بھنچ جاتیں، جسم اکڑ جاتا، کئی دفعہ دانتوں تلے زبان آ کر لہو لہان ہو گئی۔

فضل کو لوگ سپرد خاک کر کے واپس لوٹ آئے۔ اس کا دکھ تو سبھی کو تھا، لیکن نجو کی حالت سے سبھی متوحش تھے۔ اگر وہ ایسے ہی کرتی رہی تو اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گی۔ یہ سب ہی کا خیال تھا۔

ادھر

بیگاں کو ہوش ہی نہ آ رہا تھا..... دوسری شام اس نے پلکیں چھپکا لیں..... اس کے منہ سے ہائے نکلا..... پھر وہ اٹھ بیٹھی..... اتنی لمبی بیہوشی کے بعد ہوش

میں آئی۔

تو

..... ہوش ہی کھو بیٹھی.....

اس کی نظروں سے پہچان اور شناخت کی قوت چھین چکی تھی۔ وہ سب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس کا ذہنی توازن درہم برہم تھا۔ سوچ سکتی تھی نہ کچھ سمجھ سکتی تھی۔ ہاں اپنے مہندی سے رنگے ہاتھ پاؤں پر نظر پڑی تو دیوانہ وار چیخ پڑی.....

”لہو۔“

”لہو۔“

”لہو۔“

پھر وہ مسلسل ایک ہی لفظ کی رٹ لگائے گئی..... ”لہو، لہو، لہو“ کبھی اٹھ کر باہر بھاگنے لگتی، کبھی چادر میں منہ سر لپیٹ لیتی۔ کبھی قریب بیٹھے لوگوں کو مارنے دوڑتی..... اتنے بڑے اندوہناک حادثے کے ساتھ بیگاں کا دماغی توازن کھو دینا اپنوں کیا بیگانوں کے لیے بھی تکلیف دہ تھا۔

-----○-----



”راجو۔“

”ہاں چاچی۔“

”وے تو تو فضل کی گھوڑی کے ساتھ ساتھ تھا۔ تجھے بھی نہ پتا چلا دشمن کیسے

ٹوٹ پڑا.....“

”کچھ سمجھ نہیں آیا چاچی کیا ہوا..... سب کچھ منٹوں میں ہو گیا.....“

”روشنی نہیں تھی۔“

”گیس والے تو ساتھ ساتھ تھے..... ایک دائیں طرف دوسرا بائیں طرف۔“

”پھر“

”ایک دم گیس گرے..... اندھیرا ہو گیا۔ سب گیسوں کی طرف لپکے ہی تھے کہ

فضل کی چیخ سنائی دی.....“

”ہائے میرے ملا.....“

”شور شرابہ مچ گیا۔ لوگ آگے پیچھے اپنی اپنی دھن میں جا رہے تھے۔ چیخ سن کر

بھاگے۔ گیسوں کے آنے تک فضل کے سانس پورے ہو رہے تھے۔“

”کہا تھا کچھ مرتے دم.....“

”کیا بتاؤں چاچی..... شاید کچھ کہا بھی ہو۔ لیکن اس وقت تو اتنی افراتفری مچی

تھی۔ ہا ہا کار کا شور تھا کہ کچھ پتا ہی نہ چل سکا۔“

”ہائے کس ظالم نے یہ ظلم کیا؟“

”ہاں چاچی..... کوئی کا فردل ہی ہے..... عین شادی کے دن قتل کر دیا۔“

”پتہ ہے راجو۔“

”کیا؟“

”لوگ سکھیروں کا نام لے رہے ہیں۔“

”نہیں چاچی..... ان کے ساتھ تو فضل نے صلح صفائی کر لی تھی..... بارات

والے دن تینوں بھائی آئے تھے۔“

”ہاں یہ تو سبھی کہہ رہے ہیں.....“

”پھر..... وہ تو فضل سے گلے مل کر مبارک باد دے رہے تھے۔“

”ہوں۔“

”ویسے بھی دیکھا جائے نا چاچا..... تو مارنے کی باری فضل کی تھی۔ ان لوگوں

سے تو فضل نے بدلہ لینا تھا۔ اپنے باپ کے خون کا۔“

”ہاں ملک رحمت علی کے قاتلوں کو کون نہیں جانتا۔“

”لیکن خدا بخشنے فضل کو اس نے دشمنی کی بنیاد ہی ختم کر دی تھی۔ دوستی کا ہاتھ

بڑھایا تھا سکھیروں کی طرف۔“

”پھر کس کا کام ہے یہ؟“

”اللہ جانے۔“

”پنڈ میں تو اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔“

”کیا خبر چاچی۔“

”ہائے بیچارہ فضل..... دل کی دل ہی میں لے گیا۔“

راجو اور رتو کی اماں اپنے دالان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ راجو ان دنوں

بہت پریشان تھا۔ نجو کی حالت اس سے دیکھی سنی نہ جاتی تھی۔ لیکن کچھ کر بھی تو نہ سکتا تھا۔

بیچارہ رتو کے ہاں آ بیٹھتا..... رتو یا اس کی اماں سے باتوں باتوں میں نجو کے بارے میں

پوچھ لیتا.....

آج بھی وہ رتو کے پاس آیا تھا لیکن رتو نجو کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ سے

زیادہ وقت نجو کے پاس گزارتی تھی۔ نجو کے درد کا اس کے پاس مداوا تو نہیں تھا..... نہ ہی نجو

اس کے ساتھ باتیں کرتی تھی..... وہ تو بالکل گم صم رہتی تھی۔

پھر بھی  
سہیلی تو تھی۔

رتو کی اماں زمین سے آئی کپاس کی گانٹھ کھول کر بیٹھ گئی۔ راجو سر جھکائے  
چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اسے رتو کے آنے کا انتظار تھا۔

”دودھ پئے گا راجو..... کاڑھنی میں گرم گرم ہے پی لے۔“

”نہ چاچی۔ دل نہیں کرتا.....“

”تجھ پر بھی ترس آتا ہے پترا۔ زندگی نے مہلت ہی نہ دی جو فضل نجو کے ساتھ

تیری بات ہی پکی کر دیتا.....“

راجو چند لمحے چپ رہا۔

پھر

آہستگی سے بولا ”وہ تو ٹھیک ہے چاچی..... پر جج والے دن فضل نے میری بانہہ

پکڑ کر سب میں کہا تھا راجو میری بانہہ ہے۔“

”ہاں یہ تو میں نے بھی سنا تھا۔“

”یہ باتیں تو بعد کی ہیں چاچی۔ فکر تو مجھے نجو کی ہے۔ وہ تو دیر کے غم میں جان

دے دے گی۔“

”ہائے پترا..... تجھے کیا پتہ کتنا پیار تھا بھائی بہن میں.....“

”ہاں۔“

”اس کا تو باپ بھی وہی تھا بھائی بھی وہی..... لاڈوں سے پالی تھی فضل نے.....

اچانک ہی دغا دے گیا۔ بیچاری کیا سنبھلے گی۔“

”اس کو تسلی دیا کرو چاچی۔“

”رتو روزانہ اسی لیے تو جاتی ہے..... اس کے ساتھ بھی تو زیادہ بولتی چلتی نہیں۔

بس سارا وقت فضل کے دالان میں بیٹھی رہتی ہے۔ اس کے خون والے کپڑے اور سہرا دیوار

پر لٹکا رکھا ہے..... اسے ہی تکتی رہتی ہے.....“

”کہیں..... کہیں پاگل نہ ہو جائے۔“

”صد مہ اتنا ہے پترا..... بیگاں کو نہیں دیکھتے..... بالکل جھلی ہو گئی ہے۔“

”یہی تو مجھے ڈر ہے کہیں نجو.....“

بات ادھوری ہی رہ گئی۔ رتو اور شادو آ گئی تھیں..... دونوں کے چہرے اداس  
اداس اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی تھیں.....

”کیا حال ہے نجو کا۔“ رتو کی اماں نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

”ہائے اماں کیا ہوگا نجو کا۔“ رتو رو پڑی۔ شادو بھی آنکھیں پلو سے پوچھنے لگی۔

”ہوش میں تو ہوتی ہے نا۔“ جلدی سے راجو نے پوچھا..... وہ بے قرار ہو گیا۔

”پتہ نہیں بھاراجو.....“ رتو آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی ”اسے تو کسی آئے کا پتہ

ہے نہ گئے کا۔ اتنے دن ہو گئے بس بھ فضل کے دالان میں ہی بیٹھی رہتی ہے اور اس کے

خون والے کپڑے اور سہرے کو تکتی رہتی ہے.....“

”تمہارے ساتھ باتیں نہیں کرتی۔“

”کبھی کبھی کرتی ہے..... کھانا بھی زبردستی منہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ اس کا کیا بنے

گا.....“

”یہی غم مجھے بھی ہے بھین رتو۔“

”پہلی ہو گئی ہے..... ہمت طاقت تو رہی نہیں۔“ شادو بولی ”آج پلنگ سے

اتری تو چکر آ گیا۔“

”کھاتی پتی جو کچھ نہیں دن رات یا روتی رہتی ہے یا سوچوں میں ڈوبی رہتی

ہے..... کمزور تو ہونا ہی ہے۔“ رتو بولی۔

”ہاں دھیے..... وہ بھی کیا کرے.....“ رتو کی ماں نے گہری سانس لی۔

”صبر آتے آتے ہی آتا ہے۔ تھوڑی تو نہیں ہوئی اس کے ساتھ۔“

”اماں نجو کیسے جئے گی۔“ رتو پھر رونے لگی۔

راجو نے تڑپ کر رتو کو دیکھا۔ بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا ”رتو بھین.....“

”ہاں بھا۔“ وہ بولی

”میں میں راجو نے بالکل آہستگی سے کہا۔

”پر اماں“ رتو نے کہا ”نحو تو گم صم ہی رہتی ہے۔“ اس کے آگے پیچھے ہونے سے فائدہ۔“

”تو نہیں جانتی کڑیے..... لوگ بڑے چھل فریب کرنے والے ہوتے ہیں..... اللہ ہی حافظ ہے بیچاری کا.....“

راجواندر اندر ہی تڑپ گیا..... حالات نے اچانک ہی جو نیا رخ لیا تھا وہ بیچارہ بکھر بکھر جا رہا تھا۔ باقاعدہ منگنی ہو گئی ہوتی تو اس کا حق بھی بنتا تھا کہ نحو کے مفاد کے لیے عملی قدم اٹھائے۔

لیکن

اب

اب وہ صرف تڑپ سکتا تھا۔ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

-----○-----

رتو اس کا مطلب سمجھ گئی..... اسی آہستگی سے بولی ”گھر سے تو وہ نکلتی ہی نہیں..... آج فجر کی بانگ ویلے وہ فضل کی قبر پر گئی تھی..... ماسی جیناں نے اسے کہا تھا قبر پر جایا کرو تو قرار آ جائے گا.....“

”کل بھی جائے گی۔“

”پتہ نہیں۔ ماسی جیناں تو روز ہی اسے کہتی ہے۔ مائی راہو نے بھی کہا تھا۔ آج تو گئی تھی..... پتہ نہیں کل جائے گی یا نہیں..... رب اسے شاید قبر پر جانے سے ہی صبر دے دے.....“

”رب کرے۔“

”بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ کلیجہ کتنا ہے اسے تک تک کر.....“

”اب اس کا والی وارث کون ہوگا۔“ شادو نے اک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”ماسی راہو۔“ رتو بولی۔

رتو کی اماں نے دونوں کی باتیں سن کر کہا..... ”ماسی راہو تو اس کی رکھوالی ہے.....“

”دور پار کے کئی رشتہ دار ہیں..... دیکھا نہیں سبھی ڈیرہ ڈال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”ہاں آج بیس بائیس دن تو ہو گئے ہیں..... سب یہیں بیٹھے ہیں.....“

”مجھے تو لگتا ہے نحو سے ہمدردی کی خاطر نہیں اس کے دھن دولت کی خاطر یہ

لوگ بیٹھے ہیں.....“ رتو کی اماں نے جہان دیدہ انداز میں کہا۔

”ہر کوئی وارث بننے کی کوشش کرے گا نحو کا.....“

”ہاں چاچی مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ فضل کی بیٹھک میں یہ لوگ زمینوں اور اثاثے

ہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔“

”وہ جو کالی سونے کے لونگ والی فضل کی ماں کی رشتے کی بھر جائی ہے نا“ رتو کی

اماں نے رتو سے کہا۔

”ہاں.....“ شادو بولی ”چالا کو سی۔“

”بڑی زہر لگتی ہے مجھے۔“ رتو نے کہا

”وہ بڑی آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے نحو کے.....“ رتو کی اماں بولی۔

علما چپ ہو گیا تھا۔ تاج نے اس سے بھی بڑی دھمکی دی تھی۔۔۔۔۔  
 ”تیری بیٹی اٹھوا دوں گا۔ ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا تو۔۔۔۔۔“

علما جانتا تھا کہ یہ لوگ جو بات منہ سے نکالتے ہیں اسے عملی جامہ پہنا لے سے گریہ کرتے ہیں نہ دیر لگاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ان کو پوچھنے والا بھی کون ہوتا ہے۔ غریب کی ان کے سامنے حیثیت ہی کیا ہے اور تاج سکھیرے کے تو ہاتھ اوروں سے کچھ زیادہ ہی لمبے تھے۔  
 علما سب کچھ جانتے ہوئے بھی چپ رہتا تھا۔ کبھی کبھی جب تاج کا موڈ اچھا ہوتا تو اسے شفقت سے سمجھانے کی کوشش ضرور کرتا۔

لیکن

جب وہ غصے میں ہوتا تو کچھ کہنے کی اسے مجال نہ ہوتی۔  
 علمے دل کا نرم تھا۔۔۔۔۔ گل پروشے سے بھی اسے ہمدردی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا گل کے منہ سے کوئی ایسی بات نکلے جو تاج کے عتاب کو دعوت دے۔ بعید نہیں تھا۔۔۔۔۔ یہ بات تاج سن لیتا تو گل پروشے کو شوٹ کر دیتا۔

شوٹ کرنے کے علاوہ بھی اسے غائب کروانے کے گرآتے تھے۔ گل پروشے لاکھ عزم و ارادے کی پکی سہی۔۔۔۔۔ تاج کے سامنے اس کے تنکے کی سی حیثیت تھی۔  
 فضل کے قتل کی خبر یہاں بھی پہنچی تھی۔ علمے کو تو اتنا دکھ ہوا تھا کہ دو تین دن اس سے روٹی کا نوالہ ہی حلق سے نہ نیچے اتارا جاسکا۔

گل پروشے کو بھی خبر ملی تھی۔ اسے شک گزرا تھا لیکن شک کو تقویت اس دن ملی جس دن اس نے پردے کے پیچھے سے تاج کو ڈھیر سارے نوٹ ان بد معاشوں کو دیتے دیکھا تھا۔

تاج نے دونوں کو شاباش دیتے ہوئے کہا تھا ”تم نے بڑی صفائی سے کام تمام کر دیا ملک کا۔۔۔۔۔ کسی کو ہم پر شک بھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ میں اسی لیے تو اس کی بارات میں گیا تھا۔ گاؤں میں اب کوئی بھی ہم پر شک نہیں کر سکتا۔“

گل پروشے سر تا پا کانپ گئی تھی۔  
 ملک فضل کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا، لیکن اک بے قصور نوجوان کی عین شادی

”بی بی۔“ علمے نے ہر اسماں ہو کر کہا۔

”کیوں۔“ گل پروشے صوفے پر بیٹھی تھی۔ تیکھے لہجے میں بولی۔

”آئندہ یہ بات منہ سے نہ نکالے گا۔“ علما انتہائی دھیمی آواز میں بولا۔۔۔۔۔

”ام حق بات کرے گا کہے گا۔۔۔۔۔ تمہارا چودھری ظالم آدمی ہے۔ شادی کا دن ملک

کو قتل کروایا۔ امارے پاس ثبوت ہے۔“

”بی بی۔ آپ تاج محمد سکھیرے کی قوت اور طاقت کو نہیں جانتیں۔“

”کیا ام جھوٹ بولتا ہے۔ تم نے بھی تو دیکھا۔۔۔۔۔ ان دو بد معاش آدمی کو سردار

نے کتنا پیسہ دیا۔۔۔۔۔“

علما چپ ہو گیا۔

”کس بات کا پیسہ دیا سردار نے؟“

علمے نے اک گہری سرد آہ بھری اور سر اٹھا کر گل پروشے کو دیکھا۔ وہ سب کچھ

جانتا تھا۔ اسے تاج کے منصوبوں کا بھی علم تھا۔۔۔۔۔ اس نے دو چھٹے ہوئے بد معاشوں کی

خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ وہ سکھیروں کا نسل در نسل ملازم تھا۔ اس کا

سارا خاندان سکھیروں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ بذات خود سفاک تھا نہ ظالم۔۔۔۔۔ لیکن مالکوں

کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔

دو سال پہلے اس نے ایک معمولی سی بات پر تاج سکھیرے کی مخالفت کی تھی تو

تاج نے اس پر عتاب توڑنے کی دھمکی دی تھی۔۔۔۔۔ ”تو میرا ذاتی ملازم ہے علمے۔۔۔۔۔ میرے

سارے راز تیرے سینے میں ہیں۔ یہ راز سینے ہی میں دفن رہیں جس دن یہ راز سینے سے باہر

آئے یاد رکھ لے تیرا سینہ باقی نہ رہے گا۔۔۔۔۔“

کے دن موت..... وہ سوچ سوچ کر ہی نڈھال ہونے لگی تھی..... اور

جب علمے سے باتوں ہی باتوں میں اسے پتہ چلا تھا کہ اک لڑکی کے چکر میں تاج نے سب کچھ کیا ہے تو وہ بھڑک گئی..... تاج سے اسے نفرت محسوس ہوئی۔ اس سے گھن آنے لگی..... منصوبے تو اس کے من میں اپنی ہر ناکامی پر بنتے ہی رہتے تھے، لیکن اب ان منصوبوں نے کوئی اور ہی صورت اختیار کر لی.....

ظلم و تشدد جبر و استبداد کی سزا ملنی چاہیے۔  
وہ اب صرف یہی سوچتی رہتی۔

علمے نے سنجیدگی سے اس معاملے میں زبان بند رکھنے کا مشورہ دیا..... وہ جوشیلی آواز میں بولی ”ام کب تک اس کا ظلم برداشت کرے گا۔ یہ ام کو پوچھتا بھی نہیں..... ام اس کا بیوی ہے۔ یہ اور اور لڑکی کے پیچھے دوڑتا ہے۔ ام اس کا یہ راز سب کو بتائے گا.....“

”بی بی۔“ علما بولا۔ تاج محمد سکھیر اپنے راز فاش ہونے سے پہلے فاش کرنے والے کو ختم کر دیتا ہے..... آپ کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتی ہیں..... وہ آپ کو منٹوں میں ختم کروادے گا.....“

گل کی آنکھیں پھیل گئیں..... پھر ان آنکھوں میں نمی تیر گئی..... گلوگیر آواز میں بولی ”تو پھرام کیا کرے علمے۔“

”چپ چاپ زندگی گزارتی رہیے..... آپ کی بھلائی اور بہتری اسی میں ہے.....“

”لیکن.....“

”بی بی..... آپ یہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتیں..... کیا سوات واپس جانا پسند کریں گی؟“

”نہیں، نہیں.....“

”پھر..... اور کہاں جائیں گی..... اور جب کہیں جائیں سکتیں تو چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں.....“

”ظلم کا تماشا.....“

”مجبوری سمجھئے..... آپ نے اس سلسلے میں کوئی لفظ بھی چودھری کے سامنے منہ سے نکالا تو آپ کو ختم کرانے میں دیر نہیں کرے گا.....“

گل چپ ہو گئی..... اس کے ذہن میں منصوبے بن کر بگڑ رہے تھے۔ بگڑ بگڑ کر بن رہے تھے۔ بے چینی سی لگی تھی۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو دلہن بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ جس کے خواب تکمیل کی حدوں سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے تھے..... اور

جب اسے علمے سے باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ فضل کی بہن دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے..... اس کا اور کوئی بھی نہیں رہا تو اسے ان دیکھی اس لڑکی سے بھی بے پناہ ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

اسے یوں لگا جیسے فضل کی بہن نہیں اک اور گل پروشے دنیا میں یک و تنہا مصائب و آلام کے سمندر میں غوطے کھانے کے لیے رہ گئی ہے۔

گل پروشے بے تابی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ علما قالین پر سر جھکائے بیٹھا رہا..... پھر گل پروشے کمرے سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد تاج آ گیا۔

علما اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے بڑھ کر تاج کے ہاتھ سے اوور کوٹ پکڑ لیا۔ ”کیا کر رہے تھے علمے۔“ اس نے یونہی پوچھا۔

”کچھ نہیں چودھری صاحب۔ کمبل کی بکلی مارے بیٹھا تھا۔ جی نہیں چاہ رہا تھا اٹھنے کو..... آپ ہو آئے پنڈ۔“

”ہاں۔“

”سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔“

”اوہ..... بالکل ٹھیک۔“

تاج مسکراتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھا..... جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا ”سنا ہے فضل کی بہن نے فضل کے قتل کی چھان بین سے منع کر دیا ہے۔“

”چھان بین ہو رہی تھی۔“

”ہاں ان کے کوئی رشتہ دار شہر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے رپورٹ درج کروائی

تھی۔ پولیس چھاپے مار رہی تھی۔“  
”اچھا؟“

”ہاں..... اب اس کی بہن نے معاملہ ختم کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ان کا کوئی دشمن نہیں۔“

علم نے تاج کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ چمک بلاشبہ شیطانی تھی۔

”شکر ہے۔“ تاج بولا اس کی بہن نے یہ بیان دے کر کم از کم ہمارے خاندان کو لوگوں کا موضوع بننے سے بچا لیا ہے۔ سب لوگ سکھیروں اور ملکوں کی دوستی پر یقین کرنے لگے ہیں۔“

علم نے آہستگی سے سر ہلایا۔ ”اچھا ہی کیا اس نے بچاری اکیلی کس کس سے بنتی۔“  
”جا علمے چائے بنوالا.....“ سردی بہت ہے.....“ تاج نے جلدی سے بات بدل دی۔

علم کوٹ اٹھائے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔  
تاج صوفے میں تساہل سے پڑ کر سگریٹ کے کش لینے لگا..... وہ گاؤں تقریباً روزانہ ہی جا رہا تھا..... جانے پس پردہ کئی باتیں تھیں.....

ایک تو وہ لوگوں سے مل کر یہ تاثر دیتا رہتا تھا کہ فضل کی موت کا اسے بہت صدمہ ہے۔ کئی من گھڑت باتیں بھی بتاتا رہتا تھا کہ فضل جب بھی شہر جاتا تھا اس سے مل کر ضرور آتا تھا۔

دوسری لگن گاؤں جانے کی یہ بھی تھی کہ دل نجو سے ہار بیٹھا تھا۔ فضل کے گھوڑے کی باگ پکڑنے والی شوخیاں کرتی خوبصورت ناراس کے دل و دماغ پر نشہ بن کر چھا گئی تھی۔  
ماتم پرسی کے حیلے وہ فضل کے گھر بھی گیا تھا۔ لیکن نجو کا دیدار نصیب نہ ہوا تھا.....  
آج وہ نجو سے ملنے اور اسے دیکھنے کے دل ہی دل میں منصوبے بنانے لگا۔

”نجو۔ خدا کے لیے اپنے آپ پر رحم کرو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ خدا کی یہی رضا تھی۔ اس طرح کرے گی تو کیا ہو جائے گا۔ فضل اب واپس تو نہیں آ سکتا..... اس کی مغفرت کے لیے دعا کیا کر۔ اس طرح تو تو خود بھی ختم ہو جائے گی۔“

قبر کے سرہانے دوزانو جھکے راجو نے نجو سے کہا۔ جو قبر کے پہلو میں بیٹھی اپنا ہاتھ کچی سرخ مٹی پر آہستہ آہستہ پھیر رہی تھی۔ کئی دفعہ اس نے اپنا سر بھی قبر پر یوں رکھ دیا تھا جیسے مٹی کے ڈھیر پر نہیں فضل کی شفقتوں بھرے سینے پر رکھ دیا ہو۔

راجو درد بھرے انداز میں نجو کو صبر کی تلقین کر رہا تھا۔ نجو کی آنکھیں ویران تھیں۔ بال سوکھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے مٹی پر بیٹھنے سے مٹا لے ہو رہے تھے۔ وہ بالکل لٹی پٹی نظر آ رہی تھی۔

راجو کتنی دیر سے اس کے قریب بیٹھا تسلی دے رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔  
نجو بڑی باقاعدگی سے قبر پر جاتی تھی۔ وہ کئی دفعہ تو اذان سے پہلے ہی چلی جاتی تھی۔ دن اور رات کا اسے ہوش ہی کب تھا کہ امتیاز کرتی۔ جب دل گھبراتا، قبر پہ آ جاتی۔  
پہروں بیٹھی رہتی۔ کبھی آنسو بہاتے بہاتے ہچکیاں بندھ جاتیں۔ کبھی چپ چاپ بیٹھی تازہ قبر کی سرخ مٹی کو گھورتی۔ کبھی مرجھائے ہوئے پھول مسلتی۔ کبھی تازہ پھول بکھیرتی۔ وہ فضل سے باتیں بھی کرتی۔ یہاں آ کر اسے تسکین ملتی تھیں۔ یوں لگتا تھا بھائی بچھڑا نہیں جان بوجھ کر منہ پھیر گیا ہے۔ اسے ستانے سے مزہ لے رہا ہے۔ جبھی تو وہ قبر سے نکل نہیں آتا۔

کبھی وہ قبر کی مٹی کو چوم لیتی، دل ہی دل میں عہد کرتی اور فضل کے دشمنوں سے بدلہ لینے کا منصوبہ بناتی.....

صدے نے اس کے دل و دماغ پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا۔ وہ کوئی بات دلجمعی سے

نہ سوچ سکتی تھی نہ اس پر عمل کر سکتی تھی۔

کئی دنوں سے راجو بھی قبر پر آ رہا تھا۔ گھر پر تو نجو سے ملنا مشکل تھا۔ اس کے بغیر وہ ماہی بے آب تھی۔

نجو پہلے دن تو اسے دیکھ کر بے اختیار ہو گئی تھی۔ اس کے گلے لگ کر اس بے اختیاری سے روئی تھی کہ راجو کے صبر و ضبط کے بند بھی ٹوٹ گئے تھے۔ اسے چپ کرانے کی بجائے وہ خود بھی بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔

”راجو..... میرا ویر کہاں گیا..... میں اسے کہاں سے لاؤں کیسے ڈھونڈوں..... میرا ویر..... میرا سہریاں والا ویر.....“

راجو کے بازوؤں میں ٹڈھال ہو ہو کر وہ گرتے ہوئے فریاد کرتی رہی تھی۔

راجو روز ہی اسے تسلیاں دیتا۔

لیکن

نجو کے من میں تو زخم ہی زخم تھے۔ سوچیں ہی سوچیں تھیں۔ تسلیوں سے تسلی تو نہ ہوتی تھی۔ کبھی وہ چپ چاپ اس کی تسلیوں کے سامنے سر جھکا دیتی، کبھی ایک آدھ بات کہہ دیتی۔ آج بھی وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

”نجو..... اپنا دھیان کسی اور طرف لگایا کر..... رو رو کر تڑپ تڑپ کر تو کیا کرے گی.....“

نجو نے اپنی ویران آنکھوں سے راجو کو دیکھا اور پھر قبر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”راجو..... میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔“

راجو اس کی بات نہ سمجھا، جلدی سے بولا ”مر جائے گی۔“

”نہیں..... میں ابھی مروں گی نہیں۔ ابھی مروں گی نہیں۔ میرا ویر میرے سر پر

بہت سا قرض چھوڑ گیا ہے۔“

”قرض“ راجو نے حیرانگی سے نجو کو دیکھا۔

”ہاں۔“

”تو..... تو۔“

”میں نے وہ قرض چکانا ہے..... اور جب تک قرض نہ چکا لوں گی..... مروں گی نہیں۔“

”نجو تیری باتیں مجھے سمجھ نہیں آ رہیں.....“

نجو نے اسی انداز میں مٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”تو سمجھے گا نہیں راجو..... سمجھے گا تو وہ جس کے من کو لگی ہے.....“

”مجھے تیرے دکھ درد کا احساس ہے نجو۔ یہ نہ سوچ کہ میں تیرے درد کو سمجھتا نہیں..... تجھے سمجھاتا تو اس لیے ہوں کہ اب لاکھ روئے لاکھ تڑپے..... فضل واپس نہیں آ سکتا.....“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

”پھر۔“

”پھر..... چھوڑ راجو..... تو نہیں سمجھ سکتا۔“

”تو سمجھا دے۔ میں تیرے دکھ سکھ کا سا نجھی ہوں۔“

”میرا ویر قتل ہوا ہے راجو۔“

”ہاں۔“

”جب تک میں اس کے قاتل سے بدلہ نہ لوں گی..... میں جی سکوں گی نہ مر

سکوں گی..... مجھے اپنے ویر کے خون میں ڈوبے سہرے کی قسم..... میں بدلہ لوں گی۔“

”لیکن..... لیکن بدلہ کس سے لے گی۔“

”اس کے قاتل سے۔“

”پولیس کی تفتیش تو تو نے بند کرادی۔ سب کو کہہ دیا کہ تیرے ویر کا کوئی دشمن نہیں،

قاتل ملے گا کیسے.....“

”ہونہہ“ وہ تلخی سے بولی..... پھر ایک گہری سانس لے کر سر قبر پر رکھ دیا۔

راجو کئی لمحے اسے تکتا رہا.....

”نجو“

”نجو“

”نحو“

اس نے بار بار بلایا تو نحو نے سراٹھایا..... اس کے بالوں میں مٹی لگ گئی تھی..... مٹی جھاڑنے کی نحو نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

”راجو“ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے راجو کو دیکھا۔

”ہاں۔“

”تو روز یہاں نہ آیا کر۔“

”کیوں؟“

”کیا لینے آتا ہے یہاں۔“

”تجھے تسلی دینے۔“

”میری تسلی باتوں سے نہیں ہوتی۔“

راجو چپ ہو گیا۔

”تو یہاں نہ آیا کر راجو۔“ نحو نے مستحکم لہجے میں کہا۔

”تیری یہی مرضی ہے تو میں نہیں آیا کروں گا۔“ راجو کی آواز حلق ہی میں

گھٹ گئی.....

”تو یہاں آتا رہا نا..... تو..... تو میں.....“

”کہہ دے کیا کہنا ہے نحو.....“

”راجو میں نے اپنے دیر کا قرضہ چکانا ہے تو میری راہ میں آ گیا۔ تو یہ قرضہ

اترے گا نہیں..... میں نے اپنے دیر کے خون کی قسم کھائی ہے۔“

”اس کے سہرے اور خون میں ڈوبے کپڑوں کو دیکھ کر عہد کیا ہے..... کہ.....“ وہ

بڑے جوشیلے لہجے میں مٹھیاں بند کر کے بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئی۔

راجو جلدی سے بولا..... ”نحو..... چپ کیوں ہو گئی ہو..... بتاؤ نا۔ کیا کہہ رہی

تھیں.....“

”کچھ نہیں.....“ وہ اپنی چادر جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھ سے چھپاتی ہو باتیں۔“ راجو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”راجو تم چلے جاؤ۔“

”نحو۔“

”میں نے کہا ہے راجو تم چلے جاؤ..... تم مجھے میری راہ سے بھٹکا دو گے۔“

”کیا کہہ رہی ہو نحو.....“

نحو نے اس کے سراپا پر ایک گہری نگاہ ڈالی..... پھر چادر اچھی طرح سے لپیٹتے

ہوئے پلٹی.....

راجو قدم بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا..... ”کھل کر کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔“ نحو

نے دوسری طرف سے راستہ بناتے ہوئے کہا ”مجھے دیر ہو رہی ہے میری راہ نہ روکو راجو.....

میں نے آج کوٹلی بھی جانا ہے۔“

”کیوں۔“

”وہاں میرے دیر کی جھلی کملی وہٹی (دلہن) ہے۔ بیگاں..... اسے دیکھنے.....“

راجو نے اک ٹھنڈی آہ بھری ”پیار کی لاج رکھ لی بیگاں نے ہوش کھو کر۔“

”مجھ سے تو وہی اچھی ہے..... مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہوگی نا فضل سے..... میں

کیوں جھلی نہ ہو گئی راجو.....“

راجو دکھ بھری نظروں سے اسے تک کر رہ گیا۔

نحو خود ہی بولی ”بیگاں نے بھی اپنا بار مجھ پر ڈال دیا ہے۔“

راجو نحو کی باتوں سے کچھ نہ سمجھ سکا..... وہ یہی سوچ کر چپ ہو گیا کہ نحو کے دل و

دماغ پر اس صدمے نے بے حد برا اثر کیا ہے اسی لیے بے سرو پا باتیں کر رہی ہے۔

نحو آہستہ آہستہ قبرستان سے باہر آ گئی۔ راجو اس کے ساتھ ساتھ باہر آیا..... پھر

وہ اپنے گھر کی طرف جانے والے رستے پر ہوئی۔ راجو قبرستان کی کچی دیوار کے

ساتھ لگا کھڑا اسے جاتے تکتا رہا۔



پو پھٹ رہی تھی۔ مشرقی گوشہ آسمان پر نورانی سا اجالا تھا۔ باقی آسمان پر ابھی دھندلے ستارے ٹٹمار رہے تھے۔ نجو بستر سے نکلی اور گرم چادر لپیٹ کر صحن میں نکل آئی۔ سردی کا زور اب ٹوٹا جا رہا تھا۔ گاؤں کے باسی تو اب اس سردی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن رات کا یہ آخری پہرہ خاصا ٹھنڈا ہوتا تھا۔

نجو نے نماز پڑھی اور دیر تک مصلے پر بیٹھی دعا مانگتی رہی۔ وہ بھائی کی مغفرت کی دعا مانگ رہی تھی یا اپنے عہد کے استحکام کی خدا سے دعا گو تھی۔ یہ وہ جانتی تھی۔

فضل کا چالیسواں ہو گیا تھا۔ تعزیت کو آئے لوگ واپس جا چکے تھے۔ سب کی زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ وہی ماسی راہو اور اس کا گڑ گڑاتا حقہ تھا۔ وہی بکو تھا، وہی جیراں اور وہی اس کی تینوں بیٹیوں کے حویلی کے مشترکہ کام۔ کبھی کبھی کوئی افسوس کرنے آ جاتا..... تو فضل کی باتیں ہونے لگتیں۔ ہاں نجو کی زندگی معمول پر نہیں آئی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، بھائی کی جدائی کا تیر زیادہ ہی کلیجے کے پار ہو رہا تھا۔ بیگاں کی ہوش سے بیگانگی بھی سینے کا چر کہ تھی۔ نجو کسی کسی دن اسے دیکھنے چلی جاتی تھی۔ وہ کل بھی کوٹلی گئی تھی۔

بیگاں کے گلے لگ کر وہ چیخ چیخ کر روئی تھی۔  
”بیگاں..... مجھے دیکھ بیگاں۔ میں فضل کی بھین ہوں۔ فضل تو تجھے دعا دے گیا۔ میں تو تیرے سامنے ہوں۔ مجھ سے باتیں کر مجھے پہچان۔ مجھے بتا..... میرے ویر کی باتیں مجھے بتا.....“

لیکن

نجو کی کسی بات کا بیگاں پر اثر نہ ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی۔

مسلل ہاتھوں کو گھورتی رہتی تھی۔

ہاتھوں کی مہندی کا رنگ اب اڑ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہاتھوں کو تکتی رہتی تھی اور تکتے تکتے ”لہو، لہو، لہو“ چیخنے لگتی تھی۔ اس سے زیادہ اسے جیسے کچھ کہنا ہی نہ آتا تھا۔ ماں باپ بھائی بہن سبھی تھک ہارے تھے، نجو نے کوشش کی تھی، لیکن بیگاں کے ذہن پر صدمے نے ایسا وار کیا تھا کہ ٹھکانے پہ آتا ہی نہ تھا۔

نجو کو ایک طرف بھائی کی جدائی تڑپاتی تھی۔ دوسری طرف بیگاں کی ہوش و خرد سے بیگانگی..... بیگاں نے پیار میں یوں لٹ کر نجو کے دل میں جو مقام بنالیا تھا، وہ عقیدتوں کا مرکز تھا۔

بیگاں پر جس ظالم نے ایسا ظلم ڈھایا تھا، اس کو نجو معاف نہیں کر سکتی تھی..... نماز سے فارغ ہو کر وہ مصلے سے اٹھی۔ مصلیٰ تہ کر کے ایک طرف رکھا۔ پھر مٹی کے گھرے کے اوپر ڈالے پھولوں کے ہار تھالی میں رکھے اور صحن پار کر کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

دن ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ستاروں کی چمک ماند پڑ چکی تھی، آسمان کی سیاہیاں نیلا ہٹوں میں بدل رہی تھیں۔ گلیوں میں اکا دکا بزرگ نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں رکھوالی کو سونے والے ابھی کھد ر کے لال لحاف اوڑھے پڑے تھے۔ قریب بندھے ڈھور ڈنگروں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں ان کی خفیف سی حرکت سے بج اٹھتی تھیں۔ کھیتوں میں حدنگاہ تک گندم کی سراٹھاتی فصل تھی۔ دن کی روشنی تا حال نہیں پھیلی تھی۔ اس لیے سبزہ کچھ سیاہی مائل نظر آ رہا تھا۔ پرندے ابھی درختوں کی شاخوں پر ہی پھڑ پھڑا رہے تھے۔

نجو پھولوں کی تھالی اٹھائے چادر کی بکل مارے قبرستان کی طرف جا رہی تھی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ یہاں آتی ضرور تھی۔ کبھی تو فجر کی اذان سے پہلے ہی آ جاتی، کبھی نماز پڑھ کر۔

وہ کچے راستے سے ہوتی پگڈنڈی پر آئی اور پھر پنڈ کے اس طویل و عریض شہر خموشاں میں داخل ہو گئی۔ قبریں ہی قبریں تھیں، برسوں پرانی بھی، نئی بھی..... ٹوٹی پھوٹی اور خاردار جھاڑیوں سے چھپی بھی۔ کئی جگہ اینٹوں سے بنی قبریں تھیں۔ سرہانے کتبے لگے

تھے۔ کئی بالکل بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے کھلے دہانے خوفناک لگتے تھے۔

لیکن

نحو کے من میں تو خوف و ہراس تھا ہی نہیں۔ وہ تو یوں کھنچی چلی جا رہی تھی جیسے مقناطیسی کشش ہو۔

تازہ مٹی کے ڈھیر کو اس نے دور سے دیکھا۔ ایک لمحہ کو وہ ٹھٹکی، کوئی قبر کے سرہانے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”راجو!“ نحو کے لبوں سے نکلا..... پھر اس نے اک گہری آہ بھری اور آہستہ آہستہ چلتے قبر تک آ پہنچی..... اس نے دیکھا وہ راجو نہیں تھا۔

وہ

وہ

تاج سکھیرا تھا.....

تاج

سکھیرا

نحو کے اندر ہی اندر جیسے اک خوفناک زلزلہ آ گیا۔ اس سے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ مٹی کے اس ڈھیر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اس کی کنپٹیاں پھڑ پھڑانے لگیں..... اس کے دماغ میں آتشیں غبار بھرنے لگا۔ پھولوں کی تھالی گر گئی تھی..... نحو مٹی میں مٹھیاں یوں بھر رہی تھی جیسے فضل کو جھنجھوڑ رہی ہو.....

”تم ملک فضل کی بہن ہونا“ تاج نے آہستگی سے کہا۔

نحو نے قبر پر سر رکھ دیا..... اور اس کے منہ سے بڑے ہی جذباتی انداز میں نکلا۔

”ویرا..... ویرا..... ویرا“

تاج بھی قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔

”تمہارا نام نحو ہے نا۔“ اس نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

نحو نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ فیصلوں کی کئی منزلیں وہ پار کر چکی تھی۔ فضل کا خون

میں ڈوبا سہروں والا چہرہ اس کی نگاہوں میں جذب ہو رہا تھا..... بیگاں کی ہوش و خرد سے

بیگانہ شکل ذہن میں کلبلا رہی تھی.....

”نحو ہونا تم“ تاج نے پھر پوچھا۔

”ہاں۔“ اک آہنی آواز نحو کے نحیف سے وجود سے نکلی۔

تاج سراپا اشتیاق اسے تکتے لگا۔

نحو بھی اسے تک رہی تھی۔

”بڑا افسوس ہے ملک کے مرنے کا۔“ تاج کو کوئی بات نہ سو جھ رہی تھی۔

نحو نے کھلی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اضطراب کے عالم میں قبر پر پھیلائے ہاتھوں سے مٹی کی مٹھیاں بھرنے لگی۔

”تم مجھے پہچانتی ہو؟“ تاج نے چند لمحے بعد پوچھا۔ نحو کی نظروں کی وہ تاب نہ لا

رہا تھا..... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ نظریں اس کے آ رہا ہوئی جا رہی ہیں۔“

”پہچانتی ہو مجھے۔“

”ہاں۔“

”میں تاج ہوں۔“

”تاج محمد سکھیرا۔“

”ہاں بالکل بالکل تو تم مجھے پہچانتی ہو۔“

”بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں۔“

”آواز تاج کے اندر کسی کٹار کی طرح اتر گئی۔ لیکن اس نے پہلو بدل کر نحو کو دیکھا

اور بولا ”ملک اچھا آدمی تھا بڑا جیالا بڑا بہادر۔“

”کینہ پرور بزدل دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔“

”تاج کا دل دھک سے ہوا جلدی سے نحو کو دیکھا اور ہکلاتے ہوئے بولا ”تم“

تم میرا مطلب ہے اس کے دشمن کا پتہ چلا۔“

نحو نے اک تیکھی نگاہ اس پر ڈالی اور گہری آہ بھر کر بولی ”نہیں۔“

”سنا ہے تم نے تفتیش بھی رکوا دی ہے۔“

”ہاں۔“

”کوئی فائدہ نہیں تھا۔“

”شاید دشمن کا پتہ چل جاتا۔“

”میرے ویر کا کوئی دشمن نہیں تھا۔“

”واقعی!!!“

”ہاں!“

”پھر کس نے؟“

”رب جانے۔“

”کوئی تو ہوگا کسی سے تو دشمنی ہوگی۔“

”کسی سے بھی نہیں۔ میرے ویر کا کسی سے بیر نہیں تھا۔ اس نے تو اپنے سب

سے بڑے دشمنوں کو بھی معاف کر دیا تھا۔“

”سکھیں کو؟“

”تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”ہاں۔ مجھے اعتراف ہے۔ فضل نے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔“

”پرانی دشمنی ختم کر ڈالی تھی۔“

”ہوں۔“

”اسی لیے تو اس کے مرنے کا دکھ ہے۔“

”تمہیں دکھ ہے؟“

”ہاں۔“

”میرے دکھ کا اندازہ کر سکتے ہو۔؟ ویرا مر گیا اور بیگاں اس صدمے سے

پاگل ہو گئی۔“

”اوہو۔۔۔۔۔“

”تم نہیں جانتے بیگاں کے متعلق۔“

”نہیں۔“

”تو سن لو۔۔۔۔۔ وہ پاگل ہو گئی ہے۔“

تاج نجو کے انداز تکلم سے کچھ گھبرا گیا، من میں چور جو تھا۔۔۔۔۔ لیکن اپنے آپ پر

اسے اعتماد بھی تھا۔۔۔۔۔ سن بھل کر بولا۔۔۔۔۔ بیچاری پر صدمہ ہی ایسا گزرا۔۔۔۔۔“

”صدمہ تو مجھ پر بھی گزرا۔۔۔۔۔ لیکن میں۔۔۔۔۔ پاگل نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ سکھیرے۔۔۔۔۔“

وہ چپ ہو گیا۔

نجو کے چہرے پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں

خیرہ کن چمک لہرائی۔۔۔۔۔ وہ تیز تیز سانس لینے لگی۔ اک پھنکاری اس کی سانسوں میں گھل

رہی تھی۔

تاج قبر کے سر ہانے بیٹھا تھا۔ نجو قبر کے پہلو میں تھی۔ وہ بڑی مضطرب تھی،

بمشکل اپنے آپ پر قابو پا رہی تھی۔

تاج کے سینے میں نجو کو پا لینے کے جذبات چل رہے تھے۔ سر پر عشق کا بھوت

سوار تھا۔ وہ نجو کی قربت سے مسحور ہو رہا تھا۔

کئی لمحے گزر گئے۔

”تم یہاں روز آتی ہو۔“ تاج نے پوچھا

”ہاں۔“ نجو بولی۔

”کل بھی آؤ گی۔“ تاج نے اپنا شوق چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ ”روز

آتی ہوں۔“ نجو نے بھی یوں کہا۔ جیسے اسے آنے کی دعوت دے رہی ہو۔

”میں جتنے دن یہاں ہوں، جی چاہتا ہے روز ملک فضل کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آؤں۔“

”کیوں۔“

”وہ میرا بہترین دوست تھا۔“

”اچھا؟؟؟“

”ہاں۔“

”تو آ جایا کرو۔ ثواب ہی کا کام ہے۔“

”بالکل۔۔۔۔۔“

”فاتحہ پڑھ لی۔“

”ہاں۔ اب میں جاؤں، دن نکل آیا ہے۔“  
 ”روشنی سے ڈرتے ہو۔ سچی ہوتی ہے نا، اسی لیے ڈرتے ہو۔“  
 ”نہیں تو۔“

نجنس پڑی اور اس کے ہنسنے کی ادا پر تاج لوٹ پوٹ ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ نجو کو خدا حافظ کہہ کے واپس چل دیا۔ وہ پہلے ہی دن نجو پر اپنے جذبات واضح کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو آج نجو سے ملنے آیا تھا۔ اونچ نیچ اسے پرکھنے اور اس کے خیالات جاننے کے لیے آیا تھا۔ وہ قبریں پھلانگتا خاردار جھاڑیوں سے دامن بچاتا ہڑیا لے کی طرف جا رہا تھا۔ نجو ایک ٹک اسے تکتی رہی۔ دو ایک بار تاج نے مڑ کر اسے دیکھا اور اپنی طرف ہی تکتے پایا۔ اپنی کامیابی کا اسے کچھ کچھ یقین ہونے لگا۔



شادو بیگی اور رتو فضل کے دالان میں بچھی دری پر بیٹھی تھیں۔ نجو کے پاس وہ اکثر آ بیٹھتی تھیں۔ مطلب نجو کو بہلانا ہوتا۔ وہ خود تو بہت کم بولتی چالتی تھی۔ لیکن یہ لڑکیاں ادھر ادھر کی باتوں میں لگائے رکھنے کی پوری کوشش کرتیں۔

شام کچھ زیادہ ہی ٹھنڈی تھی۔ جھکڑ نما ہوائیں سارا دن چلتی رہی تھیں۔ مطلع بھی برا آلود تھا۔ بارش ہونے کا امکان تھا۔ جیلاں نے مٹی کی انگیٹھی میں چولہے کی راکھ اور کونکے ڈالے تھے۔ وہ انگیٹھی دالان میں اٹھالائی۔ کمرے میں روشنی کے لیے اس نے پیتل کا لیمپ بھی جلا دیا۔

نجدیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر لگی کھوٹی پر تھیں۔ اس کھوٹی پر فضل کے خون آلود کپڑے اور سہرا ٹنگے تھے۔ نیچے زمین پر تلے والا کھسہ رکھا تھا۔ شادی کا یہ خون آلود جوڑامع جوتوں کے نجو نے کھوٹی پر لٹکا رکھا تھا۔

بنارس پگڑی بھی کھوٹی پر ٹنگی تھی۔ خون کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور کپڑے اکڑ گئے تھے۔

لڑکیاں فضل کی باتیں کر رہی تھیں۔ نجو جیسے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔ وہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”ہائے بھلا فضل کتنا اچھا تھا۔ مجھے تو کہا کرتا تھا تیرے لیے تجھ جیسا کالا کلونا دولہا لاؤں گا۔“ رتو یادوں میں کھو کر بولی۔

”مجھے بھی تو چھیڑا کرتا تھا۔۔۔۔۔ ہائے کتنا مخولی تھا بھلا فضل۔“ شادو نے کہا۔

”جہاں بیٹھتا رونق لگا دیتا۔“ بیگی بولی۔

”اس عید پر مجھے بھی شہر سے جوڑا لاکر دیا تھا۔ کہنے لگا تو بھی میری نجو جیسی بھین ہے۔“

”مجھے بھی عیدی دی تھی۔“

”میرے لیے شہر سے کوئی نہ کوئی چیز لے کے ضرور آتا۔“

”وہ نجو کی سہیلیوں کو اپنی بہنیں ہی سمجھتا تھا۔“

”آہ..... ہا..... کتنے دن گزر گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے کبھی دنیا میں آیا ہی نہیں

تھا..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ گیا.....“

”نہیں..... نہیں..... وہ چھپ نہیں گیا۔“ نجو بڑبڑائی۔ سب لڑکیاں اس کی

طرف دیکھنے لگیں۔ ویر کی دیوانی نجو چنبیلی کے پھول کی طرح زرد ہو رہی تھی..... لڑکیاں سمجھیں وہ ہوش میں نہیں ہے۔ وہ سہرے کو ایک ٹک جو تکتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

”نجو۔“ رتو نے اس کے کندھے کو ہلایا۔

”ہاں۔“

”کیا کہہ رہی ہو۔“

”کہہ رہی ہوں، میرا ویر چھپ نہیں گیا، وہ دیکھو سہرے میں سے اس کا چمکتا ہوا

چہرہ مجھے دیکھ رہا ہے۔“

”لڑکیاں کچھ خوفزدہ سی ہو کر ایک دوسرے کے قریب سمٹ آئیں اور حیرانگی

سے سہرے کو تکتے لگیں۔

”نجو۔“ رتو نے ذرا ہمت کی اور نجو کو پھر مخاطب کیا۔

”ہاں۔“ نجو نے نظریں وہاں سے ہٹا کر لڑکیوں کو دیکھا۔

”ایک بات کہوں نجو.....“ رتو بولی۔

”کہہ۔“

”میری بات ماننے کی۔“

”مان لوں گی۔“

”تو یوں کر..... یہ سہرا اور کپڑے اللہ واسطے کے دے دے کسی کو۔“

”نجو نے گھبرا کر رتو کو دیکھا۔ وہ سر تاپا کانپ گئی۔“ کیوں۔“

”جب تک یہ کپڑے اور سہرا تیری نظروں کے سامنے رہے گا، تو بھلا فضل کو بھلا نہ

سکے گی۔“

”رتو..... رتو..... میں کیسے بھلا سکتی ہوں، اسے کیوں بھلاؤں اسے.....“

”ٹھیک ہے۔“ شادو نے کہا۔ بے شک تو اسے کبھی نہیں بھول سکتی لیکن تو یہ سب

چیزیں یہاں سے ہٹا دے..... کیا ملتا ہے تجھے نجو..... دل زیادہ ہی تڑپتا رہتا ہے نا یہ دیکھ دیکھ کر.....“

”تم کیا جانو پگیو.....“ نجو نے گہری سانس لی۔ پھر آہستگی سے بولی ”مجھے اپنے

ویر کا خون سے بھرا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میں وہی دیکھتی رہتی ہوں۔“

”کیا ہوتا ہے اس سے۔“

”بہت کچھ۔“

”تیرا خیال ہے جھلے۔ در نہ پچھڑے اور مرے ہوئے کہاں ملتے ہیں.....“

”مجھے تو میرا ویر ان کپڑوں اور سہروں میں دکھائی دیتا ہے..... اس کا چہرہ خون

خون ہے۔ پچھڑا ہا ہے خون..... خون.....“

”لڑکیاں ڈرنے لگیں..... سہی سہی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے

قریب قریب ہو بیٹھیں۔

”نجو۔“ ذرا ہٹ کر بیٹھی انگلیٹھی پر ہاتھ سینکتے ہوئے بولی ”فضل تیرا تو ویر

تھا..... تجھے تو اس کے پچھڑنے کا جو دکھ ہے سو ہے خود مجھے یوں لگتا ہے کہ بھلا فضل کے

مرنے سے ساری حویلی اندھیری ہو گئی ہے۔ یہ چراغ یہ لیمپ یہ بتیاں بھی اس اندھیرے

کو دور نہیں کر سکتیں..... لگتا ہے بھلا فضل ہی روشنی تھا..... جو ہر طرف پھیلی رہتی تھی..... پر

اب اپنے دل کو ڈھارس دے صبر کرے گی تو آئے گا۔ اس طرح تو تو بھی بیگاں کی طرح

ہو جائے گی۔“

”ہاں ہاں۔“ شادو بولی۔

”ادھر ادھر دھیان کیا کر۔“ رتو نے کہا ”ہمارے گھر ہی چلی آیا کر۔“

”جب تک یہ سہرا کپڑے یہاں سے نہیں ہٹیں گے نجو کی حالت ٹھیک نہیں ہوگی.....“ شادو نے کہا۔

”نہیں..... سکھو“ نجو نے گہرے گہرے بے اطمینانی کے سانس کھینچتے ہوئے کہا ”نجو کی حالت اس دن ٹھیک ہوگی جس دن وہ اپنے ویر کے قاتل سے بدلہ لے گی..... بیگاں کے جھلی ہونے کا انتقام لے گی.....“ لڑکیاں حیرانگی سے نجو کو دیکھنے لگیں۔ وہ اب بھی کپڑوں اور سہرے کو تکتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

”کبھی کبھی مجھے اس سہرے میں اک مکروہ چہرہ نظر آتا ہے اور میں..... میں یہی چاہتی ہوں اس چہرے پر بھی ایسا ہی سہرا ہو..... خون سے بھرا ہوا..... خون آلود چہرے پر خون میں ڈوبا سہرا..... پھر..... پھر۔“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”نجو..... نجو۔“ لڑکیوں نے اسے جھنجھوڑا۔ بیگی کچھ زیادہ ہی ڈر گئی۔ وہ جلدی سے دالان سے ماسی راہو اور رسوئی گھر سے حیراں اور بکو کو بلانے لگی۔

”اے ماسی راہو..... ماسی راہو.....“ اس نے لحاف میں پڑی راہو کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”کیا ہے۔“

”ابھی سے سو گئی ہے.....“

”نہیں سونا کیسا دھیے۔ نیند تو فضل ساتھ ہی لے گیا۔ تجھے کیا ہوا ہے۔“

”مجھے نہیں نجو کو کچھ ہو گیا ہے۔“

”ہائے میں مر گئی۔“

”ماسی راہو لحاف پرے پھینک اٹھ بیٹھی۔“ کہاں ہے وہ۔“

”بھلا فضل کے دالان میں۔“

بیگی اسے اٹھا کر رسوئی گھر کی طرف لپکی۔ ”وے بکوئی حیراں۔“

”کیا ہوا..... کیا ہوا۔“ چولہے کے پاس بیٹھی حیراں لڑکی کو ہراساں دیکھ کر بولی۔

بکو بھی پیڑھی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ حیرانی سے اسے دیکھ کر بولا۔

”کیا بات ہے۔“

”نجو کو کچھ ہو رہا ہے۔“ بیگی واپس پلٹی۔

”ہائے اللہ۔“

”میرے ربا۔“

دونوں اس کے پیچھے بھاگے صحن میں ابھی ابھی چودھری سردار اور محمد حسین آئے تھے۔ انہیں یوں بے ترتیبی سے بھاگتے دیکھا تو حیران ہوئے۔ ”کیا ہوا۔ کیا ہوا“ کہتے وہ بھی دالان میں آ گئے۔

لڑکیاں خوفزدہ تھیں۔

”کیا ہوا ماں صدقے۔“ ماسی راہو نے اپنے ہلتے چلتے وجود کو نجو کے قریب بٹخ دیا اور نجو کے گلے میں بائیں ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

”دھیے..... کیا ہوا۔“ چودھری سردار اور محمد حسین نے پوچھا۔

”کچھ نہیں چاچا۔“ نجو نے اپنے آپ کو ماسی راہو کے نرغے سے نکال کر دونوں بزرگوں کی طرف دیکھا۔

”آؤ بیٹھو چاچا۔“ اس نے فضل کے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر باری باری نجو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پیار کیا اور دعائیں دیتے ہوئے بولے ”رانے صبر کر..... تو جتنی بے چین رہے گی تیرے ویر کی روح کو اتنی ہی تکلیف ہوگی۔“

”میرے ویر کی روح کو تکلیف رہے گی چاچا جب تک اس کے قاتل سے میں بدلہ نہ لے لوں گی۔“

”اوئے جھلی دھی.....“ چودھری سردار نے آہ بھر کر کہا ”کاش تیرا کوئی اور ویر ہوتا..... یا چاچا ماما ہی ہوتا..... ڈھونڈ نکالتا قاتل کو..... تو نازاں پلی دھی ہے..... کہاں سے ڈھونڈے گی قاتل کو..... پتہ ہی نہیں چلا کون ظالم تھے۔“

”نہ سوچا کرایسی باتیں۔“ محمد حسین نے کہا۔

”چاچا۔“ جلدی سے رتو بولی ”جب تک بھلا فضل کا یہ سہرا اور کپڑے یہاں ٹنگے رہیں گے یہ ایسی ایسی باتیں سوچتی ہی رہے گی۔“

”میں نے تو کتنی دفعہ سمجھایا ہے۔“ راہو بولی ”مرنے والوں کے ایسے کپڑے گھر

میں نہیں رکھا کرتے۔“

”بالکل بالکل۔“ شادو نے کہا۔

”سہرے کو کہیں دفن ہی کر دینا چاہیے۔“ بکو بولا..... ”یہ تو سینے پر آ رے کی طرح

لگتا ہے۔“

”سب نے کچھ نہ کچھ کہا..... لیکن نجو بولی ”ابھی وقت نہیں آیا.....“

”کب آئے گا۔“ رتو نے پوچھا۔

”جب ایسے ہی کپڑے میرے ویر کے قاتل کے بھی رہ جائیں گے۔“ نجو نے

مستحکم آواز میں کہا..... ”ایسا ہی خون میں لتھڑا سہرا..... ایسے ہی کپڑے.....“

ماسی را بوسہ پر ہاتھ رکھ کر بین کرنے لگی۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آئے.....

چودھری سردار اور محمد حسین نجو کو تسلیاں دینے لگے۔

نجو

اس وقت

تسلیوں سے بے نیاز دکھائی دے رہی تھی۔

-----○-----

قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ تاج چلا جا رہا تھا۔ اس نے خوبصورت اور قیمتی گرم دو شالہ کندھوں پر ڈال رکھا تھا اور سگریٹ کے کش لیتا جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رومال تھا جس میں پھول تھے۔

پو پھٹ چکی تھی۔ اک ملگجاسا اجالا چاروں طرف پھیلا تھا۔ نمازی گاؤں کی باہر والی مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ فجر کی نماز زیادہ تر لوگ وہاں ہی پڑھتے تھے۔

تاج نجو کی لگن میں قبرستان جا رہا تھا۔ وہ روزانہ بھائی کی قبر پر آتی تھی۔ ملنے کا اچھا موقع اور بہانہ تھا۔ کل بھی وہ اسے یہیں ملا تھا۔ اک نشہ سا اس کے حواس پر چھا گیا تھا۔ رات بھر وہ نجو ہی کے سینے دیکھتا رہا تھا۔ وہ گھاگ شکاری تھا۔ نجو کو بھی طریقے اور سلیقے سے رام کرنا چاہتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی منڈیر پھلانگ کر وہ قبرستان سے اندر آ گیا۔ فضل کی قبر مشرقی طرف ایک چھدرے سے درخت تلے تھی۔ تاج نے دور ہی سے دیکھا قبر کے پہلو میں نجو بیٹھی تھی۔ خوشی کی ایک لہری تاج کے من میں دوڑ گئی۔

وہ قبریں پھلانگتا وہاں جا پہنچا۔

نجو قبر پر سر رکھے بازو مٹی پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ تاج چند لمحے قبر کے قریب کھڑا رہا، پھر ہولے سے کھنکارا۔

نجو نے سر اٹھایا، گال پر لگی مٹی جھاڑتے ہوئے تاج کو دیکھا۔

تاج قبر کی دوسری طرف دوڑا نو ہوتے ہوئے بولا ”میں کچھ پھول چڑھانے آیا تھا۔“

نجو ایک لمحہ کو بت بنی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ہونٹوں پر اک دلنواز مسکراہٹ

پھیلاتے ہوئے بولی ”تم آ گئے۔“

”ہاں۔“

”پھول چڑھانے آئے ہو۔“

”کیا کہنا ہے کہہ ڈالو.....“  
 ”کہہ دوں۔“  
 ”کہو.....“  
 ”برا تو نہیں مان جاؤ گی۔“  
 ”نہیں.....“  
 ”اچھا فاتحہ پڑھ لوں پہلے۔“  
 وہ فاتحہ پڑھنے لگا۔ نجو اس کے پھول قبر پر پھیلاتے ہوئے بڑبڑائی۔  
 ”ویر..... آج تیری قبر پر پھول چڑھے ہیں..... دیکھ تیرے جن کیسے لوگ  
 ہیں..... ہوں..... ہیں نا.....“  
 وہ پھر تلخی سے مسکرائی۔  
 ”ہاتھ چرے پر پھیر کر تاج نے نجو کی طرف دیکھا.....“نجو۔“  
 ”ہاں۔“  
 ”تو تو بالکل اکیلی رہ گئی ہے نا۔“  
 ”ہاں..... بالکل اکیلی.....“  
 ”کیا کہنا چاہتے ہو۔“  
 ”تیری منگنی وگنی تو نہیں ہوئی نا ابھی۔“  
 ”کیوں؟“  
 ”ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“  
 ”یہ بات ایسے ہی پوچھنے کی تو نہیں۔ کچھ تو ہے.....“  
 ”سنا تھا فضل نے تیری بات.....“  
 ”فضل کی بات گئی فضل کے ساتھ۔“چند لمحوں کے توقف کے بعد نجو نے سپاٹ  
 لہجے میں کہا.....“  
 ”وہ راجو.....“  
 ”ہاں فضل کو بہت پسند تھا۔“

”بالکل یہ دیکھو۔“  
 تاج نے پھول اور پیتیاں قبر پر پھیلا دیں۔  
 نجو نے اک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔  
 تاج نے جلدی سے نجو کی طرف دیکھا ”کیوں ہنسی ہو۔“  
 ”تم بھی چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ روتی رہوں۔“  
 ”نہیں، نہیں، یہ بات نہیں۔“  
 ”تو.....“  
 ”ویسے ہی تمہارا قہقہہ..... خیر..... میں تو چاہتا ہوں تم سدا ہنستی مسکراتی رہو۔“  
 ”جی۔“  
 ”بالکل۔“  
 تاج محبت بھری نظروں سے نجو کو تنکے لگا..... نجو کی آنکھوں میں چمک لہرا رہی  
 تھی..... وہ مسکراتے ہوئے بولی۔  
 ”فاتحہ نہیں پڑھو گے۔“  
 ”اوہ ہاں۔“ تاج نے خفت سے کہا اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔  
 ”پڑھنا آتا بھی ہے یا.....“نجو پھر شونہ سے مسکرائی۔  
 ”لوحد ہو گئی۔“  
 ”تم تو شہری بابو بن گئے ہونا..... سنا ہے شہری لوگ بے دین ہو جاتے ہیں۔“  
 ”یہ کس نے کہا۔“  
 ”سنا ہے۔“  
 ”کہو تو اونچی آواز میں پڑھو فاتحہ۔“  
 ”نہیں..... دل ہی دل میں پڑھو..... دل کی باتیں دل ہی میں رہنی چاہئیں۔“  
 ”لیکن.....“  
 ”کیا؟“  
 ”دل کی باتیں دل میں رکھنے کا میں قائل نہیں.....“



”اس نے رشتہ بھیجا تھا تیرے لیے۔“

”تجھے یہ سب باتیں کس نے بتائیں۔“

”میں نے معلوم کر لی ہیں۔“

”کیوں؟“

”نحو..... میں یہ کہوں..... کہ تو مجھے..... تو مجھے اچھی لگتی ہے..... تو.....“

”نحو نے سر جھکا لیا۔ چند لمحے جھکائے ہی رکھا۔ اس کے من میں ایسی اتھل پتھل

ہو رہی تھی کہ اس کا وجود جھٹکے پہ جھٹکے کھا رہا تھا۔

”برامان گئی ہو۔“ تاج نے گھبرا کر پوچھا۔

نحو نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ تاج کو کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ دیکھے گئی.....

دیکھے گئی..... اس کا رنگ فق تھا۔ ہونٹ سوکھے تھے، حلق میں گولا سا پھنس رہا تھا.....

”کیا تک رہی ہے۔ برامان لیا ہے؟“

”نہیں.....“

”سچ نحو۔“

”ہاں.....“

”اور..... اور..... وہ..... جو راجو ہے.....“

”اس کی بات نہ کر۔“

تاج نے غور سے نحو کو دیکھا۔ اس کو یقین نہ آیا۔ نحو اور راجو کے متعلق اس نے

اڑتی اڑتی خبریں سنی تھیں۔ بارات والے دن تو لوگ اس رشتے کے چرچے کر رہے تھے۔

فضل نے کچھ لوگوں کے سامنے اس رشتے کا اعتراف کیا تھا..... میت دفنانے کے بعد بھی

کچھ لوگ یہی باتیں کر رہے تھے۔

”شکر ہے فضل اپنے ہاتھوں بہن کا رشتہ طے کر گیا۔“ یہ بات اس نے کئی لوگوں

کے منہ سے سنی تھی۔

”نحو.....“

”ہاں۔“

”تیرا رشتہ فضل نے راجو کے ساتھ طے کیا تھا؟“

نحو نے اپنا بے رنگ چہرہ اونچا کیا۔ اک آہ بھری اور بولی ”فضل نے جو کچھ کیا

تھا وہ ختم ہو گیا.....“

”واقعی۔“

”ہاں۔“

”کیوں کیا راجو تجھے پسند نہیں۔“

”فضل کو پسند تھا۔“

”ہوں.....“

تاج کے چہرے پر خوشیاں لہریں لینے لگیں۔ دل بے اختیار ہو ہو کر دھڑکنے

لگا..... اسے کہاں امید تھی کہ اپنا مقصد اتنی جلدی پالے گا..... وہ تو راجو کو راہ کی دیوار سمجھ رہا

تھا اور اس دیوار کو گرانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ یہاں معاملہ ہی اور تھا.....

پھر بھی پورا یقین کرنے سے پہلے اس نے نحو سے کہا ”راجو کے متعلق تو لوگ کہتے ہیں۔“

”کہ وہ میرا منگیتر ہے۔“

”ہاں۔ فضل نے بارات والے دن کچھ لوگوں سے کہا تھا۔“

”اور تو جانتا ہے کہ فضل اب اس دنیا میں نہیں۔“

”ہاں.....“

”وہ دل کی باتیں دل ہی میں لے گیا.....“ نحو نے بڑے کربناک لہجے میں کہا

”سارے ارمان..... ساری خوشیاں..... ساری باتیں..... اس مٹی کے ڈھیر میں دفن ہو گئی ہیں۔“

”تاج احمقوں کی طرح سر اثبات میں ہلانے لگا۔ وہ کئی لمحے چپ رہا تو نحو بولی

”لیکن..... تو کیوں ان ساری باتوں کو کرید رہا ہے تاجے۔“

”مجھے تیرے اکیلا رہ جانے کا بڑا دکھ ہے۔“

”واقعی.....؟“

”ہاں۔“

”پھر کیا سوچا ہے.....“

”تو بتاؤں گا.....“ وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکرایا۔ تو جواباً نجو بھی مسکرا دی۔  
 نجو کی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔  
 تاج اس مسکراہٹ سے اور لٹو ہو گیا۔ اس کے جذبات کی دنیا میں ہلچل مچ گئی اور  
 اس جذباتی ریلے میں اس نے نجو کے قبر پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔  
 نجو نے کمال جرات سے اس کا ہاتھ تھام لیا.....  
 تاج نجو کے برف ایسے ٹھنڈے ہاتھ کا لمس پا کر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔  
 اپنے ہاتھ میں پکڑے اس ہاتھ پر اس نے گرجوٹی سے دباؤ ڈالا۔  
 نجو نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ بڑی مستحکم اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی ”تو نے ملکوں  
 کی دھی اور ملک فضل کی بھین کا ہاتھ پکڑا ہے تاج سکھیرے۔“  
 ”تاج سہم گیا۔ ڈرتے ڈرتے نجو کی طرف دیکھا، بمشکل آواز حلق سے نکلی  
 ”ہاں۔ یہ ہاتھ اب چھوٹے گا نہیں۔“ وہ اس آہنی لہجے میں بولی۔  
 تاج خوشی سے جیسے دیوانہ ہو گیا۔ جلدی سے دوسرا ہاتھ بھی نجو کے ہاتھ پر رکھتے  
 ہوئے بولا..... ”کبھی نہیں چھوٹے گا..... کبھی نہیں.....“  
 ”ٹھیک ہے۔“ نجو نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیا اور بولی  
 ”فضل نے ملکوں اور سکھیروں کی دوستی کا جو خواب دیکھا تھا، ہم اسے پورا کریں گے.....  
 کیوں تا جے.....“  
 ”بالکل بالکل۔“ وہ تو جیسے خوشیوں کی یلغار سے بہکا جا رہا تھا۔  
 کئی لمحے گزر گئے۔  
 پھر نجو اٹھی۔ تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”کل آؤ گی نا۔“ تاج نے شوق اور بے قراری سے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“ نجو نے اس کی آنکھوں میں مسکراتی آنکھیں ڈال دیں۔  
 چند لمحوں بعد وہ رب رکھا کہہ کر واپس چلا گیا اور سر جھکائے سوچوں میں ڈوبی نجو  
 آہستہ آہستہ چلتی گھر آئی۔

”تو بڑا چپ رہتا ہے بھارا جو۔“  
 ”ہوں۔“  
 ”کیا بات ہے۔“  
 ”بات؟“  
 ”ہاں۔“  
 ”کیا بتاؤں بھین رتو.....“  
 ”کیوں۔“  
 ”بس کچھ سمجھ نہیں آتا۔“  
 ”نجو نے کچھ کہہ دیا۔“  
 ”یہی بات ہے بھین رتو.....“  
 ”کیا کہا اس نے۔“  
 ”کچھ نہیں..... بس ملتی نہیں اب..... دو چار دن قبرستان جا تا رہا۔ وہاں مل جاتی  
 تھی اس نے وہاں آنے سے منع کر دیا۔“  
 ”کیوں۔“  
 ”پتہ نہیں.....“  
 ”تو تو جا کر پوچھ لے نا اس سے۔“  
 ”کہاں جاؤں۔“  
 ”اس کے گھر۔“  
 ”دو تین دفعہ گیا ہوں..... ماسی راہو اور بکو کے پاس ہی بیٹھ بیٹھ کر چلا آتا ہوں۔“

”کیوں.....نچو گھر پر نہ تھی۔“

”تھی۔“

”سامنے نہیں آئی۔“

”نہیں.....فضل کے دالان کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھی رہی۔“

”تیرے آنے کا اسے پتہ چلا۔“

”کیوں نہ چلا ہوگا۔“ صحن میں اس دالان کے دروازے بند کر کے اندر

بیٹھا رہا۔

ماسی راہو سے باتیں کرتا رہا۔ بکوسے باتیں کرتا رہا۔

”ہوں۔“

”میرا دل بہت پریشان رہتا ہے بھین رتو.....پتہ نہیں نچو کو کیا ہو گیا ہے۔“

”ہاں اسے واقعی کچھ ہو گیا ہے.....مجھے تو اس کی آنکھوں میں پہچان کی

چمک ہی نظر نہیں آتی۔ میری کتنی پکی سہیلی ہے پر میرے ساتھ بھی بس اوپری اوپری باتیں کرتی ہے.....“

”میرے متعلق کبھی کچھ کہا.....“

رتو نے نفی میں آہستہ آہستہ سر ہلا دیا۔ راجو جو پہلے ہی پریشان تھا.....اور پریشان

نظر آنے لگا۔

”صدمہ تو اس پر بڑا بھاری گزرا ہے۔“ راجو بے چینی سے بولا.....”پروقت کے

ساتھ ساتھ اسے صبر آنا چاہیے تھا۔“

”میں تو دیکھ رہی ہوں کہ وہ دن بدن زیادہ ہی ڈوبتی جا رہی ہے۔ ہر وقت

سوچوں میں کھوئی رہتی ہے۔ گھر بار کا تو اسے پتہ ہی نہیں۔ کل میں گئی تو بھانسل کی زیور

پیسے والی الماری کھلی پڑی تھی۔ میں نے نچو کو بتایا تو بولی اب اور کیا لئے گا رتو! سب کچھ تو

لٹ گیا.....“

”اف.....“

”بھارا جو۔“

”ہاں۔“

”تو اس سے کسی طرح مل.....شاید تیرے سمجھانے سے اس کو صبر آ جائے.....“

”یہی سوچتا ہوں۔ لیکن ملوں کہاں۔“

”ہائے ہائے.....قبرستان تو وہ روز ہی جاتی ہے۔“

”لیکن اس نے مجھے منع کر دیا ہے وہاں آنے سے۔“

”کیا ہوا.....“

”میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا بھین رتو.....“

”تو یوں کر.....“ رتو کچھ سوچنے لگی۔

”کیا؟“ وہ بے تابی سے بولا۔

”قبرستان سے باہر مل لینا.....وہ جس راستے سے جاتی آتی ہے تجھے پتہ ہی ہے۔“

”ہاں۔“

”بس اس کی مرضی کے خلاف بھی نہ ہوگی بات اور تو بھی مل لے گا۔“

”یہ ٹھیک کہا تو نے۔“

”فجر کی نماز پڑھ کر اور کبھی اس سے پہلے جاتی ہے وہ۔“

”میں آدھی رات ویلے ہی راہ مل کر بیٹھ جاؤں گا۔“

رتو کو راجو کی بات پر ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ جس قدر پریشان تھا اس کی پریشانی دیکھ

کر وہ ہنسی روک کر سنجیدگی سے بولی ”میں آج نچو سے بات کروں گی.....“

”کس کی۔“

”تیری۔“

”کیا کہے گی اسے۔“

”کہوں گی جو مناسب ہوگا۔“

”کچھ نہ کہنا۔“

”کیوں۔“

”صبح میں خود مل لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

راجو چودھری نظام دین کی زمینوں میں واہی کرتا تھا۔ گندم کی فصل سرائٹھا رہی تھی۔ وہ ایک کھیت کے کنارے بیٹھا تھا۔ رتو اپنے باپ اور بھائیوں کو بھتہ دے کر واپس آ رہی تھی..... علیک سلیک کے بعد نجو کی باتیں ہونے لگیں۔ راجوان دنوں بڑا گم صم رہنے لگا تھا۔ رتو کے گھر بھی آتا تو خاموش رہتا تھا۔ آج رتو نے موقع پا کر اس سے پوچھ ہی لیا۔ وہ نجو کی پکی سہیلی تھی۔ راجو اور نجو کے پیار سے واقف تھی۔ حالات یوں پلٹا نہ کھاتے تو اب تک نجو راجو کے سنگ ازدواجی زندگی کی بہاریں لوٹ رہی ہوتی۔ فضل نے اپنی شادی کے بعد اس کی شادی فوراً ہی کرنا تھی۔

”اچھا بھاراجو! میں چلوں۔“

”جاؤ۔“

”رب کرے کل نجو تجھ سے ٹھیک طرح ملے۔ کبھی کبھی تو یوں ملتی ہے جیسے پہچانتی ہی نہ ہو۔“

”شادو بھی یہی کہہ رہی تھی۔“

”اس سے تو بات بھی نہیں کرتی۔ سارا وقت پتہ نہیں دروازہ بند کر کے اکیلی کیا کرتی رہتی ہے۔“

”روتی رہتی ہوگی۔“

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ سب کے سامنے اب بالکل نہیں روتی۔ پردل تو بھرتا ہوگا تا اسی لیے بند کمرے میں رو لیتی ہوگی۔“

”ہائے..... ہائے..... اللہ پاک اسے جانے کب صبر دے گا۔“

”میں تو بس دعا ہی کرتی رہتی ہوں..... اچھا..... بھاراجو..... میں چلی۔“

”رب را کھا بھین۔“

”رب را کھا۔“

رتو کی تجویز راجو کو ٹھیک لگی۔ اس نے صبح نجو سے ملنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ دوسری صبح فجر کی اذان سے بہت دیر پہلے وہ اٹھ بیٹھا۔ کھیس کی بکل ماری اور نجو کی راہ دیکھنے اس طرف

چلا گیا جہاں سے وہ قبرستان جاتی تھی۔

انتظار کا ایک ایک لمحہ کٹھن تھا۔ وہ بے قراری کے عالم میں مصلیوں کے ٹوٹے پھوٹے کچے گھروں کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا..... دیواریں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور تازہ اور پرانے اوپلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر بھی قریب پڑے تھے..... وہ سر جھکائے قبرستان کی طرف چل دیا۔ یہاں ویرانی تھی، سناٹا تھا، خاموشی تھی، ملگجاندھیرا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اس راستے پر جمی تھیں جس پر نجو نے آنا تھا۔

نجو آ رہی تھی۔ راجو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کتنے دن ہو گئے تھے۔ دل کے اس جانی کو دیکھے ہوئے۔ شوق بے قرار ہوا..... آرزو بھڑکی، تمنا برقرار ہوئی اور وہ تیز قدم اٹھاتے نجو کی طرف لپکا۔ اس نے نجو کے سامنے آتے ہوئے پکارا..... ”نجو“

نجو نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ راجو اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اسے یوں لگا اس کی راہ میں راجو نہیں کوئی پہاڑی رکاوٹ آن کھڑی ہوئی ہے۔ وہ مضطرب ہوئی..... لیکن عزم نے سنبھالا دیا.....

”کیا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”نجو..... تجھے دیکھے اتنے دن ہو گئے تھے۔ تجھے کیا بتاؤں مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ میں تیرے بغیر اک اک پل جس اذیت سے گزارتا ہوں، تجھے کیسے بتاؤں.....“

نجو نے کوئی جواب نہ دیا۔ راجو کے دائیں ہاتھ سے آگے گزر جانا چاہا۔ ”نجو“ راجو کا دل کٹ گیا۔ وہ اس کی طرف پلٹ کر انتہائی دردیلے لہجے میں اسے پکارا اٹھا.....

نجو نے صرف اک نظر اس پر ڈالی پھر بولی ”مجھے قبر پر جانا ہے، دیر ہو رہی ہے.....“

”نجو..... تیرے اس وطرے سے..... میں مر جاؤں گا۔“

”ہونہہ..... کوئی نہیں مرتا راجو..... میں فضل کے لیے نہ مر سکی..... تو کون کسی کے لیے مرے گا۔“

”نجو۔“

”مجھے جانے دے دیر ہو رہی ہے.....“

”میری بات تو سن۔“

وہ ایک لمحہ کو ٹھٹکی..... پھر راجو کو ایک گہری نظر سے دیکھا، سر جھکایا اور آہستگی سے بولی ”پہلے تو میری بات سن۔“

”کہہ.....“

”تو ادھر نہ آیا کر.....“

”راجو کے سینے میں جیسے تیر کی انی چبھ گئی، بلبلاتا تھا۔“ کیوں.....“

”بس میں نے کہہ دیا ہے، تو ادھر نہ آیا کر.....“

”تو مجھے مار ڈالے گی نجو.....“

”راجو۔“

”ہاں۔“

”تو مجھ سے پیار کرتا ہے نا؟“

”یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔“

”ہاں اقرار کر.....“

”کیسے یقین دلاؤں تجھے.....“

”میری بات مان کر.....“

”نجو.....“

”پیار کی منزلیں بڑی کنٹھن ہوتی ہیں راجو..... مشکلیں پڑ جائیں تو قربانی دینا پڑتی ہے.....“

”تجھے کون سی مشکل آن پڑی ہے نجو، مجھے بھی تو بتا..... میں تیرے ساتھ مل کر اس کو حل کروں گا.....“

وہ تلخی سے ہنس پڑی..... کر بناک انداز میں راجو کو دیکھا اور بولی ”تو تو پہلے قدم پر ہی ڈگمگا گیا ہے..... میرا ساتھ دینے کے لیے تو پہاڑ کا جگر چاہیے.....“

”نجو تیری کوئی بات بھی مجھے سمجھ نہیں آتی.....“

وہ پھر زہرناک ہنسی ہنستے ہوئے بولی ”تو پیار کو جسمانی حدوں سے آگے نہیں لے جاسکتا راجو..... اس کی حدیں تو بہت دور تک ہیں، بہت دور تک تو ان تک نہیں پہنچ سکتا۔“

”نجو..... رب کے واسطے بھول بھلیوں میں مجھے نہ ڈال، سیدھی سیدھی بات کر..... مجھے بتا دے تو کیا چاہتی ہے.....“

”یہی کہ تو ادھر نہ آیا کر.....“

”کیوں۔“

”اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اگر تیرا پیارا چا اور سچا ہے تو تو میرے راسے سے ہٹ جا..... اب ادھر کبھی نہ آنا.....“

نجو پلٹی.....

راجو گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آئی۔

نجو قبرستان کے اندر چلی گئی..... اس نے ایک بار بھی پلٹ کر راجو کو نہیں دیکھا.....

راجو چند لمحے دل گرفتہ سا کھڑا رہا۔ پھر سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا واپس آ گیا۔

ماما نظام دین اور مامی شہر سے آئے ہوئے تھے۔ نظام دین کو زمینوں اور فصل کی دیکھ بھال کے لیے کبھی کبھی گاؤں آتا پڑتا تھا۔ راجو بڑا ایماندار اور سختی مزارع تھا، پھر بھی اپنی فصل کو دیکھنے کے لیے وہ آیا کرتا تھا۔  
فصل کی شادی و مرگ کے سلسلہ میں تو وہ کئی دفعہ آیا تھا۔ بیوی اور بچے بھی آئے تھے۔ چالیسویں پر تو دو دن رہے تھے۔

اب وہ راجو سے ملنے آیا تھا تو مامی بھی تیار ہو گئی تھی۔

”کیا کرو گی۔“ نظام دین نے پوچھا۔

”نخو کو دیکھ آؤں گی۔“

”لگتا ہے نخو کی لگن تیرے من میں ہے ابھی۔“

”ماں۔“

”لیکن فضل نے تو تیری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔“

”اس بیچارے کو فرصت ہی کب ملی۔“

”میں نے تو سنا ہے اس نے نخو کا رشتہ وہیں گاؤں میں کرنا تھا۔“

”کیا تو نہیں تھانا۔“

”پتہ نہیں۔“

”میں جا کر پتہ کرتی ہوں۔ بیچاری لڑکی بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ ہم لوگ ہی اس

کے کچھ لگتے ہیں۔ ہم نہ سوچیں گے تو کون سوچے گا۔“

”سیکنہ بھی تو ہے۔“

”ہائے۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ وہ بیچاری تو مر گئی جیتے جی۔ جوان بیٹی پاگل ہو گئی ہے۔ وہ

کیا سوچے گی نخو کے متعلق۔۔۔۔۔“

”تو چلو۔۔۔۔۔ لیکن بات کس سے کرو گی۔“

”مامی راہو سے۔۔۔۔۔“

”مامی راہو کو ہوش مت ہی کہاں ہے۔“

”لو جی۔۔۔۔۔ اچھی بھلی ہے۔ صرف آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ چند حیا کی

ہوئی لگتی ہے۔۔۔۔۔ وہی تو اب سارے گھر کی کرتا دھرتا ہے۔۔۔۔۔“

”عجیب ہی لگتا ہے۔“

”چل کر دیکھ لیتے ہیں نا۔ اب لڑکی کا رشتہ طے کرنا ہی ہے۔“

”ہماری طرح کے دور پار کے اور رشتے دار بھی تو ہیں۔“

”ان سے بھی صلاح مشورہ کر لیں گے۔۔۔۔۔ لڑکی بڑی پیاری ہے۔۔۔۔۔ رشتہ ضرور

لینا ہے میں نے۔“

ماما نظام دین مامی کو ساتھ لے آیا۔ مامی کو رشتہ تو جو پسند تھا سو تھا اب اس رشتے

سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ ساری زمینوں کی مالک نخو ہی تھی۔ اب کئی مربے

زمین اور باغات تھے حویلی تھی سونا موتی تھا ڈھور ڈنگر تھے۔

دونوں حویلی آگئے۔ مامی راہو محن میں چار پائی پر بیٹھی تھی۔ محلے کی دو تین عورتیں

بھی آئی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی محن میں کھیل رہے تھے۔ جارو اور جیلاں آج

مردانے کی بیٹھک کی صفائی کر رہی تھیں۔ اجڑی گئی تھی بیٹھک۔ کوئی بھی تو نہ آتا تھا

وہاں۔۔۔۔۔ جو کوئی بھی آتا تھا گھڑی دو گھڑی مامی راہو کے پاس محن یا دالان میں بیٹھ کر چلا

جاتا تھا۔

نخو فضل کے دالان میں تھی۔ دری پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے

سامنے رحل پر جزدان سمیت کلام پاک رکھا تھا۔ سپارہ پڑھ کر اب وہ آنکھیں بند کیے ہاتھ

باندھے بیٹھی تھی۔

چودھری نظام دین اور مامی اب شہری طرز معاشرت اپنا چکے تھے۔ عورتیں دونوں کو

دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔ خاص کر مامی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس ان کی دلچسپی کا باعث تھا۔

سلام و دعا کے بعد دونوں ماسی راہو کے پاس بیٹھ گئے۔

”نحو کہاں ہے۔“ مامی نے پوچھا۔

”اندر سپارہ پڑھ رہی ہے۔“ راہو کے ساتھ بیٹھی کالے کرتے اور نیلے تہبند والی

عورت زمین پر کھیلتے اپنے بچے کو اٹھاتے ہوئے بولی۔

مامی اٹھ کر اندر گئی۔ نحو رحل اور کلام پاک الماری کے اوپر بنے طاقے میں رکھ

رہی تھی۔

اس نے پلٹ کر مامی کو دیکھا۔ ”سلام مامی۔“

”جیتی رہو۔“ مامی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کب آئیں۔“

”ابھی ابھی۔“

”اکیلی۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہارا ماما بھی آیا ہے۔“

”کہاں ہیں۔“

”باہر بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔“

”نحو مامے کو سلام کرنے باہر آئی۔ مامی بھی دالان پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے

باہر آ گئی۔ فضل کا سہرا اور خون آلود کپڑے دیکھ کر اسے جھرجھری سی آ گئی۔

نحو نظام دین کو سلام کر کے ماسی راہو کے قریب چار پائی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

گلی کی عورتیں اٹھ کر چلی گئیں۔۔۔۔۔ بچے بھی ان کے پیچھے بھاگ گئے۔

مامی اور ماما دونوں فضل کی باتیں بڑے دکھ سے کرنے لگے۔ نحو کی آنکھیں بھر بھر

آئیں۔ لیکن وہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنسو آنکھوں ہی میں پتی رہی۔

رقیہ رسوئی گھر میں تھی۔۔۔۔۔ جیراں نے مکھن دیکھی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا رکھا

تھا۔ گھی بنا رہی تھی۔۔۔۔۔ کاڑھنی میں دودھ ابل رہا تھا۔ جیراں نے رقیہ کے ہاتھ دو گلاس دودھ

کے باہر مہمانوں کے لیے بھجوا دیئے۔

شہری لوگ دودھ کے کہاں عادی تھے۔ ماسی ہنس کر رقیہ سے بولی ”تیرا ستیاناس

اتنا دودھ کون پئے گا۔۔۔۔۔“

”چائے بنوادوں۔“ نحو بولی۔

”پتی ہوگی۔“ ماسی راہو نے پوچھا پھر آہ بھر کر بولی ”فضل ساری چیزیں شہر سے

لا کر رکھتا تھا۔ اب تو ہوش ہی نہیں رہا ان چیزوں کا۔۔۔۔۔ یہ ماں بیٹیاں ہی اب بندوبست کرتی

ہیں۔۔۔۔۔ چیز ہے یا ختم ہوگئی انہیں ہی پتہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

نحو خود اٹھ کر باورچی خانے میں گئی۔۔۔۔۔ مختلف ڈبے چھتی (کارنس) پر رکھے

تھے۔ سب کے ڈھکنے کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک ڈبے میں چائے کی پتی مل گئی۔ اس نے

رقیہ کو چائے بنانے کے لیے کہا۔

اور

خود پیڑھی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی طبیعت اکھڑی اکھڑی اور اچاٹ

اچاٹ تھی۔۔۔۔۔ دل کسی کام میں لگتا ہی کب تھا۔ لوگوں کی باتوں سے بھی اکتا جاتی تھی۔ ذہن

میں اور ہی ادھیڑ بن ہوتی تھی۔

چائے پینے کے بعد مامی ماسی راہو کے قریب ہو بیٹھی۔ نحو دالان میں چلی گئی اور

دروازہ آہستگی سے بند کر لیا۔

ماما نظام دین کھیتوں میں چلا گیا۔ پچھلے پہر انہوں نے واپس جانا تھا اس لیے فصل

دیکھنے اور دوسرے لوگوں سے ملنے چلا گیا۔ کچھ حساب کتاب بھی راجو سے کرنا تھا۔

مامی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولی ”فضل ایک دن ہمارے گھر آیا تھا۔۔۔۔۔“

”شہر۔“

”ہاں۔“

ماسی راہو بولی ”ہاں مرنے سے کچھ دن پہلے کی بات ہے شاید۔“

”ہاں ہاں۔“

”بتایا تھا اس نے۔“

”میں نے شاہد کے لیے نحو کی بات کی تھی۔۔۔۔۔ خیر سے وکیل بن گیا ہے۔ وکالت

کر رہا ہے۔“

”تو۔“

”نحو نے کہا تھا وہ پنڈ کی کڑی ہے پنڈ ہی میں جسے مرے گی۔“

”ہوں۔“

”ہو سکتا ہے اسی طرح اس نے بھین کا عندیہ لیا ہو۔“

مائی کے جوش و جذبے ٹھنڈے پڑ گئے..... پھر بھی بولی ”ہمیں تو کسی نے بتایا نہیں کہ رشتہ طے ہو چکا ہے۔“

”ابھی بات اس نے اشارتا ہی کی تھی۔ باقاعدہ رشتہ دینے کا تو اسے وقت ہی نہیں ملا۔ ظالموں نے اسے مہلت ہی نہ دی.....“

”ہوں۔“

رشتے کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ قتل اور قاتلوں کے متعلق مائی نے پوچھا ”کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں.....“

”تفتیش بھی رکوا دی ہے تم لوگوں نے۔“

”کیا کرتے..... ہمارا کون تھا جو دوڑ دھوپ کرتا..... کسی پر شک بھی نہیں آتا..... فضل تو بڑا بیباک تھا۔ اس نے تو سکھیروں کو بھی معاف کر دیا تھا سب سکھیرے شادی پر آئے تھے۔ دونوں پنڈ اس ملاپ سے خوش تھے۔“

مائی نے سر کو اثباتی انداز میں جنبش دی۔ کچھ دیر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مائی نے پوچھا ”تو رشتہ طے ہے راجو کا نجو کا.....“

”ہاں میرے خیال میں طے ہی ہے..... فضل نے بارات والے دن سنا ہے بیشک میں راجو کو بڑا پیار کیا تھا اور کہا تھا یہ میری بانہہ ہے۔“

”بس؟؟؟“

یہی بتایا ہے لوگوں نے..... فضل کی کھل کر مجھ سے بات تو نہیں ہوئی تھی کبھی۔ ہاں جب بھی راجو کی اماں اور صاحبان رشتے کے لیے آئیں..... وہ سنجیدہ ہو جاتا تھا..... مائی سوچوں میں ڈوب گئی۔

”ہاں پتہ ہے مجھے۔“

”اب نجو کے لیے آئے ہیں ہم۔“

”لیکن.....“

”کیا؟“

”نحو کا رشتہ تو فضل نے طے کر دیا تھا۔“

”کب؟ کہاں؟“

”یہیں اپنے پنڈ میں.....“

”کس کے ساتھ.....“

”اپنا راجو ہے نا.....“

”راجو.....“ مائی حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھیلائے ہوئے بولی ”ہمارا

مزارع.....؟“

”ہاں.....“

”فضل کو اور کوئی نہیں ملا تھا.....“

”بس اپنی مرضی تھی نا..... اس کی ماں اور پچھی کئی بار رشتے کے لیے آئیں.....“

مائی بڑے تمسخر سے ہنسی..... ”حیرانی کی بات ہی ہے..... کیا دیکھ کر فضل نے

رشتہ کیا۔“

”شرافت..... سختی لڑکا ہے۔ پھر سب اس کے خاندان کو جانتے ہیں۔ آج ان

کے پاس زر ہے نہ زمین..... لیکن کبھی تو کئی مربعوں کے مالک تھے۔“

”ہونہہ.....“

”بی بی..... جو فضل نے مناسب سمجھا تھا کیا تھا۔ ہمیں کیا پتہ اس نے کیا سوچ کر

یہ فیصلہ کیا تھا.....“

”نحو راضی تھی۔“

”نحو سے اس نے پوچھا تھا یا نہیں؟ مجھے نہیں پتہ۔ ہاں ایک دفعہ یہ ضرور پوچھا تھا

کہ اسے شہر پسند ہے یا گاؤں۔“



ماسی را بوٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ ”سب کچھ ادھورا ہی چھوڑ گیا فضل۔ آبادی کی جگہ بربادی ہو گئی..... وہ تو اپنی شادی کے اگلے چن نجو کی ڈولی اٹھانے کا سوچ رہا تھا..... ہاہائے.....“

شام ماما اور مامی واپس چلے گئے تو نجو نے ماسی را بو سے پوچھا ”کیوں آئے تھے ماما.....“

”تیرا رشتہ پوچھنے.....“

”پھر کیا کہا.....؟“

”کیا کہتی فضل نے تو راجو کے حق میں فیصلہ دیا تھا یہی کہہ دیا۔“

نجو کے کلیجے میں جیسے تیرا تر گیا..... کرب و اذیت سے چہرے کا رنگ پیلا ہو گیا۔ لیکن

دوسرے لمحے اس کے لبوں سے ہلکی سی پھنکار نکلی ”ہونہہ.....“

ماسی را بو کچھ نہ سمجھیں۔

نجو اٹھ کر دوسرے دالان میں چلی گئی۔

-----○-----

”راجو سو ہنیا۔“

”کیوں ماں۔“

”کیا ہوا ہے تجھے۔ جی تو ٹھیک ہے نا۔“

”بس..... ٹھیک ہی ہے ماں۔“

”پریشان کیوں ہے اتنا۔“

راجو نے سر جھکا لیا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ننگی چارپائی پر بیٹھا تھا، ماں قریب ہی پیڑھی پر بیٹھی چاول تھال میں ڈالے چن رہی تھی..... پھوپھی صاحبان نے ورائڈے کے کونے میں بنے مٹی کے چولہے پر ہانڈی چڑھا رکھی تھی۔ وہ تھوم پیاز چھیل رہی تھی۔ راجو کچھ نہ بولا، تو ٹھنڈی آہ بھر کر صاحبان نے کہا ”پریشان تو ہے ہی..... فضل نہ مرتا تو آج ہمارا گھر بھی آباد ہو گیا ہوتا۔“

”لیکن صاحبان۔“ راجو کی ماں بولی ”اس میں ایسا پریشان ہونے کی تو کوئی

بات نہیں..... کچھ دن اور گزر جائیں تو.....“

”نہیں ماں۔“ راجو نے سر اٹھا کر ماں کو بڑے کرب سے دیکھا۔

”کیوں۔“

”کچھ نہیں۔“

”کیا بات ہے بتاتا کیوں نہیں۔“

”کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی۔“

”نجو سے تیرا رشتہ فضل طے کر گیا تھا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہاں نجو بیچاری کی بری حالت ہے۔ تو پترا، غم سہارتے سہارتے اسے کبھی صبر آ ہی جائے گا۔ ابھی تو

دن ہی کتنے ہوئے ہیں فضل کو مرے۔ چار چھ ماہ گزارنے ہی پڑیں گے۔ ابھی تو ہم اس رشتے کے لیے کچھ کہتے اچھے بھی نہیں لگتے۔ فضل بیچارے کا تو ابھی کفن بھی میل نہیں ہوا۔

”ہاں راجو۔“ پھوپھی صاحبان نے بھی آہ بھری۔ ”نحو کا غم آہستہ آہستہ غلط ہو ہی جائے گا۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرتا نہیں۔ لیکن غم بھی تو ایک دم غلط نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ فضل کے ساتھ نحو کو پیار بھی تو بہت تھا۔ ویر کی دیوانی تھی۔ اس کے پھٹرنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔۔۔۔۔۔“

”وقت تو لگے گا اسے سنبھلتے۔“ ماں بولی۔

”اسے تو گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں رہا۔ قبر پر بیٹھی ہوتی ہے یا کمرے میں فضل کے خون میں ڈوبے سہرے کو تکتی رہتی ہے۔ اس نے تو سکھیوں سہیلیوں کا سنگ بھی چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔۔۔“ پھوپھی ہانڈی میں تھوم پیاز ڈالتے ہوئے بولی۔

”آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔“ ماں نے کہا ”بیچاری اکیلی جان پر صدموں کا پہاڑ بھی تو اچانک ہی ٹوٹا ہے۔۔۔۔۔۔“

راجو چپ چاپ دونوں کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی لیکن راجو کا ذہن مفلوج سا ہو رہا تھا۔

اسے تو نحو کے رویے سے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم بدل گئی تھی۔ اسے یہی بات تو سمجھ نہ آ رہی تھی۔ فضل سے واقعی اسے بہت پیار تھا۔ اس کے غم میں وہ دیوانی بھی ہو سکتی تھی۔ ہوش و خرد سے بیگانہ بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن

وہ جھلی ہوئی نہ پاگل۔۔۔۔۔۔ ہوش و حواس ہی میں رہتی تھی۔ باقاعدگی سے روزانہ قبر پر جاتی تھی اور دانستہ اسے اپنی راہ میں آنے سے منع کرتی تھی۔

کیوں؟

کیوں؟

کیوں؟

یہ کیوں بڑا زہرناک ہوا جارہا تھا۔ راجو کو اس کیوں کا جواب نہ مل رہا تھا۔ اسی

لیے وہ بے چین تھا پریشان تھا مضحک تھا۔

پوری رات اس نے الجھن اور بے چینی میں گزاری۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تو بھیا تک خواب نظر آتے۔ جاگ اٹھتا تو پریشانی گھیر لیتی۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی وہ بستر سے نکل آیا۔ چادر کندھے پر ڈالی صحن میں آیا۔ کھٹکے سے ماں چونک کر بولی ”کون ہے۔“

”میں راجو ہوں ماں کھیتوں پر جا رہا ہوں۔“

”اچھا۔“

وہ کنڈی کھول کر گلی میں نکل آیا۔ سپیدہ سحر ابھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ ہوا بھی قدرے خنک تھی۔ کہیں کہیں آسمان کے سینے میں نکلے تارے جھلملا رہے تھے۔ وہ کھوہ پر آیا منہ ہاتھ دھویا اور چادر سے پونچھتا پگڈنڈی پر چل دیا۔

اس نے آج نحو سے کھل کر بات کرنے کی سوچی تھی۔ اس کا غم بجا سوگ اپنی جگہ لیکن بے رخی کیسی تھی۔ وہ آج اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

پگڈنڈی سے اتر کر وہ کچے راستے پر ہولیا۔ یہ راستہ قبرستان کو جاتا تھا۔

نحو اسے قبرستان کے قریب ہی مل گئی۔ وہ چادر لپیٹے اپنے خیالوں میں کھوئی چلی جا رہی تھی۔

”نحو۔“ راجو نے اسے پکارا۔

نحو کی پلٹ کر دیکھا راجو اس کے قریب آ گیا۔

”نحو۔۔۔۔۔۔“ اس کی آواز فرط جذبات سے بھرا گئی۔

نحو کے وجود میں اک غیر محسوس سی کپکپاہٹ طاری ہوئی۔ اس نے راجو کی طرف دیکھا۔

لیکن فوراً ہی منہ پھیر لیا۔

نحو۔ راجو کی بے تابی دید کے قابل تھی۔

”راجو۔۔۔۔۔۔“ وہ قدرے توقف کے بعد کھنک دار لہجے میں بولی۔

”ہاں۔“

”تو آج پھر یہاں آیا ہے۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”تجھے پتہ نہیں.....“

”میں اپنے دیر کی قبر پر جاتی ہوں اور تو میرا راستہ روک لیتا ہے۔“

”نحو خدا کے لیے اپنے اوپر رحم کر مجھ پر رحم کھا.....“

نحو نے اک ٹھنڈی آہ بھری اور سپاٹ لہجے میں بولی ”تو ادھر نہ آیا کر۔“

”تو کدھر آیا کروں۔ کچھ مجھے بھی تو بتا۔ تیری بے رخی مجھے مار ڈالے گی۔ تو

کیوں بدل گئی ہے نحو۔ کیوں بدلتی جا رہی ہے..... پہلے والی نحو.....“

”مرگئی اپنے دیر کے ساتھ ہی۔“ نحو کی آنکھوں سے شعلے کی لپک اک لمحہ کو

دکھائی دی۔ راجو کی بات کاٹتے ہوئے اس نے آہنی لہجے میں کہا ”اب صرف فضل کی بھین

زندہ ہے.....“

”نحو۔“ راجو کچھ نہ سمجھا۔

”تجھے میں نے پہلے بھی کہا تھا اب بھی کہہ رہی ہوں میرے راستے میں نہ

آیا کر.....“

”نحو۔ نحو تجھے کیا ہو گیا ہے۔“

”جو ایک پیارے دیر کی لاڈلی بھین کو ہونا چاہیے.....“

راجو جذباتی سا ہو گیا۔

بولا ”پگلی، جھلی، کملی..... تیرا دیر مر چکا ہے۔ تو جو کچھ بھی کرے وہ واپس نہیں

آ سکتا..... زندگی کی سچائی کا مقابلہ کر نحو۔ اس طرح کرنے سے کیا ہوگا.....“

”میں سب جانتی ہوں سب سمجھتی ہوں۔“

”نحو.....“

”چلا جا راجو..... اور اب نہ آنا ادھر۔“

جلدی سے قدم اٹھاتے ہوئے نحو نے کہا..... راجو ہونقوں کی طرح اسے تکتا رہ گیا۔

وہ قبرستان کے اندر چلی گئی اور راجو کچی منڈیر پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اور

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ صبح کی نورانی روشنی چاروں اور پھیل گئی۔ قبرستان کے

سوگوار ماحول میں پرندوں کی چہکاریں گونجنے لگیں۔ کچے راستے پر لوگ آنے جانے لگے۔

تیل گاڑیوں میں جتے بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی مخصوص آوازیں فضا میں ترنم

بکھیرنے لگیں۔

راجو منڈیر سے اٹھا۔

ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے چادر کندھے پر درست کی۔ کپڑے جھاڑے اور ہاتھ

چادر سے پونچھتے ہوئے حسرت بھری نظروں سے قبرستان کو دیکھا۔ نوکیلے خاردار درخت

کے نیچے فضل کی قبر پر نحو بیٹھی تھی۔

وہ ایک دم چونک گیا۔

نحو اکیلی نہ تھی۔

دوسری طرف کوئی مرد بیٹھا تھا۔

کشمیری دوشالہ کندھوں پر ڈالے قبر کے پہلو میں بیٹھا۔ دونوں آمنے سامنے تھے۔

راجو کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مرد کی اس کی

طرف تقریباً پشت تھی وہ پہچان نہ سکا۔

”شاید فضل کا کوئی رشتہ دار ہو قبر پر فاتحہ کے لیے آیا ہو۔“ اس نے سوچا۔

لیکن

اس کی چھٹی حس نے اس کے من میں وسوسہ پیدا کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور

درختوں کی آڑ میں ہوتا قبر کے نزدیک جا پہنچا۔

اس کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی آسمان گھومنے لگا اور آنکھوں میں

رنگ برنگے دائرے اترنے لگے۔

وہ تاج سکھیرا تھا۔

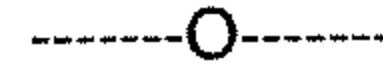
تاج سکھیرا۔

جس کے ساتھ نجو ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔  
اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔ آنکھیں ملیں اور پھر پوری آنکھیں کھول کر  
دونوں کو دیکھا۔

دونوں باتوں میں مشغول تھے۔ دونوں نے ہاتھ قبر پر اوپر تلے رکھے تھے۔  
”تو ادھر نہ آیا کر..... تو ادھر نہ آیا کر۔“ نجو کی آواز راجو کے من میں گونج گونج گئی۔  
وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں بند کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگا۔ اک قبر سے  
ٹھوکر کھا کر گرا۔

اور

کئی لمحے گرا پڑا رہا..... اس کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔



”تاج۔“

”ہاں۔“

”ایک بات کہوں۔“

”سو کہو..... سوہنیو۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔“

”تو کہو۔ میں بھی سنجیدگی سے سنوں گا۔“

”تو نے میرے دیر کی قبر پر میرا ہاتھ پکڑا تھا۔“

”ہاں ایک عزم کے ساتھ پکڑا تھا اور اس عزم پر میں قائم ہوں۔“

”تیرے قائم ہونے سے بات نہ بنے گی۔“

”تو.....“

”تو.....“

”ہاں ہاں۔“

”اب مجھے ہی کہنا پڑے گا تو نہیں سمجھتا..... اب اور کتنی دیر انتظار۔“

”شادی۔“

”نجو نے اک ادائے دلربائی سے سر اثبات میں ہلایا۔ تاج خوشی سے دیوانہ

ہو گیا..... بے اختیاری سے بازو پھیلائے۔

لیکن

نجو نے اس کے پھیلے ہوئے بازو اپنے دونوں ہاتھوں سے روک کر کہا

”ابھی..... نہیں تاج۔“

”پہلے شادی۔“ وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”کب؟“

”بہت جلد۔“

”بات یہ ہے تاج.....“ نجو درخت کے ساتھ کمر نکائے ہوئے سر جھکا کر شرکیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

تاج کے جذبات میں طوفانی ہلچل مچی تھی۔ محبوب کی ان اداؤں پر مر مٹا۔ جلدی سے بولا..... ”کیا بات ہے۔“

”تجھے پتہ نہیں شاید۔“

”کس بات کا۔“

”میرے لیے ڈھیر سارے رشتے آئے ہیں۔“

”اچھا؟“

”ہاں۔“

”کہاں کہاں سے۔“

”ہمارا ایک ماما می شہر میں رہتا ہے۔“

”چودھری نظام۔“

”ہاں۔“

”پھر؟“

”وہ ماسی راہو کے پاس دو تین دفعہ آئے ہیں۔ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر وکیل بن گیا ہے۔“

”ہاں میں اسے جانتا ہوں۔“

”اور شاہ پور کے چودھریوں نے بھی رشتہ بھیجا ہے۔“

”اوہ میرے خدا۔“

”اور تو یہ بھی جانتا ہے نا کہ فضل میرا رشتہ راجو سے کرنا چاہتا تھا۔“

”ہاں۔“

”کچھ لوگ تو کہتے ہیں بارات والے دن فضل نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا تھا۔“

”یہی سنا تھا میں نے بھی۔“

”اب وہ اسی شہ پر اپنی ماں اور چھپی کو ہمارے گھر بھیجتا ہے۔“

”رشتے کے لیے۔“

”ہاں..... وہ لوگ کہتے ہیں کہ فضل رشتہ انہیں دے گیا تھا۔“

”پھر..... پھر نجو.....“

”گھبرائے کیوں ہو..... فضل اب اس دنیا میں کہاں ہے۔“

نجو نے غور سے تاج کو دیکھا۔ تاج کچھ مضطرب سا نظر آیا..... دونوں ڈھلتی شام کو درگاہ کے پچھواڑے سنان جگہ پر درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈوں میں چھپی جگہ پہ کھڑے تھے۔ اب نجو نے اسے قبر پر آ کر ملنے سے منع کر دیا تھا۔ ملاقات کے لیے یہ جگہ بھی اسی نے تجویز کی تھی۔

تاج بے تابی کے عالم میں اپنے ہی ہاتھ مروڑے جارہا تھا۔ نجو اسے دیکھ کر ہنس پڑی۔

”کیوں؟ کیوں ہنسی ہو۔“

”پھر وہی بات۔ کیا تو بھی مجھے ہنستے نہیں دیکھنا چاہتا.....“

”بعض اوقات تو بڑے بے تکے پن سے ہنس دیتی ہو۔“

”اور تجھے لگتا ہے میں جھلی ہو گئی ہوں۔“

”نہیں..... یہ بات نہیں۔“

”پھر؟“

”چھوڑ اس بات کو۔ یہ بتا راجو کے گھر والوں کو تم نے کیا جواب دیا۔“

”ابھی نہیں دیا۔“

”کیوں۔“

”جب تک تیری طرف سے کوئی رشتہ لے کر نہیں آئے گا میں اسے کیسے جواب

دے سکتی ہوں..... ماسی راہو تو ایک دم میرا ہاتھ مامے نظام دین کے بیٹے یا شاہ پور کے

چودھریوں کے ہاتھ میں دے دے گی۔“

”نہیں..... نہیں نجو؟“ تاج بے اختیاری سے بولا۔

”میں کب یہ چاہتی ہوں تو تسلی رکھ پر.....“

”میں آج ہی بھارتیہ سے بات کرتا ہوں۔“

”جو وہ نہ.....“

”نہ مانے؟“

”ہاں۔“

”تو بہ کر نجو..... وہ تو اس بات پر خوشی سے پھولے نہ سائیں گے۔“

”واقعی۔“

”ہاں۔ اس کی بھی فضل کی طرح یہ خواہش ہے کہ سکھروں اور ملکوں کی دوستی

قائم رہے۔“

نجو نے غور سے تاج کو دیکھا۔ وہ گھبرا کر بولا ”کیا دیکھ رہی ہے۔ میں سچ کہہ رہا

ہوں۔ بھارتیہ اور بھارتیہ دونوں ہی دنگے فساد کو برا سمجھتے ہیں۔“

”اور تو؟“

تاج اس سوال پر سر تاپا کانپ گیا۔ نجو اسے سر تاپا مجسم سوال دکھائی دی۔ وہ پلکیں

جھپکا جھپکا کر اسے تکانے لگا۔

نجو ہنس دی..... اور بڑی دلنوازی سے بولی ”اب تو کیوں مجھے اس طرح تک

رہا ہے۔“

”کچھ نہیں، کچھ نہیں۔“ وہ نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

”کچھ نہیں تو نہ سہی.....“ نجو اب بھی شان محبوبی دکھا رہی تھی۔ ”میں نے تجھے بتا

دیا ہے اب جو جی چاہے کر..... دیر کر دی تو ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔“

”میں آج ہی بات کروں گا نجو..... اور اگر وہ نہ مانے تو بھی میں تجھے مانگ

لوں گا.....“

”ہائے ہائے.....“ وہ شوخی سے کھلکھلا کر ہنس دی۔

تاج ایک بار پھر لوٹ پوٹ گیا.....

نجو بولی ”تو تو مجھ سے بڑا پیار کرنے لگا ہے سکھیرے۔“

”ہاں..... اتنا..... اتنا..... کہ بتا ہی نہیں سکتا.....“

”اپنی بات پر قائم رہے گا نا۔“

”ہمیشہ..... ہمیشہ.....“ وہ جذباتی لہجے میں بولا..... ”اور تو.....“

”میں؟“

”ہاں۔“

”میں تو تجھے چھوڑوں گی نہیں سکھیرے.....“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اچھا تو کب بھیجے گا بھائی کو ہمارے گھر.....“

”کل..... کل نہیں تو پرسوں.....“

”تجھے پکا پکا یقین ہے نا۔ مان جائیں گے تیرے گھر والے۔“

”بالکل بالکل.....“

”بس ٹھیک ہے..... فکر دور ہو گئی میری.....“

”اور.....“ تاج کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا بات ہے۔“ نجو نے نیم باز نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ..... وہ جو راجو ہے نا۔“

”ہاں ہاں۔“

”اس نے کوئی پھنڈا ڈال دیا تو.....“

”راجو نے.....؟“ ”وہ کیوں؟“

”بھئی پنڈ میں بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ فضل نے تیرا رشتہ اس سے کر دیا تھا.....“

”ہائے ہائے سکھیرے..... اتنا بزدل ہے تو؟“

”میں بزدل نہیں ہوں پر.....“

”اور کیا کر سکتا ہے راجو.....“ نجو نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ”جب میں تیری

ہوں..... میرا کون سا ماں باپ بیٹھا ہے یا بھائی ہے جو میری تقدیر کا فیصلہ کرے گا۔ فیصلہ تو

میں نے ہی کرنا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

”اور تو جانتا ہے..... فیصلہ میں نے تیرے حق میں کر بھی لیا ہے۔“

”اونجو.....“

”اونجو.....نچو.....“

نچو ہنس پڑی۔

”خوش ہو گیا ہے۔“

”ہاں۔“

”راجو کا دھڑکا دل سے نکال دے۔“

”جب تو میرے ساتھ ہے تو دھڑکا کس بات کا..... میں اسے خاطر میں لاتا ہی نہیں۔“

”شاباش..... اور دیکھ.....“

”ہاں۔“

”راجو اول تو غریبی کا مارا تیری راہ میں آنے کی جرأت ہی نہیں کرے گا..... اور

اگر اس نے چوں چوں کی تو پتہ ہے کیا کرنا.....“

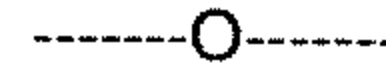
”کیا؟“

نچو نے شوخی سے آنکھیں منکاتے ہوئے گردن کاٹنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا ”یوں۔“

وہ خود ہی ہنس پڑی۔

تاج کے من کا چور چل اٹھا..... گھبرا کر اس نے نچو کو دیکھا نچو نے بات ہنسی میں

اڑادی۔



”نی ماسی راہو۔“

”ہاں۔“

”کچھ سنا ہے میں نے..... وہ سکھیرے۔“

”سب نے ہی سنا ہے۔“

”سچ ہے بات۔“

”ہاں۔ رفیق اور شفیق دونوں بھرا آئے تھے۔“

”تو.....“

”مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“

”تاجا اچھا آدمی نہیں ہے۔“

”سنا تو یہی ہے۔“

”پھر؟“

”پھر میں کیا بتاؤں۔“

”نچو کو پتہ ہے۔“

”ہاں.....“

”عجیب حالات ہیں..... فیصلہ کون کرے گا۔“

”رشتے پر رشتے آرہے ہیں شہر سے فضل کا ماما می آئے تھے۔“

”ان کا پتر بڑا پڑھا لکھیا ہے۔“

”ہاں وکیل ہے۔“

”پر رشتوں کی بات ہو کیوں رہی ہے۔ فضل نے تو راجو کے ساتھ بات طے کی تھی.....“

”کس بات کا۔“

”تو نے نہیں سنا۔“

”کیا۔“

”سکھیر وں نے ملک فضل کی بھین کا رشتہ مانگا ہے۔“

”کیا۔“

”مولادی قسمے..... سارے لوگ ہی باتیں کر رہے ہیں۔“

”نہیں وے.....“

وہ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ چھوٹی گلی سے برکتے اور شاد و نکل آئیں۔

”ہائے چاچی۔“ شاد و ایک دم بول اٹھی۔

”کیا ہوا۔“ راجو کی ماں کے سر پر گڈ واڈول گیا۔

”نہو کا رشتہ سکھیر وں نے مانگا ہے۔ تاج سکھیرے کے لیے.....“ برکتے بولی۔

راجو کی ماں سنبھل کر بولی ”تو کیا ہوا جہاں بیری ہو وے آتے ہی ہیں ہم نے

بھی تو رشتہ مانگا ہوا ہے..... اور فضل کو اللہ بخشے..... یہ رشتہ طے بھی کر گیا تھا.....“

”ہوں ہوں۔“ برکتے نے مایوسی سے سر ہلایا ”طے کر دیا ہوتا تو بات ہی نہ ختم

ہو جاتی۔ ساری گل تو یہی ہے کہ رشتہ اس نے طے نہیں کر دیا تھا۔ صرف بات کی تھی..... اسی

لیے تو سکھیرے لے آئے رشتہ.....“

راجو کی ماں کا دل ڈوبنے لگا۔ بیٹے کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔

اداس پریشان اور زبوں حال راجو..... شاید اسے پہلے سے یہ بات معلوم تھی.....

راجو کی ماں کھیتوں پر جانے کی بجائے واپس لوٹ آئی.....

”کیوں بھابی۔“ صاحبان کے صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ مرغیوں نے بیٹھ بیٹھ

کر سارا صحن گندا کیا ہوا تھا۔

راجو کی ماں کچھ کہے بغیر چار پائی پر آ بیٹھی گڈ واڈول رکھا اور دسترخوان میں

بندھی ہوئی روٹی اور ساگ چار پائی پر رکھتے ہوئے بولی ”صاحبان۔“

”ہاں بھابی۔“

”کاش وہ پکی بات کر گیا ہوتا۔ شگن ہی کر دیا ہوتا تو میری جان چھوٹ

جاتی.....“

سکھیرے رشتہ لے کر آئے تھے۔ غریب راجو کی جان عذاب میں آگئی تھی جو

کوئی بھی سنتا تحقیق کے لیے اس کے پاس دوڑتا۔

عورتیں اور مرد اس کے پاس آ رہے تھے۔ یہ عجیب اور انہونی سی بات تھی۔ گو

فضل نے سکھیر وں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا سارا پنڈ جانتا تھا پھر بھی لوگ یہ بھی نہیں

بھولے تھے کہ فضل کے باپ ملک رحمت علی کو انہی سکھیر وں نے مار ڈالا تھا۔ تاج کا باپ

نذر سکھیرا ملک رحمت علی کے جانے پہچانے قاتلوں میں سے تھا۔

اب باپ کے قاتلوں نے رشتہ مانگا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ فضل نجو کی

بات غیر رسمی طور پر راجو کے ساتھ طے کر گیا تھا۔ لوگوں کے لیے حیرت اور اچنبھے کا

باعث تھی۔

سکھیرے آئے بھی تو خاموشی سے نہیں تھے نا۔ گیارہ سینیاں مٹھائی کی لے کر

آئے تھے۔ بڑے سے بڑا زمیندار بھی رشتہ لینے اس دھوم سے نہ جاتا ہوگا۔ خوش بھی بہت

تھے۔ اپنی خوشی کا اظہار انہوں نے برملا کیا تھا۔

لیکن

لوگوں کو موضوع مل گیا تھا۔ بات انہونی تھی۔ باپ کے قاتل سکھیرے رشتہ لینے

آئے تھے۔ رشتہ بھی تاج کے لیے جو شہری بابو بن گیا تھا جس کی فاشی اور عیاشی کی داستانیں

شہر سے اڑ کر پنڈ پہنچتی تھیں جو زانی تھا شرابی تھا عورتوں کا دلدادہ تھا ناچ گانے کا رسیا تھا۔

اور

جس نے ایک پٹھانی عورت گھر میں ڈال رکھی تھی۔

کھیتوں میں گلیوں میں دو دو چار چار مرد عورتیں سر جوڑے یہی قہے

کر رہے تھے۔

راجو کی ماں کھیتوں کو جا رہی تھی۔ سر پر راجو کی روٹی اور لسی کا گڈوا رکھا تھا.....

جامو میراٹی راہ میں مل گیا..... ملتے ہی بولا ”چودھرائی بڑا افسوس ہے.....“



”کھانا پیتا تو کچھ ہے نہیں وہ..... اللہ جانے کون سا روگ لگا بیٹھا ہے جی کو.....“  
 ”کہانا بھائی..... فکر نہ کر..... ہو ہی جاتی ہیں ایسی باتیں..... جوانی میں۔ لڑائی تو  
 پیار ہی کا حصہ ہوتی ہے.....“

راجو کی ماں نے ٹھنڈی آہ بھری اور صاحبان کے کہنے پر راجو کا بھتہ لے کر پھر  
 کھیتوں کی جانب چل دی۔

راجو کھوہ پر تھا..... رہٹ چل رہا تھا اور وہ بیلوں کے پیچھے گدی پر بیٹھا ہوا تھا.....  
 وہ ارد گرد سے بے خبر سا تھا..... سوچ اس کی آنکھوں میں جم گئی تھی۔ چہرہ بالکل سپاٹ  
 اور ویران تھا۔

ابھی ابھی چودھری اکبر علی کے بیٹے نصیر نے سکھیروں کے رشتہ کی خبر اسے  
 سنائی تھی۔

یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ پھر بھی اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا..... وہ اسی حالت میں  
 گدی پر بیٹھا تھا اور بیل گھوم رہے تھے۔ ٹنڈیں پانی بھر بھر کر کھوہ سے ابھر رہی تھیں اور خالی  
 ہو ہو کر ڈوب رہی تھیں۔ چکر بڑی ضابطگی سے چل رہا تھا۔

ماں نے کھانا اور لسی کا گڈواٹھوٹے ہوئے درخت کے تنے پر رکھ دیا۔ راجو کو ماں  
 کے آنے کی جیسے خبر ہی نہ ہوئی۔

”راجو..... راجو پتر۔“

ماں نے کئی بار اسے پکارا تو وہ جیسے کسی دوسری دنیا سے لوٹ آیا۔

”کیوں ماں۔“ وہ گدی سے کود کرا ترا اور ماں کے پاس آ گیا۔

”کھانا لائی ہوں..... کھالے کچھ۔ رات کو بھی بھوکا ہی پڑ رہا تھا.....“

”کھالوں گا..... رکھ دے۔“

”یہ رکھا ہے۔“

”بس رہنے دے..... میں کھالوں گا..... کھیتوں کو پانی دے رہا تھا تو نے رہٹ

روک دیا۔“

”اتنی دفعہ تجھے پکارا..... سن ہی نہیں رہا تھا.....“

وہ ایک دم کچھ نہ کہہ سکی۔ دل جیسے اڑتا جا رہا تھا۔

”کیوں بھابی۔“ جھاڑو والا ہاتھ روک کر صاحبان نے پوچھا ”کیا بات ہے۔“  
 ”سنا ہے کچھ۔“

”کیا۔“

”ملک فضل کی بھین کے لیے تاج سکھیرے کا رشتہ آیا ہے۔“

”ہائے نہیں بھابی۔“

”سچ کہہ رہی ہوں.....“

”تو کیا ہوا.....“

”لو کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہماری کیا اوقات ہے سکھیروں کے سامنے.....“

”ہے کیوں نہیں۔ ہم کوئی ملکوں کے قاتلوں میں سے تو نہیں ہیں نا۔“

”کیا قصہ لے بیٹھی ہے۔ مجھے تو اپنے چن ورگے پتر کا غم لگ گیا ہے۔ اسی لیے  
 وہ کئی دنوں سے پریشان تھا شاید۔“

”اے نہیں بھابی..... کڑیاں منڈے اک دوسرے سے روٹھ راٹھ بھی تو جاتے  
 ہیں۔ مجھے یقین ہے راجو اور نجو بھی آج کل روٹھے ہوئے ہیں۔“

”پر کیوں؟“

”لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ روٹھے ہیں تو مان بھی جائیں گے۔“

”نہیں صاحبان۔ میرے تو دل میں ہول اٹھ رہے ہیں۔ رشتہ سکھیرے لے  
 جائیں گے۔“

”اے رب نہ کرے..... تجھے نہیں پتہ بھابی..... پر میں جانتی ہوں راجو اور نجو

ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں..... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کون سا نجو کا ماں پیو زندہ بیٹھا  
 ہے جو اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ کرے گا..... چھوڑ تو فکر نہ کر.....“

”ہوں۔“ بات راجو کی ماں کے دل لگی۔

صاحبان پھر جھاڑو دینے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ بولی ”جاروٹی تو دے آپتر کی صبح

سے بھوکا بیٹھا ہوگا۔“

جیراں اور بکوماسی راہو کے پاس زمین پر بیٹھے تھے۔ راہو چارپائی پر بیٹھی بیچاری سمجھ نہ پار ہی تھی کہ کیا کرے۔

”بکو۔“

”جی ماسی۔“

”جاذ راتو کی ماں ہی کو بلالا۔“

”کیا کام ہے۔“

”یہی۔۔۔۔۔“

”پر ماسی۔“ جیراں نے دخل اندازی کی۔

”ہاں۔“

”نحو نے جو کہہ دیا ہے۔۔۔۔۔ کہ رشتہ طے کر دے۔“

”ہائے ہائے۔۔۔۔۔ وہ بچی ہے کیا سمجھ رکھتی ہے۔“

”ویسے سارے پنڈ میں باتیں بڑی سن رہی ہوں۔ کوئی کہتا ہے یہ رشتہ ہو جانا چاہیے کوئی کہتا ہے دشمن ہیں کبھی نہ کبھی ڈنک ماریں گے۔ یہ رشتہ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔“

”دونوں باتیں ہی ٹھیک ہیں۔“ بکو ماسی کی بجائے جیراں نے جواب دیا۔

”لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی نحو کو ہو کیا گیا ہے۔ دیر سے اتنا پیارا اور اس کا کیا ہوا رشتہ دھتکار رہی ہے۔“

”ہاں تو ٹھیک کہتی ہے ماسی۔ کڑی کو غم کھا گیا ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں چل رہا کہ کیا بات کرنی ہے کیا نہیں۔“

راجو پھر رہٹ کی طرف چلا تو ماں نے منت سے کہا ”کیوں جان کا بیری ہو رہا ہے۔ کیا مل جائے گا تجھے کھانا تو کھالے۔“

راجو نے غور سے ماں کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے بولا ”کیوں فکر کرتی ہو، مر نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔“

”مریں تیرے دشمن۔“

”وہ ہنس دیا۔ بے اختیارانہ ہنس دیا اور پھر ہنستے ہنستے بولا ”غریبوں کے دشمن نہیں مرتے ماں۔۔۔۔۔“

ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔۔ لیکن آنسو آنکھوں ہی میں پی کر بولی ”تو فکر نہ کر بچیا میں تیرے حق کے لیے ہر کوشش کروں گی میں پھر راہو کے پاس جاؤں گی۔۔۔۔۔“

”نہیں ماں۔“ راجو نے سختی سے کہا ”اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تجھے شاید پتہ نہیں نحو کے لیے تاج سکھیرے کا رشتہ آیا ہے۔۔۔۔۔“

”پتہ ہے۔“

”راجو جیراں ہو کر بولا ”پتہ ہے پھر بھی کہتی ہے راہو کے پاس جاؤں گی۔“

”ہاں۔“

”مت جانا۔“

”جاؤں گی۔“

”کو راجو اب مل جائے گا ماں۔۔۔۔۔ مت جانا۔۔۔۔۔ بھرم ہی رہنے دے۔ بھرم ہی۔۔۔۔۔ رہنے دے۔۔۔۔۔“

راجو رہٹ کی گدی پر جا بیٹھا۔۔۔۔۔ بیل پھر چکر میں گھومنے لگے۔ پانی کی ٹنڈیں بھرنے اور خالی ہونے لگیں۔

”اسی لیے تو کہتی ہوں رتو کی ماں کو بلا لو۔ اس سے کچھ صلاح کر لوں۔“

”اس سے تو بہتر ہے پھپھی سیکینہ اور اس کے میاں کو بلا لے۔“

”وہ بیچارے تو مر چکے ہیں دھی جھلی سی ہو گئی ہے۔ سارا دن دونوں میاں بیوی روتے رہتے ہیں۔“ ماسی رابو بولی۔

”ہائے ان کے ساتھ ہوئی تھوڑی ہے۔۔۔۔۔ پھر دھی کملی ہو گئی۔۔۔۔۔“ جیراں نے کہا۔

”ہائے ہائے۔“ ماسی رابو نے دلدوز آہ کھینچی۔

جیراں اور بکو بھی افسوس کرنے لگے۔

”جا تو رتو کی اماں کو بلا لا۔۔۔۔۔“ ماسی رابو نے چند لمحوں بعد کہا ”اس سے ہی کچھ صلاح لے لوں۔۔۔۔۔“

”جاتا ہوں پر وہ کیا کر لے گی۔۔۔۔۔ نجو نے خود ہی کہہ دیا ہے تجھے پھر۔“

”کہہ تو دیا ہے۔۔۔۔۔ پر مجھے راجو کی ماں اور صاحبان کا بھی خیال آتا ہے۔ بڑا منت ترا کر رہی ہیں اس رشتے کے لیے۔“

”خواہش تو چودھری نظام اور ان کی بی بی کی بھی ہے۔“

”اس طرح تو کئی خواہش مند ہیں۔۔۔۔۔ جا اس کو بلا لا۔ سمجھدار عورت ہے کچھ تو بتائے گی۔“

”اچھا ماسی۔“

”بکو اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا۔۔۔۔۔ ماسی رابو جیراں سے بولی ”جاذ را چلم تو بھر لا۔۔۔۔۔ بجھ گیا ہے حقہ۔“

”اچھا ماسی۔ لا بھر لاؤں چلم۔ آگ ہے چولہے میں۔“ جیراں بھی اٹھی۔

بکو دالان سے باہر نکلا اس کے پیچھے پیچھے جیراں حقے کی چلم بھرنے نکلی۔

فضل والے دالان کے دروازے پر نجو کھڑی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو بکو۔“ اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

”ذرا رتو کی اماں کو بلا نے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”ماسی رابو نے بلایا ہے۔“

”کس لیے۔“

نجو کی آواز کی تیزی سے بکو کا دل دہل گیا۔ حیران حیران نظروں سے نجو کی طرف دیکھا۔

”بتاتے کیوں نہیں۔“ وہ زوردار لہجے میں بولی۔

”ماسی رابو نے اس سے صلاح لینی ہے۔“

”کس بات کی۔“

”جی۔۔۔۔۔ اسی سے پوچھ لے نجو بی بی۔۔۔۔۔“

”واپس آ۔“ نجو گرجی۔ وہ دروازے سے صحن میں آ گئی۔

بکو اپنی جگہ پر جیسے بت بن گیا۔ جیراں بھی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نجو اونچی آواز میں بولی ”میں مالک و مختار ہوں ہر بات میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ خبردار جو کسی نے میری مرضی کے خلاف کوئی کام کیا۔۔۔۔۔“

بکو اور جیراں حیران و پریشان رہ گئے۔ نجو کو انہوں نے گود کھلایا تھا۔ اتنی عمر ہو گئی تھی۔ اس حویلی میں کبھی انہوں نے سخت بات نہ سنی تھی۔

”کوئی انہیں نوکر چا کر سمجھتا ہی کب تھا۔ حویلی میں تو وہ کنبے کے فردوں کی طرح رہتے تھے۔ آج نجو نے انہیں اپنے اور ان کے درجے کا جیسے احساس دلایا۔ دونوں گنگ سے رہ گئے۔

آوازیں سن کر ماسی رابو بھی لاٹھی ٹیکتی باہر نکل آئی۔

”کیا بات ہے دھی۔“ اس نے دہلیز پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ کھڑا رہا ہی نہ

جاسکا۔

”ماسی۔“ نجو شیرنی کی طرح بولی۔

”ہاں پترا۔“

”کیوں رتو کی ماں کو بلا رہی تھی۔“

”ماسی رابو چپ ہو گئی۔“

”میں نے تجھے اپنے فیصلے سے آگاہ نہیں کیا؟“

”کیا ہے۔“

”پھر کیا گنجائش رہ جاتی ہے لوگوں سے صلاح مشورہ کرنے کی۔“

”دھیے۔۔۔۔۔“

”بس ماسی۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔“

”نحو۔۔۔۔۔ سوچ سمجھ کر بات کر۔“

”بہت سوچ لیا۔۔۔۔۔“

”تو نا سمجھ ہے۔“

”تیری غلطی ہے جو ایسا سمجھتی ہے۔“

”دھیے۔۔۔۔۔“

”بس ماسی۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ وقت ضائع نہیں ہونا چاہیے تو سکھروں کو

ہاں کر دے۔۔۔۔۔“

بکو اور جیراں نے چونک کر نحو کو دیکھا۔ اس کی دماغی صحت پر جیسے شک تھا انہیں۔

ماسی رابو نے بھی اپنی چندھیائی نظریں نحو کے چہرے پر گاڑ دیں۔ پھر وہ آہستگی

سے بولی ”تیرے دیر نے تیرا رشتہ رابو کو دینا تھا۔۔۔۔۔“

”ماسی۔“ وہ چیخنی اور پھر دوڑ کر ماسی رابو کے سامنے دوڑا نو ہو کر اسے گھٹنوں سے

پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی ”بار بار یہی کہتی ہے تو۔۔۔۔۔ میرے دیر نے یہ رشتہ رابو کو دینا

تھا۔ کہاں ہے میرا دیر۔۔۔۔۔ لا۔۔۔۔۔ لا۔۔۔۔۔ لا۔۔۔۔۔ کہیں سے مجھے میرا دیر میں کر لوں گی رابو

سے شادی۔ دے مجھے میرا دیر میں مان لوں گی تیری بات۔۔۔۔۔ دے۔۔۔۔۔ دے۔۔۔۔۔ دے۔۔۔۔۔ میرا

دیر لا دے۔“ نحو دیوانوں کی طرح کہے جا رہی تھی۔ ماسی رابو نے اسے بازوؤں میں بھر کر

کلیجے سے لگا لیا۔

وہ زار و قطار رونے لگی۔۔۔۔۔ اور نحو بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

بکو اور جیراں دونوں ششدر سے کھڑے تھے۔ نحو کو بے دم سا ہوتے دیکھا تو

جیراں لپک کر آئی۔۔۔۔۔ ماسی کے بازوؤں میں اکھڑے اکھڑے سانس لیتی نحو کو اس نے سمجھنے

لیا۔۔۔۔۔ اور پھر اٹھاتے گھسیٹتے اسے چار پائی پر لا ڈالا۔

نحو کتنی ہی دیر بے ہوش پڑی رہی۔

اور

ماسی رابو سسک سسک کر روتی رہی۔

-----○-----

نہ رہی تھی۔

”یہ میرے دیر کا پستول ہے۔“ وہ خود ہی ہنس پڑی ”ہر وقت ڈب میں رکھتا تھا۔ آخری دنوں میں..... پھر بھی اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔ ایک گولی ہی چلا دیتا..... قاتل کے سینے میں اتار دیتا..... ہونہہ بزدل تھا شاید..... نہیں اسے موقع ہی نہ ملا..... اور خنجر سینے میں اتر گیا۔“

”نحو۔“ رتو نے اسے کندھے سے ہلا دیا۔

نحو نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ پستول رکھ کر خنجر اٹھالیا۔ ”یہ خنجر بھی تو تھا اس کے پاس ایک پل میں سینے میں اتر جاتا ہے..... پھر پتہ ہے کیا ہوتا ہے..... خون..... خون کا فوارہ ابل پڑتا ہے..... سہرے کی لڑیاں اس میں بھیگ جاتی ہیں۔ کپڑے ڈوب جاتے ہیں۔ چہرہ ڈوب جاتا ہے۔

”نحو..... کیا ہو رہا ہے تجھے۔ رکھ دے خنجر.....“ رتو نے وحشت بھری نظروں سے نحو کے ہاتھ میں چمکتے خنجر کو دیکھا۔

نحو ہنس پڑی۔

رتو کو اس کی ہنسی عجیب لگی۔

”نحو تو ہوش میں تو ہے نا۔“ رتو نے سراپیمہ ہو کر پوچھا۔

وہ پھر ہنس دی.....

خنجر کیس میں رکھ کر اس نے کاغذات اٹھالیے۔ یہ میرے دیر کے نام کی رجسٹریاں ہیں۔ زمینوں کے حویلی کے باغوں کے کاغذات ہیں.....“

وہ کاغذوں کے پلندے اپنے سامنے رکھ کر بولی ”کچھ بھی تو نصیب نہ ہوا۔“

”نحو۔“ رتو نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

”کیا ہے۔“ وہ دھندلائی آنکھوں سے اسے تنکے لگی۔ رتو نے دیکھا آج پھر اس کی آنکھوں سے پچان کی چمک غائب تھی پراسرار سی دھند پھیلی تھی آنکھوں میں۔ وہ ڈر گئی۔

”نحو۔“ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اپنا ہوش ہی نہیں رہا تجھے.....“ رتو روہانسی

ہو کر بولی۔

رتو آئی تو نحو دالان میں فضل کی چیزیں کھولے بیٹھی تھی۔ درمی پر اس نے فضل کے کپڑے کاغذات پستول پرانے خاندانی خنجر اور دونالی بندوق رکھی ہوئی تھی۔

رتو دروازے میں کھڑی اسے تنکتی رہی۔ جب نحو نے اس کی طرف نگاہ تک نہ اٹھائی تو وہ اندر آ گئی۔

”نحو۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہوں۔“

”کیا کر رہی ہو۔“

”ویر کی نشانیاں سمیٹ رہی ہوں۔“

رتو نے ساری چیزوں پر اک نگاہ ڈالی۔ اسے ان چیزوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ تو نحو کو آخری بار سمجھانے آئی تھی۔ تاج سکھیرے کو سارا پنڈ جانتا تھا۔ راجو کے پیار کو رتو جانتی تھی۔ وہ اس وقت نحو سے لڑ کر جھگڑ کر راجو کے حق میں فیصلہ کرانے آئی تھی۔

”رتو..... یہ میرے دیر کا دھسہ ہے۔“

”یہ اس کی پگ ہے۔“

”یہ اس کے کرتے ہیں۔“

”یہ کئی والے تہندا سے بہت پسند تھے۔“

”یہ اس کی واسکٹ ہے..... شہر پہن کر جایا کرتا تھا۔“

”ہاں نحو.....“ رتو نے اس کی ساری باتوں میں کہا ”یہ سب چیزیں کسی غریب کو

دے دے۔ بھلا فضل کی روح کو سکون ملے گا۔ یہ چیزیں سنبھال کر کیا کرے گی۔“

”دیکھا کروں گی۔ دیر نہ سہی۔ ویر کی نشانیاں ہی سہی۔“ وہ جیسے رتو کی باتیں سن ہی

”ہونہہ.....“ وہ مسکرائی۔

”سچ کہتی ہوں۔ اپنے آپ کو بھول گئی ہے تو۔“

”بھولی کہاں ہوں۔ اب تو ڈھونڈا ہے اپنے آپ کو۔“

”اوں ہوں یہ بات صحیح ہوتی تو.....“

”تو کیا ہوتا.....“

”تو راجو سے یوں آنکھیں نہ پھیر لیتی۔“

”رتو۔“ نجو کا پورا وجود کانپ گیا، رنگ اڑ گیا، آنکھوں میں ویرانی پھیل گئی۔ اس

نے اپنے کانپتے ہونٹ دانتوں تلے کاٹ لیے۔

رتو اس سے خفا ہو گئی..... ”تو تو کسی کو پہچانتی ہی نہیں۔ میں تیری بچپن کی سہیلی

ہوں، میرے ساتھ بھی تو اوپری اوپری باتیں کرتی ہے۔“

نجو نے بڑے دکھ سے رتو کو دیکھا ”تو شاید ٹھیک کہتی ہے..... رتو، پر میں کیا

کروں..... کیا کروں.....“

”تو نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اک غریب کا دل توڑ دیا ہے۔ کیوں نجو، کیوں؟ میں

آج تجھ سے پوچھ کر رہوں گی۔ بتا مجھے راجو کو کیوں چھوڑ دیا ہے اور اس لٹیرے لفنگے کو کیوں

قبول کر رہی ہے..... جس کے متعلق ہر پنڈ جانتا ہے، جو پنڈ کی بہو بیٹیوں پر بری نگاہیں ڈالتا

ہے، جو شہر میں عیاشی کے اڈے چلاتا ہے۔ بتا، کیا نظر آیا تھا تجھے اس میں.....“

نجو رتو کی جذباتی باتوں پر ہنس دی۔

اور

پھر

ہنستی چلی گئی۔

رتو کو اس پر بے طرح غصہ آیا۔ بھڑک کر بولی ”راجو کے پیار بھرے دل کو توڑ کر تو

کبھی چین نہیں پائے گی نجو.....“

نجو پھر بھی ہنستی چلی گئی..... وہ رتو کی باتیں خدا جانے سن بھی رہی تھی یا نہیں۔

اپنے سامنے بکھری چیزوں کو ہی تکے جا رہی تھی۔

ایک دفعہ اس نے پستول اٹھا کر دیوار کی طرف نشانہ لینے کا حیلہ کیا۔ پھر خنجر اٹھایا

اور اس کی تیز دھار کو دیکھنے لگی۔ پھر فضل کے کپڑے تہہ کر کے بکس میں رکھنے لگی۔

”تو سن نہیں رہی، میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ رتو نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”نجو نے پھر اجنبی سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی ”رتو کوئی اور بات کر.....“

”کیا بات کروں۔ وہ چلائی۔ کوئی بات کرنے کو تو نے چھوڑا ہی کہاں ہے۔“

”تو پھر جا اپنے گھر، تیری سکھیاں تیرے انتظار میں ہوں گی۔ میرے لیے کیوں

اپنا وقت ضائع کرتی ہے.....“

”وقت تو تو ضائع کر رہی ہے پگلی.....“ رتو ایک دم نرم پڑ گئی۔

”کیا کہنا چاہتی ہے تو؟“

”سکھیرے کے لیے تو نے ہاں کر دی ہے۔“

”ہاں..... ماسی راجو سے میں نے کہہ دیا ہے۔“

”یہ تیرا آخری فیصلہ ہے۔“

”آخری بھی اور قطعی بھی۔“

”پر کیوں.....“

”رتو، بے دری.....“

وہ چپ ہو گئی۔ اس کی نظریں دیوار پر جم گئیں۔ کئی لمحے وہ بے حس و حرکت بیٹھی

خون آلود سہرے اور کپڑوں کو تکتی رہی۔

رتو کو ڈرتو لگا، لیکن جی کڑا کر کے بولی ”کیا دیکھ رہی ہے۔“

”اپنے ویر کا چہرہ.....“

”نجو..... باؤلی..... مر جانے والے پھر نہیں آتے.....“

”میں دیکھ رہی ہوں۔ ویر کا خون میں ڈوبا ہوا چہرہ..... خون میں ڈوبا ہوا چہرہ،

خون میں لتھڑی ہوئی بنارس پگ..... خون کے دھبوں والا کرتا اور تہبند..... چاننی جوتا.....

خون ہی خون ہے..... خون..... خون.....“

”چھرا میرے دیر کے دل میں لگا ہوگا نا اسی لیے تو خون کا فوارہ ابل پڑا تھا.....  
عین دل میں.....“

”نجدیوار پر نظریں جمائے یوں تک رہی تھی جیسے واقعی فضل سامنے کھڑا ہو۔ رتو نے  
خائف نظروں سے ادھر دیکھا۔ وہاں سوائے کپڑوں اور سہرے کے کیا تھا پھر بھی وہ ڈر گئی۔  
ہولے ہولے اٹھی۔ دروازے کی طرف بڑھی اور تیزی سے باہر بھاگ گئی۔  
گلی کے دوسرے موڑ پر اسے راجو مل گیا..... لٹا پٹا سا راجو دھیرے دھیرے چل  
رہا تھا۔

”بھاراجو۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر تسلی کر لی کہ گلی کے اس موڑ پر اور کوئی نہیں۔  
”ہاں۔“ راجو نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”بھاراجو۔“

”ہاں بھین۔“

”تو نجد کے پاس جا..... ابھی جا.....“

”کیوں۔“

”اس نے سکھیرے کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔“ رتو رو دینے کو تھی۔ راجو تلخی سے  
مسکرایا..... ”پاگلے اس نے ہاں بھی کہہ دی ہے..... اور تو مجھے اس کے پاس جانے کا کہہ  
رہی ہے۔“

”ہائے بھاراجو۔ ایک بار جا تو سہی..... مجھے لگتا ہے اسے ہوش مت کچھ نہیں  
ہے.....“

”سب ہے..... تاجے سے اس نے پیار کی پینگیں بڑھائی ہیں۔“ وہ چڑ گیا۔

”راجو.....“ وہ حیران ہو گئی۔

”ہاں تو..... میں جانتا ہوں..... میں نے دونوں کو اکٹھے قبر پر بیٹھے ہنس کر

باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ درگاہ کے پچھواڑے بھی ملتے تھے.....“

”نہیں نہیں.....“ رتو نے بے یقینی سے کہا۔

وہ بڑے کر بناک انداز میں ہنسا۔ رتو پھر بھی اصرار کرتے ہوئے بولی۔

”سب جھوٹ ہے بھاراجو..... مجھے یقین نہیں آتا..... نجد کو تجھ سے جتنا پیار ہے  
میں جانتی ہوں..... وہ میری سدا کی سہیلی ہے بھا..... وہ کبھی کوئی بات مجھ سے نہ چھپاتی  
تھی..... تو ایک بار تو اس سے مل لے۔ شاید..... شاید.....“

راجو کے چہرے پر بھی بھوری چٹانوں کی سی سختی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی  
تھی۔ اس کا دل اپنے پیار کا مدفن تھا..... وہ کیسے نجد سے ملتا..... اسے کیا کہتا جبکہ وہ تاجے  
کے ساتھ اسے دو تین بار اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

”وہ باؤلی سی لگتی ہے۔ اس کا مغز رو رو کر پانی ہو گیا ہے بھاراجو۔“

”اسے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ تو مجھے بھی یوں دیکھتی ہے جیسے  
میں اس کی سکھی نہیں کوئی پرائی لڑکی ہوں۔ پہچان ہی نہیں رہی اس کی آنکھوں میں۔ تو میری  
گل من لے بھاراجو..... ایک بار..... اسے مل..... اسے سمجھا..... اسے بتا..... شاید وہ تیری  
گل من لے۔“

رتو خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ دل میں درد مند رہا تھا۔ بھاراجو سے اسے دلی  
ہمدردی تھی۔ اس کا اداس ویران اور پریشان رہنا اس سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ راجو نے سر  
جھکا لیا۔

رتو اسے نجد سے مل لینے پر اصرار کرتی رہی۔

اندھیرے گاڑی لے کر نکل جاتا تھا۔

علمے کو ساری باتوں کا علم تھا..... تاج خوشی میں بہک جاتا، تو نجو کے متعلق اسے بہت کچھ بتا دیتا.....

پہلے دن جب علمے کو پتہ چلا تھا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ تاج کا قدم غلط سمت اٹھتا رہتا تھا۔

لیکن نجو کی طرف بڑھنا بالکل ہی غلط تھا۔ اسی صورت میں جبکہ اس کے عزیز ترین بھائی کی موت کا وہ ذمہ دار تھا۔

اس نے چاہا تھا چودھری کو روک دے..... کہہ دے..... اظہار کر دے لیکن وہ جانتا تھا سکھیرا جس بات کا عزم کر لیتا ہے..... اسے چھوڑنا نہیں..... وہ چپ ہو گیا تھا۔

پھر اگلے دن تاج نے اسے شادی کا مژدہ سنایا۔

”میں شادی کر رہا ہوں علمے.....“

”جی..... شادی؟“

”ہاں ملک فضل کی بھین کے ساتھ۔“

”چنگی بات ہے چودھری جی۔“

”دونوں خاندانوں کی دشمنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ رشتہ ہو گیا ہے۔“

”لوگ بہت خوش ہیں.....“

علماء کیا کہہ سکتا تھا۔ دلی زبان سے یہی کہا ”شادی عمروں کے معاملے ہوتے ہیں

چودھری جی.....“

تاج اپنی دھن میں مست تھا۔ علمے کی بات نہ سمجھا..... اس کا اشارہ ملک فضل کے قتل کی طرف تھا۔ کبھی اس کی بھین پر یہ راز عیاں ہو گیا تو کیا ہوگا۔

تاج اس کی بات سمجھ بھی لیتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہ تو صرف اور صرف حال میں

جینے کا عادی تھا..... حال کے ہر لمحے پر حاوی ہونا جانتا تھا۔ حال سے نپٹنا اسے آتا تھا۔

ماضی کیا تھا یا مستقبل کیا ہوتا ہے اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت ہی کب سمجھی تھی۔

تاج بڑے زور و شور سے شادی کی تیاریوں میں لگا تھا۔ نجو اس کے دل و دماغ پر چھائی تھی۔ اس کے لیے وہ قیمتی سے قیمتی چیزیں خرید رہا تھا۔ ویسے بھی ٹکر کا جوڑ تھا۔ پورے پنڈ پر دھاک بٹھانا مقصود تھی۔

ملکوں اور سکھیروں کی دوستی کی خوشی کا اظہار بھی کرنا تھا۔ اس لیے تیاریوں کا خاص اہتمام تھا۔

ویسے اس کا خیال تھا کہ شادی کے بعد نجو کو گاؤں سے شہر لے آئے گا۔ اسے شہری بنادے گا۔ گو نجو سے اس نے اس سلسلہ میں کھل کر بات نہ کی تھی۔ ایک دن یونہی پوچھا تھا ”شادی کے بعد گاؤں رہنا پسند کرے گی یا شہر۔“

تو

وہ ہنس کر بولی تھی ”یہ شادی کے بعد دیکھیں گے۔“

”شہر میں میرا سجا سجا یا خوبصورت گھر ہے۔ ہر سہولت اور ہر آسائش میسر ہے

ہاں۔“

”اب کی بات کرتا ج‘ بعد کی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

وہ چپ ہو گیا۔ واقعی شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔ چاؤ چونچلے تو شادی سے

پہلے ہی کرنا تھے۔ بعد میں تو جو وہ چاہے گا وہی ہوگا۔

گھر میں روزانہ کوئی نہ کوئی چیز آ رہی تھی۔ خوبصورت لباس اور زیورات خریدے

جار ہے تھے۔

گل پروشے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ان دنوں تو اس کا گھر میں ہونا نہ ہونا برابر ہی

تھا..... تاج کو اپنے نئے عشق میں اس کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ وہ تو منہ



شادی کی بھنگ گل پروشے کے کان میں بھی پڑ گئی تھی۔ پھر کپڑوں اور زیور کی خریداری سے بھی سمجھ گئی تھی۔ اس دن اس نے علمے سے پوچھا۔

”سردار روزانہ کدر جاتا ہے۔“

”پنڈ۔“

”اتنا سویرے۔“

”جی بی بی۔“

”کیا کرتا ہے اور۔“

”میں کیا جانوں بی بی۔“

”تم سب جانتا ہے۔“

علماء سر جھکا کر رہ گیا۔

”یہ کپڑا یہ زیور سردار کس کے لیے لارہا ہے۔“

علمے کو بتانا ہی پڑا۔ ”وہ شادی کر رہا ہے۔“

”شادی۔“

”ہاں۔“

امارا اندازہ بھی یہی تھا۔۔۔۔۔ گاؤں میں کوئی لڑکی پکڑا ہے اس نے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ملک فضل کی بھین سے۔۔۔۔۔ ہو رہی ہے شادی۔“

”ملک فضل کا بھین۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔“

گل پروشے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے دوبارہ یہی سوال کیا۔۔۔۔۔ ”ملک فضل کا بھین سے؟“

”ہاں۔“

”یہ اس کے بھائی کا قاتل ہے۔۔۔۔۔ اور بھین سے شادی کرتا ہے۔“

”چپ بی بی۔۔۔۔۔“ علماء ڈر گیا۔ ”ایسی بات منہ سے نہ نکالنا سردار کو پتہ چل گیا تو

منٹوں کا معاملہ ہوگا تمہاری زندگی کا۔۔۔۔۔“

گل پروشے چپ ہو گئی لیکن اس کی آنکھوں کا قہر مانی تناؤ اور بھنچے ہوئے ہونٹوں کی سختی اس کے سینے میں مچلنے والے جذبات کی پوری طرح آئینہ دار تھی۔

”ام اس سے سمجھے گا۔“ وہ غرائی۔

”چپ رہنے ہی میں مصلحت ہے پروشے بی بی۔ آپ نے کوئی واویلا کیا تو الٹا

آپ کے حق میں ہی برا ہوگا۔ تاج محمد سکھیرے سے ٹکر لینا موت کو دعوت دینا ہے۔“

”ام جانتا ہے۔۔۔۔۔“

”پھر قسمت کا لکھا سمجھ کر چپ ہی رہے۔“

اس نے سر ہلایا۔۔۔۔۔ ”اس نے امارا ساتھ شادی کیا تھا علمے۔ وہ امارا خاوند ہے۔

ام اس سے سمجھے گا۔۔۔۔۔“

علمے نے سر اٹھا کر گل پروشے کو دیکھا۔ اسے اس بیچاری پر بڑا ترس آیا۔ گھر اور

شوہر کی تمنا اسے کتنی شدت سے تھی۔ وہ جانتا تھا لیکن تاج تو اب اسے بالکل بھلا بیٹھا تھا۔ وہ

جیتی ہے یا مرنی اسے پروا تھی نہ علم۔ وہ تو علمے ہی کو اس سے انسانی ہمدردی تھی جو وہ یہاں تک

بیٹھی تھی ورنہ سردار کا ہی معاملہ ہوتا تو اب تک اس کا سودا کئی ہاتھوں ہو چکا ہوتا۔ یہ بھی ممکن

تھا کہ بکتے بکتے وہ روز بکنے کے لیے کسی کوٹھے تک پہنچ گئی ہوتی۔۔۔۔۔ علماء اسے اپنی سوچ اور سمجھ

کے مطابق حالات سے سمجھوتہ کرنے کی تلقین کرتا رہتا تھا۔

آج بھی وہ اسے ملائمت سے سمجھانے لگا، نصیحتیں کیں، اونچ نیچ بتائی، قتل کے

قصے کا ذہن سے نکال ڈالنے کو کہا۔

لیکن

گل پروشے کسی اور سوچ میں تھی۔ سردار کے اس کے ساتھ تعلقات نہ ہونے

کے برابر تھے۔ وہ اس سے بات تک نہ کرتا تھا۔ اس کے سامنے شراب پیتا تھا، کرائے کی

عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا تھا۔

وہ مصلحت کے تحت سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ علمے کی نصیحت پر عمل کر رہی

تھی۔۔۔۔۔ اس دھمکی سے ڈر گئی تھی کہ سردار اسے سوات واپس بھیج دے گا۔

وہ گھر میں رہتی تو تھی۔ سردار تاج کی بیوی تو تھی اس کا اپنی نظروں میں کچھ مقام تو

تھا..... ایک آس تو تھی، امید تو تھی۔ کبھی تو تاج اسے اس کا حق دے گا.....! لیکن

وہ تو شادی کر رہا ہے۔

گل پروشے کو اجاڑ کر اس کا آشیانہ چھین کر وہ کسی دوسری لڑکی کو بسا رہا تھا۔  
گل پروشے یہ سب کچھ کیسے برداشت کر لیتی، کیسے سہہ لیتی۔

اسی رات اس نے تاج کا گریبان پکڑ لیا۔ اپنے حق کے لیے زوردار احتجاج کیا، روئی، چیخی..... گالیاں بکس۔

لیکن

تاج پر کیا اثر ہوتا..... گل پروشے جب بالکل ہی بے قابو ہو گئی تو تاج نے اسے لاتوں، گھونسوں اور مکوں سے ادھ موا کر دیا۔ اس کے سپید جسم پر نیل پڑ گئے۔ اس کے چہرے پر خراشیں آ گئیں، اس کے دانتوں سے لہو بہنے لگا۔  
گل پروشے تو ادھ موئی ہو گئی۔

ہاں

اس کے اندر کی عورت اس ظلم و تشدد سے بھر گئی۔

-----○-----

جیلاں نے پیتل کے بڑے لیمپ کی چمپی صاف کی، بتی کو آگ لگائی اور نجو کے دالان میں لیمپ لا کر چھتی پر رکھ دیا۔ دوسرے دالانوں اور کوٹھڑیوں میں جارو اور رقیہ بتیاں لالٹینیں اور دیئے جلا جلا کر رکھنے لگیں۔ دو تین دنوں سے سرشام ہی پوری حویلی میں روشنی کر دی جاتی تھی..... نجو نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔

”اندھیرے سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ ساری حویلی میں بتیاں جلایا کرو، اتنے لیمپ اور لالٹینیں کس لیے رکھی ہیں.....“

حکم کی تعمیل اسی دن سے شروع ہو گئی تھی۔

لیمپ کی روشنی سے کمرہ بھر گیا۔

”بتی اونچی کروں۔“ جیلاں نے پوچھا۔

”بس کافی ہے۔ چھوڑ دو.....“ نجو پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، اس کا چہرہ اترا

ہوا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں چہرہ کچھ زیادہ ہی پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ جیلاں چند لمحے اسے تکتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے نجو کشتیاں اپنے ہاتھوں ڈبو کر ان کے ڈوبنے سے خود ہی ڈوبی جا رہی ہے۔ آج سکھروں کے گھر سے لوگ آئے تھے..... اور کنگنوں کی طلائی جوڑی نجو کو پہنا گئے تھے۔ ماسی راہو نے بے دلی سے ان پر اپنا عندیہ واضح کر دیا تھا۔ وہ لوگ خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے۔

نجو پلنگ پر بیٹھی انہی کنگنوں کو تک رہی تھی۔

جیلاں دالان سے نکل گئی..... ماسی راہو دوسرے دالان میں تھی، وہ اس کے پاس

جا بیٹھی.....

ساری حویلی میں روشنی تھی لیکن یوں لگتا تھا، حویلی گھمبیر اندھیروں کی لپیٹ میں

”پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔“  
 ”نحو کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“  
 ”بیچارہ راجو..... غم سے ادھ موا ہو گیا ہے۔“  
 ”سمجھ نہیں آئی اس کو چھوڑ کیوں دیا نچونے۔“  
 ”بھافضل نے تو نچو کی خوشی کی خاطر ہی رشتہ کرنا تھا اس سے۔“  
 ”ہاں مجھے پتہ ہے۔“  
 ”کتنا پیار تھا دونوں میں..... نچو ساری باتیں مجھے بتایا کرتی تھی۔“  
 ”اب تو اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی.....“  
 ”یہی تو حیرانی کی بات ہے۔“  
 ”سکھیر امن بھا گیا۔“  
 ”اوں ہوں۔ نچو خوش تو اب بھی نہیں۔ دیکھتی نہیں اسے.....“  
 ”مجھے تو لگتا ہے بھافضل کے ساتھ وہ بھی مرگئی..... یہ تو کوئی اور ہی نچو لگتی ہے۔“  
 ”خوف آتا ہے مجھے۔“  
 ”یوں لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے۔“  
 ”اس حویلی میں تو ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ ہوتا آیا ہے..... اب تو کوئی رہا ہی نہیں.....  
 اب کیا ہوگا.....“  
 ”بس دل میں کھد بد ہوتی رہتی ہے۔“  
 ”رب خیر کرے.....“ وہ سب سر جوڑے باتیں کر رہی تھیں۔  
 نچو پلنگ پر بیٹھی کیا سوچ رہی تھی؟ یہ وہی جانتی تھی۔  
 رات اتر رہی تھی۔ نچو پلنگ سے اٹھی..... لیپ کی روشنی مدھم کرنے کے لیے  
 چھتی کی طرف گئی.....  
 ”نچو.....“ جیلاں نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا۔  
 ”ہاں۔“ نچو نے بتی بجتی نہ کی۔  
 ”بھارا جو آیا ہے۔“

ہے۔ اک اداسی ہر سو مچل رہی تھی۔ ویرانی کا احساس جاگتا تھا۔ اتنی بڑی حویلی سونی پڑی  
 تھی۔ یہ حویلی فضل کے دم سے آباد تھی۔ ہر وقت گہما گہمی اور رونق کا احساس ہوتا تھا۔  
 صرف ایک فضل ہی بچھڑا تھا۔

لیکن

یوں لگتا تھا کہ گھر سے کافی لوگ آئے تھے۔ عورتیں، مرد اور بچے سبھی تھے۔ ان  
 کے آنے سے چہل پہل ہوئی تھی، لیکن دلوں میں اترتے سنائے اپنی جگہ موجود تھے۔ ان  
 کے جانے کے بعد یہ سنائے ہر ایک نے محسوس کیے تھے۔

بکونے جیراں سے کہا تھا ”آج خوشی محسوس نہیں ہو رہی۔ یوں لگ رہا ہے جیسے  
 کوئی مرگ ہو گئی ہے۔“

”ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ سکھیروں سے ناطہ جوڑنا دل کو نہیں بھاتا۔“

”ہم کیا اور ہماری اوقات کیا ہے۔ پر پتہ نہیں نچو کا فیصلہ غلط ہی ہے۔“

”تو چپ رہ..... وہ جانے اور اس کا کام.....“

”لوگ بھی باتیں بناتے ہیں نا..... چودھری رحمت علی کے قاتل اور۔“

”تو زبان بند ہی رکھ..... لوگ خوش بھی تو ہیں پرانی دشمنی اس طرح ہمیشہ کے  
 لیے ختم ہو جائے گی۔“

”یہ بات تو ہے شاید فضل کے قاتلوں کا بھی کچھ پتہ چل سکے۔ یہ لوگ بڑی پہنچ  
 والے ہیں..... ضرور دوڑ دوڑ پھوپ کریں گے۔“

”شاید تاج ہی ڈھونڈ نکالے۔ اس کی بڑے بڑے افسروں سے دوستی ہے.....“

”اور بڑے بڑے بد معاشوں سے بھی تو ہے۔“

”ایسی باتیں مت کر پہلے ہی دل میں وسوسہ سا ہے۔ کوئی خوشی نہیں جی بس منہ  
 ہی مندہ ہے۔ اس پر ایسی باتیں سوچ کر ہول آتا ہے۔“

”ایسا ہی ہے..... پتہ نہیں کیا بات ہے.....“

جیلاں جا رہا اور رقیہ بھی دبے دبے لفظوں میں خوشی کے فقدان کی باتیں  
 کر رہی تھیں۔

”راجو.....“

”ہاں۔“

”کیوں آیا ہے۔“

نحو کے لہجے کے تناؤ سے جیلاں ڈر گئی۔ وہ واپس مڑی تو راجو دروازے میں آ گیا۔ اس نے نحو کو دیکھا۔

اور

نحو نے اسے

چند لمحے

جیسے فضا کو سکتہ ہو گیا، روشنی ڈوب گئی اور اندھے اندھے اندھیرے چہارسو پھیل گئے.....

راجو نے دروازے کے پٹ سے ٹیک لگا کر اپنے کانپتے وجود کو سہارا دے لیا۔ نحو چھستی پر بازو رکھے کھڑی رہی۔

پھر

جانے کیسے فضا کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ لمحے مضطرب ہوئے، ماحول لرز گیا، نحو کے لبوں سے مردہ سی آواز نکلی۔ ”کیوں آئے ہو۔“

راجو اپنی خوبصورت فسوں ساز آنکھوں میں کرب کی دنیا سیٹے اسے تکتا رہا.....

”کیوں آئے ہو راجو.....“ نحو کی گرفت چھستی پر مضبوط ہو گئی۔ وہ بمشکل اتنا کہہ سکی۔

راجو اب بھی اسے دکھ بھری نظروں سے تک رہا تھا۔ لٹا پٹا راجو یہاں آ تو گیا تھا،

لیکن اب کوئی بات منہ سے نہ نکل رہی تھی۔

”کیوں آئے ہو۔“ اب نحو کے لہجے میں تناؤ تھا۔ یوں جیسے اسے دالان سے نکل

جانے کا حکم دے رہی ہے۔

”نحو.....“ راجو کے لبوں سے نکلا۔

”کیا ہے۔“

”مجھے بے موت کیوں مار ڈالا ہے تو نے؟“ تو کیا کر رہی ہے نحو۔ مجھے چھوڑ دینا تھا

تو پیار کیوں کیا تھا، کیوں برباد کر رہی ہے مجھے.....“ وہ ایک دم پھٹ پڑا.....

نحو نے چھستی کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا..... اس کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا تھا..... ہونٹ تک بے رنگ ہو گئے تھے۔

راجو قدم بڑھا کر اندر آ گیا۔ نحو کے قریب آتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔  
”مجھے میرا جرم تو بتا دے..... کیا جرم کیا ہے میں نے جس کی اتنی کڑی سزا دے رہی ہے مجھے.....“

نحو نے سپاٹ نظروں سے اس کے سراپا کو دیکھا۔ پھر رخ موڑتے ہوئے بولی  
”راجو بہتر ہی ہے کہ تو واپس چلا جا.....“

”میں اپنا جرم پوچھ کر رہوں گا.....“

”جرم.....؟“

”ہاں۔“

وہ مڑی۔ راجو کے عین سامنے کھڑی ہو گئی..... بڑے غور سے اسے دیکھا اور روکھے سوکھے لہجے میں بولی ”میں سمجھتی تھی تو مجھے پیار کرتا ہے، روحوں کا ملاپ.....“

راجو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سختی سے اسے جھنجھوڑا اور بے تاب لہجے میں بولا ”میرے پیار پر شک کیوں کر رہی ہو..... مجھے آزما کر تو دیکھ.....“

وہ تلخی سے بولی ”وجود کی بھول بھلیوں میں کھو جانے والے لوگ کس آزمائش میں پورے اترتے ہیں؟“

”نحو۔“ راجو نے اسے جھٹکا دیا۔

نحو نے اس کی طرف کڑی نظروں سے دیکھا۔

پھر

اپنے کندھوں پر رکھے راجو کے ہاتھ سختی سے جھٹکتے ہوئے پرے ہٹ گئی.....

”خدا کے واسطے نحو..... مجھے کچھ تو بتا دے..... کہ.....“ وہ گلوگیر آواز میں بولتے بولتے رک گیا۔

نحو نے جلدی سے کہا ”تجھے میں نے کتنی بار کہا ہے، میری راہ سے ہٹ جا.....“

راجو..... تو اگر اپنے سچے پیار کا دعویٰ دار ہے نا تو یہاں سے چلا جا.....“  
”نہو۔“

”چلا جا راجو..... چلا جا.....“

راجو ہر اس اس سے تکتے لگا۔ اس کے قدم تو جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔ نجو کی باتیں ذہن کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔ اسے یہ اندازہ کرنے میں کوئی دقت کوئی دشواری نہ رہی تھی کہ نجو نے جو قدم اٹھایا ہے کسی مجبوری کسی مصلحت کے تحت اٹھایا ہے۔ اس کا پیار اپنی جگہ اک اٹل اور سچی حقیقت ہے.....

اس سوچ نے اسے تسکین دی۔ پیار ملن سے شاید امر نہیں ہوتا۔ پچھڑ کر امر ہوتا ہے۔ اس نے اپنے سینے میں ٹھانھیں مارتے پیار کے سمندر کو محسوس کیا۔ اس کا پیار امر ہو جائے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

اور

جب نجو پھر تند لہجے میں بولی ”چلے جاؤ..... راجو..... چلے جاؤ.....“  
تو

راجو نے عقیدت سے اپنے پیار کے سامنے سر جھکا دیا۔  
وہ آہستگی سے مڑا.....

اور

کچھ کہے بغیر دالان سے نکل گیا۔

اس کے دالان سے باہر نکلتے ہی نجو نے کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔

اور

صحن میں کھڑی جاؤ جیلاں اور رقیہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک دوسری کا منہ تکتے

لگیں۔

جب سے شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی تاج کی شہر والی کوٹھی میں روزانہ رات کو محفل راگ و رنگ منعقد ہو رہی تھی۔ پیٹنے پلانے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ اس کے بدقماش دوست اسے خوشی کی آڑ میں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔  
تاج جب ضرورت سے زیادہ چڑھا جاتا تو وہ اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے۔

”واہ چودھری بات ہوئی نا.....“

”بڑا خوش قسمت ہے تو۔“

”لڑکی کا سارا دھن دولت بھی اب تیرا ہی ہوگا۔“

”جے تو۔“

”عیش کرے۔“

”اور کروائے۔“

یوں اسے ہوا دے کر یہ مطلبی دوست اس سے بہت کچھ حاصل کر لیتے۔ روپے پیسے کی تو یوں بھی تاج کو پروا نہ تھی۔ ہزاروں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ہو جاتے..... اسے پتہ ہی نہ چلتا..... لوٹ کھسوٹ ہو رہی تھی اور وہ شراب کے نشے میں دھت بے دریغ لٹائے جا رہا تھا۔ ان دوستوں پر ویسے وہ دانستہ بھی پیسہ نہ چھادر کر رہا تھا۔ یہ اس کے مکروہ رازوں کے امین جو تھے حصہ دار تھے ساتھی تھے۔

اس دن بھی ڈرائنگ روم میں یہ چنڈال چوکڑی جمع تھی..... شراب پانی کی طرح حلقوں میں انڈیلی جا رہی تھی۔ دو نازک اندام چھو کریاں ساتی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ناز و انداز سے گھائل کر کے پلا رہی تھیں..... فحش حرکات ہو رہی تھیں..... جذبات

کے دھارے بہہ رہے تھے اور تسکین و سیرابی کے سامان مہیا تھے۔

”یارتاج۔“ ایک ساتھی بولا۔

”ہوں۔“

”شادی کے بعد کیا ہوگا۔“

”کیوں۔“ دوسرے ساتھی نے پیانہ چھلکاتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمارے ہاتھ کب آئے گا پھر.....“ پہلا بولا۔

”ہاں..... یہ بات سوچنے کی ہے۔ شراب و کباب کی ایسی محفلیں پھر کیسے ہوں

گی۔“ تیسرے نے لقمہ دیا۔

”اوکون ہے جو ہمیں روک سکے.....“ تاج دھاڑا..... وہ نشے میں دھت تھا۔

”تیری گھر والی۔“

”اس کی مجال ہے۔“

”چودھریوں کی بیٹی ہے وہ.....“

”ڈرتا کون ہے..... پھر اس کا ہے ہی کون۔“ تاج نے غناغٹ گلاس چڑھاتے

ہوئے کہا۔

”اک اکیلی ہے..... کیا بگاڑ لے گی میرا..... شراب تو میری زندگی ہے یارو.....“

وہ اول فول بکتا رہا۔

یاروں نے اسے خوب پلائی..... خود بھی بکے اسے بھی بہکایا۔ باتوں ہی باتوں

میں گل پروشے کا ذکر آ گیا۔

”اوتاج۔ اب تو تیری دودو گھر والیاں ہو گئیں۔“ ایک دوست بولا۔

”دودو۔“ تاج نے ہنکارا بھرا۔

”ہاں۔“

”ایک پٹھانی اور دوسری ملکانی.....“ دوسرے نے کہا۔

اور.....

تاج جو نشے میں دھت تھا موج میں آ کر بولا ”ملکانی میری پٹھانی تمہاری تم لے جاؤ۔“

”سچ۔“ دوسرے نے جھومتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ جان چھڑاؤ میری اس سے..... ہو گئی تمہاری۔“

”ہو گئی۔“

”ہو گئی۔“

سب نے بے ہنگم سے قہقہے لگائے۔

ادھر تاج نئی شادی کی خوشی میں گل پروشے کو دوستوں میں بخشش کے طور پر

بانٹ رہا تھا

اور

ادھر

گل پروشے اپنے کمرے میں تنہا لیٹی اس شادی کو رکوانے، تڑوانے کے منصوبے

بنارہی تھی۔ تنہائیوں کا زہر اس کی نس نس میں گل رہا تھا۔ پا کر کھونے کے جان لیوا احساس

پر مابی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ تاج اس کا خاوند تھا۔ وہ کسی اور کا خاوند بن جائے

یہ اسے گوارا نہ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ منصوبے بنارہی تھی۔ منصوبے بنارہی تھی اور ان پر عمل

پیرا ہونے کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔

بالآخر اس نے کچھ سوچ ہی لیا۔ اک فیصلہ کر ہی لیا۔

دوسری صبح وہ نجو سے ملنے پہلاں والی جا پہنچی۔ پہلاں والی اور ملک فضل کا نام

اسے معلوم تھا۔ ہڑیا لے ایک دفعہ تاج کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کس طرح یہاں پہنچ پائی یہ

اپنے اندر اک داستان تھی۔

اس نے اپنے آپ کو ایک لمبی چوڑی پھولدار چادر میں چھپا رکھا تھا۔ پھر بھی شہری

وضع قطع کا لباس پنڈ والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ سرخ و سپید چوڑا چہرہ ماتھے پر

کٹے بال، گالوں پر سیاہ خال، سبزی مائل نیلی آنکھیں، سرخ ہونٹ۔ جس نے بھی اسے دیکھا

حسن جہاں سوز کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

وہ ملک فضل کے گھر کا پتہ پوچھتے پوچھتے حویلی تک آ گئی۔ کئی بچے لڑکیاں، عورتیں

اور اکا دکا مرد بھی اس کے پیچھے پیچھے گلی میں آ گئے۔

تو

اسے سمجھتے دیر نہ لگی کہ تاج کی خریدی ہوئی بیوی ہے۔

وہ چیزیں وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی..... شہری وضع قطع کا لباس پہنے یہ پٹھان لڑکی حسن کا مرقع تھی..... وہ اسے تنگ رہ گئی۔

”تم فضل کا بھین ہے۔“ گل پروشے نے پوچھا۔

”ہاں۔“ نجو کے لبوں سے مبہم سی آواز نکلی.....

”تم ام کو نہیں پہچانتا.....“

”پہچان لیا ہے۔“

”نہیں۔“

”تم..... تم تاج کی بیوی ہونا۔“

”ہاں۔“

گل پروشے نے حیرانگی سے اسے دیکھا اور بولی ”اما رابارے میں تم جانتا ہے۔“

”ہاں۔“

نجو مسکرائی۔ پھر پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”بیٹھو۔“

گل پروشے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کے

ذہن میں انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ وہ نجو کو تاج سے متنفر کرنے آئی تھی۔ اس کے کروت

اسے بتا کر یہ شادی رکوانے آئی تھی۔

”جیلاں۔“ نجو نے اسے پکارا۔

”ہاں۔“

”دودھ اور مٹھائی لاؤ۔“

”اچھا۔“

وہ جانے لگی تو گل پروشے احتجاجی لہجے میں بولی ”ام کچ نہیں کھائے گا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ نجو نے کہا۔

”بس ام تم سے تھوڑی بات کرے گا۔ کھانے پینے کا ضرورت نہیں ہے۔“

حویلی کے دروازے پر جیلاں کھڑی تھی۔ وہ دالانوں میں جھاڑو لگانے کے بعد کوڑاگلی میں پھینکنے آئی تھی۔

”یہ ملک فضل کا گھر ہے نا.....“ گل پروشے نے لوگوں کی رہنمائی پر حویلی تک پہنچ کر جیلاں سے پوچھا۔

”ہاں..... تم کون ہو؟“

”ام ابھی بتائے گا۔“

جیلاں حیرانگی سے اسے تنگنے لگی۔ اس کی بولی عجیب سی تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔

”ملک کا بھین اندر ہے۔“ اس نے جیلاں سے پوچھا۔

”ہاں۔“

”ام اس سے ملنے آیا ہے۔“

”آ جاؤ۔“

”گل پروشے حویلی کے دروازے میں داخل ہوئی۔ بچے لڑکیاں اور عورتیں بھی

پیچھے آئیں۔“

”تم لوگ جاؤ.....“ گل پروشے نے پلٹ کر سب سے کہا۔ بچے تو خیر ڈھیٹ

تھے صحن میں آ گئے۔ ہاں لڑکیاں اور عورتیں دروازے پر رک کر ہی چہ مگوئیاں کرنے لگیں۔

گل پروشے طویل و عریض صحن میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ جارو اور جیراں لپک کر

آئیں۔ ”کدر ہے ملک کا بھین۔“ گل پروشے نے پوچھا۔

”اندر۔“ جارو نے ڈرتے ڈرتے سامنے فضل کے دالان کی طرف اشارہ کیا۔

”گل پروشے متانت سے چلتی نجو کے دالان میں داخل ہو گئی۔ جارو جیلاں اور

ان کی ماں بھی پیچھے پیچھے آئیں۔

نجو فضل کی چیزیں بکھیرے بیٹھی تھی۔ آبدار خنجر کیس سے نکال کر دیکھ رہی تھی۔

پستول بھی قریب پڑا تھا۔ کپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔

نجو نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اک اجنبی چہرے کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ لیکن جب

گل پروشے نے آگے بڑھ کر کہا ”ام گل پروشے ہے۔“

”کیا بات کرو گی؟“

”ان لوگوں کو بولو جائے.....“ اس نے دروازے میں کھڑی جاؤ جیراں اور بچوں کی طرف دیکھا۔

”جاؤ تم سب۔“ نجو نے سب کو جانے کا کہہ کر دروازہ بھیڑ دیا۔ پھر گل پروشے کے قریب پلنگ پر آ بیٹھی۔ وہ اس وقت بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

”تم جانتا ہے ام سردار کی بیوی ہے۔“

”ہاں سنا تھا اس نے کسی پٹھان عورت سے شادی کر رکھی ہے..... تمہیں دیکھتے ہی پتہ چل گیا۔“

”تم اس سے شادی کرتا ہے۔“

”ہاں۔“

”یہ جان کر بھی کہ اس کا پہلے بیوی ہے۔“

”ہاں۔“

”بد بختے ایسا کیوں کرتا ہے۔“

نجو نے جھکا ہوا سر آہستہ آہستہ اٹھایا اور آ رہا ہو جانے والی نظروں سے گل پروشے کو دیکھتے ہوئے بولی ”شادی کرنا گناہ تو نہیں.....“

”ایسا آدمی کے ساتھ شادی مت کرو.....“

”اس لیے کہ وہ تمہارا خاوند ہے۔“

”ہاں..... لیکن اس نے امارا ساتھ دغا کیا۔ اب ام کو پوچھتا بھی نہیں۔ وہ اچا

آدمی نہیں ہے بی بی۔ تم کو بھی برباد کر دے گا..... شادی کرے گا..... پھر چھوڑ دے گا۔“

نجو ہنس پڑی.....

گل پروشے کو غصہ آ گیا اور غصے ہی میں وہ بلا رکے بولے گئی۔ تاج کی شراب نوشی، عیاشی، فحاشی سبھی کچھ گل نے نجو کو بتا دیا۔

لیکن

نجو پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس کی باتوں کو تخیل سے سنتی رہی۔ جب وہ

چپ ہوئی..... تو بڑے دھیرج سے بولی ”تم نے کوئی نئی بات نہیں کی گل پروشے..... میں یہ سب جانتی ہوں.....“

”پھر بھی شادی کرے گا۔“ وہ حیرانگی سے بولی۔

”ہاں۔“ آہنی انداز میں نجو نے فیصلہ کن ہاں کہی۔.....

”کیوں۔“ گل پروشے نے پوچھا۔

”نجو پلنگ سے اٹھی..... بے تالی سے ٹہلتے ہوئے بولی ”میری مرضی۔“

گل پروشے بھڑکی ہوئی تھی۔ تلخی سے بولی ”تم تاج کو نہیں جانتا۔“

”جانتی ہوں.....“

”نہیں نہیں..... نہیں..... وہ خراب آدمی ہے..... برا ہے اچا نہیں ہے۔ تم نہیں

جانتا.....“ گل پروشے ہذیانی انداز میں چیخی۔

”میں اتنا کچھ جانتی ہوں جتنا شاید..... تم بھی نہیں جانتیں۔“ نجو نے جواب میں

بڑے سکون سے کہا۔

گل پروشے کی آنکھیں دھندلا گئیں..... بڑے دکھ سے بولی ”باز آ جا لڑکی۔ ام

اس کا بیوی ہے..... ام اس کا شادی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ ام بوت دکھی ہے۔“ پھر وہ گلوگیر

آواز میں اپنی روئیداد نجو کو سنانے لگی۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کی ساری

کہانی اس نے نجو کو سنا دی۔

نجو

چپ بیٹھی سب کچھ سنتی رہی..... اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں

تھے۔

گل نے اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھا تو غصہ اباں کی صورت میں اٹھنے

لگا۔ ”یہ تمہارا بد بختی ہے۔ ام سردار کو نہیں چھوڑے گا..... ام اپنا اور اس کا جان ایک کرے

گا.....“

نجو نے کوئی جواب نہ دیا۔

گل غصے سے کھولنے لگی قہر آلود نظروں سے نجو کو دیکھا اور بے اختیارانہ بولی ”وہ



تمارا بھائی کا قاتل ہے لڑکی..... تمہارا بھائی کو اس نے قتل کر لیا تھا.....“

گل پروشے نے یہ آخری حربہ استعمال کیا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ بم گرے گا تو نجو کے فیصلے کے پرچے اڑ جائیں گے۔

لیکن

ایسا نہیں ہوا۔

نجو نے چونک کر اسے دیکھا ضرور۔ لیکن پھر بڑے تحمل اور سکون سے بولی ”میں

جانتی ہوں۔“

”یا خداوند.....“ گل پروشے اچھل کر پلنگ سے اتری اور نجو کے سامنے آتے

ہوئے تیزی سے بولی ”تم جانتا ہے۔“

نجو نے بے رنگ چہرہ اوپر اٹھا کر اسے دیکھا اور سر کے خفیف سے اشارے کے

ساتھ بولی ”ہاں.....“

گل پروشے ششدری اسے تنکے لگی۔

پھر

لپک کر آئی اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی ”بھائی کے قاتل سے

شادی کرے گا۔“

”ہاں۔“ نجو کا مختصر سا جواب تھا۔ وہ اپنا آپ اس سے چھڑا کر پرے ہٹ گئی۔

گل پروشے کی حالت دید کے قابل تھی۔ حیرت سے زبان گنگ ہو گئی تھی۔ دماغ چکرار ہا تھا اور کھلی آنکھوں سے نجو کو تنکے جا رہی تھی۔

نجو آہستہ آہستہ چلتی دیوار تک آئی۔ فضل کے خون آلود کپڑوں کو چھوا پھر سہرے

کی لڑیوں کو بوسہ دیا..... وہ بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔

”یہ میرا بہت پیارا بھائی تھا..... ایک ہی ایک دیر تھا..... یہ اس کے کپڑے ہیں“

یہ سہرا ہے..... وہ شادی والے دن قتل ہو گیا تھا..... مارا گیا تھا..... ختم ہو گیا تھا.....

نجو نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی سانسیں غیر ہموار تھیں۔ گل

پروشے بت بنی کھڑی رہی۔

”ہوں۔“ اس کے لبوں سے صرف یہی نکلا..... اور وہ پھیلی پھیلی حیرت زدہ

نگاہوں سے نجو کو دیکھنے لگی۔

اس پر کئی راز کھل گئے۔ کئی باتیں اس کے ذہن میں لپک جھپک آئیں۔

نجو نے آنکھیں کھول دیں۔ گل پروشے کو دیکھا۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں ہی بڑے پراسرار طریق سے نگاہوں کی زبان

سمجھتے سمجھاتے مسکرا دیں۔



تاج گاڑی سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ وہ شاپنگ کر کے لوٹا تھا۔ علما  
برآمدے میں کھڑا تھا..... وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

”علمے۔“

”جی۔“

”گاڑی سے ڈبے اور لفافے نکال لا۔“

”اچھا چودھری جی۔“

”کیا بات ہے علمے۔ بڑا پریشان ہے۔“ تاج نے اک نگاہ علمے پر ڈالی۔

”جی چودھری جی۔ ٹھہریں..... میں پہلے گاڑی سے چیزیں نکال لاؤں۔“

تاج نے سر کو ہلکی سی دائیں بائیں جنبش دی اور جالی دار دروازہ کھول کر اندر

چلا گیا۔

وہ اپنے کمرے میں گیا..... صبح سے بازاروں میں گھوم رہا تھا۔ کئی چھوٹی موٹی چیزیں

خریدنا تھیں۔ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ وہ کمرے میں آتے ہی پلنگ پر آڑا لیٹ گیا۔

علما لفافے اور ڈبے اٹھائے اندر آ گیا۔ دائیں ہاتھ رکھی ٹیبل پر چیزیں رکھ دیں۔

”چودھری جی۔“

”ہوں۔“

”وہ جی.....“

”کیا ہے؟“

”گل پروشے بی بی.....“

”کیا ہوا اسے؟“

”ہو اتو کچھ نہیں.....“

”پھر.....“

”پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔“

”کیا.....؟ تاج اٹھ بیٹھا.....“ کہاں چلی گئی؟“

”پتہ نہیں جی۔ صبح سے غائب ہے.....“

”واقعی؟“

”ہاں جی۔ میں نے سب جگہ دیکھا۔ پہلے تو یہی سمجھا گھر پہ ہی ہوں گی۔ پر کہیں

نہ ملیں۔ ادھر ادھر پوچھا ساتھ والے بنگلوں سے بھی پتہ کیا.....“

”کہاں جاسکتی ہے۔“

”کیا پتہ؟“

”وہ پہلے تو کبھی نہیں گئی ہے؟“

”کبھی نہیں جی..... آپ ہی شروع شروع میں کہیں لے جاتے تھے تو جاتی

تھیں.....“

”ہوں.....“

تاج کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور لمبے لمبے

کش لینے لگا۔

”مالی بابا سے پوچھا خانساں سے بھی..... کسی کو پتہ نہیں.....“

”ہوں۔“

”خدا جانے کہاں چلی گئی ہیں.....“

تاج اٹھ کر الماری کے قریب آ گیا۔ جیب سے چابیاں نکالیں۔ الماری کھول کر

اک سرسری سی نگاہ ڈلوں میں اور چیزوں پر ڈالی۔ سب چیزیں جوں کی توں پڑی نظر

آئیں۔ تسلی کر کے وہ مڑا..... اور علمے کی طرف دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں بولا ”لگتا ہے

بھاگ گئی ہے۔“

علمے نے نفی میں سر ہلایا ”بھاگ کر بیچاری نے جانا کہاں تھا.....“

”ہونہہ.....“ تاج بولا ”اچھا ہی ہوا..... خود ہی دفع ہو گئی۔ جان چھوٹی..... میں نے اسے خریدا کیا تھا، مصیبت خرید لی تھی.....“

علمی نے سراٹھا کر تاج کو دیکھا۔ یہ شخص اپنی بیوی سے اس قدر بیگانہ تھا۔ جو کچھ بھی تھا گل پروشے اس کی منکوحہ تھی، لیکن رشتوں کی نزاکت اور احترام کا تاج جیسے آدمی کو احساس ہی کہاں تھا۔ علمی کو تو اس لڑکی کے قریب رہنے سے اس کے ساتھ انسانی ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس کے یوں چلے جانے سے وہ فکر مند تھا۔ انجان اور جوان لڑکی کسی غلط آدمی کے ہتھے چڑھ گئی..... تو کیا ہوگا۔ وہ یہی سوچ سوچ کر فکر مند تھا۔

لیکن

تاج نے اس بات کو قطعاً اہمیت نہ دی۔ اسے تو نئی شادی کا چاؤ تھا..... نجو کے عشق کا بھوت دل و دماغ کو لپیٹ میں لیے تھا..... اسے گل پروشے کے گم ہونے کی فکر تھی نہ پروا.....

”کوئی چیز تو ساتھ نہیں لے گئی۔“ تاج نے اپنے کمرے کی چیزوں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے دیکھا نہیں ابھی، میں تو صبح سے اسی کے لیے پریشان ہوں۔“

”پاگل ہے تو۔“

”چودھری صاحب..... وہ آپ کی بیوی ہے۔“

”بکواس بند کرو.....“

علمی ہنس گیا۔

تاج ہنس کر بولا ”واہ علمی۔ تو تو یوں پریشان ہے جیسے وہ تیری سگی تھی کوئی، ارے پگلے میں تو اس سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا خود ہی غائب ہو گئی..... اب تیری نئی مالکین آنے والی ہے۔ اس کے آنے سے پہلے اسے تو ٹھکانے لگانا ہی تھا..... سمجھے.....“

علمی نے یونہی سر ہلا دیا۔ اس کے دل میں چودھری کے لیے نفرت کی لہری اٹھی۔ پہلی بار اسے مالک کے خلاف اتنی شدت سے کراہت محسوس ہوئی، لیکن کچھ کہنے کی مجال

کہاں تھی۔ چپ ہو گیا۔

تاج پلنگ پر پھر آڑا لیٹتے ہوئے بولا ”جا ذرا چائے بنوالا اچھی سی۔ ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے آ۔ دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھایا آج.....“

”اچھا جی۔“ علمی چلا گیا۔

تاج سگریٹ کے کش پہ کش لیتے ہوئے گنگناتے لگا۔ اس کے راستے کی بڑی رکاوٹ خود بخود دور ہو گئی تھی۔ اس بات سے وہ بے طرح خوش تھا۔

لیکن

یہ خوشی لمحاتی تھی۔

اس نے کوریڈور میں گل پروشے کو گزرتے دیکھا۔

”گل پروشے۔“ اس نے پلنگ سے اٹھ کر دروازے میں آتے ہوئے غصے سے چلا کر کہا

گل پروشے اپنے کمرے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہیں سے پلٹ کر تاج کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں جو شعلوں کی لپک تھی وہ تاج نہ دیکھ سکا۔

”کہاں سے آرہی ہو؟“

”کیوں؟“

”تیری یہ مجال کہ بغیر بتائے گھر سے نکل گئی..... کہاں گئی تھی؟“

”پہلاں والی، ملک فضل کا بھین سے ملنے.....“

”کیا؟؟؟“ تاج کا دماغ چکرا گیا، بوکھلا کر چیخا..... گل پروشے نے اس لمبی چوڑی چیخ نما ”کیا“ کا جواب دینے کی بجائے نفرت اور حقارت سے تاج کو دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی.....

تاج تیزی سے لپکا اور کمرے میں آتے ہی بڑی سی گندی گالی دیتے ہوئے بولا

”پہلاں والی کیا کرنے لگی تھی۔“

”امار مرضی ام گیا تھا۔“ گل نے زہریلے انداز میں جواب دیا۔

”کتیا.....“ تاج غراتے ہوئے اس پر جھپٹا..... اس کے بالوں میں مٹھی بھر کر

اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا ”کیوں گئی تھی وہاں..... بتا کیوں گئی تھی۔“

گل پروشے کی گردن جھٹکے سے ٹوٹنے کو تھی۔ وہ درد سے بلبلائی۔ بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئی چیخی..... ”خنزیرا..... بال چوڑا مارا۔“

لیکن تاج نے جھٹکے پہ جھٹکا دیا۔ غصے سے وہ لال پیلا ہو رہا تھا۔ گل پروشے پیلاں والی ہو آئی تھی۔ اس نے ضرور تاج کا کچا چٹھانجو کے سامنے کھولا ہوگا۔ اگر وہ بدظن ہوگئی ہوئی تو.....؟

اس تو کے جواب میں تاج کے اندر درندگی بھر گئی..... اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ وہ گندی اور شرمناک گالیاں بکتے ہوئے بالوں سے گھسیٹنے لگا۔

زہریلی ناگن زخم خوردہ تھی۔ اس نے بھی زہرا گلنا تھا۔ تاج کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے اور اپنی پوری قوت سے اس کی کلائی کو کاٹ لیا۔

اب تاج درد سے بلبلایا..... وہ بال چھوڑ کر اپنی کلائی چھڑانے لگا، لیکن گل پروشے بھی غصے اور انتقام کی آگ سے جل رہی تھی اس پر پل پڑی۔

دونوں ایک دوسرے کو اونچی آوازوں میں گالیاں بکتے بکتے گتھم گتھا ہو گئے۔ گل پروشے نے تاج کا گریبان پھاڑ ڈالا..... اور تاج نے گل پروشے کے کپڑوں کے چیتھڑے کر دیئے۔ گل پروشے کی لاتیں تاج کے پیٹ میں لگیں اور تاج کے مکے اور گھونسے گل پروشے کے بدن کو داغ داغ کر گئے۔

مقابلہ ہوا۔

لیکن گل پروشے عورت تھی اس تو منہ اور غصیلے سکھیرے کا مقابلہ نہ کر سکی۔ چند منٹوں بعد ہی بے حال ہو گئی..... وہ زمین پر لوٹنے لگی۔

پھر

تو تاج نے لاتوں سے اس کا بھر کس نکال دیا۔ وہ ہر لات پر لڑھکتی گئی۔ تاج نے کبھی اسے اٹھا کر پٹخا..... کبھی لاتوں سے لڑھکایا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔

شور و غل سن کر علما اور دوسرے نوکر لپکے، لیکن کسی کو سردار تاج محمد سکھیرے کے کام میں دخل دینے کی جرأت کہاں تھی۔ علما ہمت کر کے دو ایک دفعہ چھڑانے کو آگے بڑھا تو تاج

نے سختی سے ٹوکا اور اس طرح دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل فرش پر گرا.....

تاج گل پروشے کو گھسیٹتے ہوئے کمروں سے باہر لایا۔ برآمدے سے دھکا دیا اور بجری والی سڑک پر لڑھکا تا گھسیٹتا گیٹ سے باہر دھکا دے کر بولا ”ذلیل، کمینہ خبردار جواب اس گھر میں آئی..... دور ہو جا..... جہنم میں جا..... اب تیری شکل نظر آئی تو شوٹ کر دوں گا.....“

گیٹ بند کر کے وہ پھنکارتا ہوا واپس لوٹ آیا، جو شے سامنے آئی ٹھڈے سے اڑادی۔

سارے نوکر دم بخود کھڑے رہ گئے۔

-----○-----

ساری رازداری کی باتیں نجو سے کہہ دی ہوں گی۔

”نجو۔“ اس نے والہانہ بے تابی سے پھر پکارا۔

نجو اپنے آپ میں آگئی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا اور چادر اچھی طرح سر پر جمادی تھی۔

”ناراض ہو نجو؟“ تاج نے گھبرا کر پوچھا۔

نجو سمجھ گئی..... کہ تاج گل پروشے کے یہاں آنے سے آگاہ ہو چکا ہے اور یہی آگاہی اس کی پریشانی کا باعث ہے۔

وہ آپے میں آچکی تھی اس لیے سنبھل چکی تھی۔ اس نے تاج پر اک نگاہ ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔

”خفا ہونا۔“ تاج اس کے کچھ قریب تھا۔

”ہونہ۔“ نجو کے ہونٹوں پر صرف یہی نکلا۔ اس نے دانستہ منہ پھلایا۔ تاج کی تو جیسے جان پر بن آئی۔

”نجو..... اے نجو.....“ وہ بے تابی سے بولا۔

”کیا ہے۔“ آواز کٹار کی طرح کاٹتی ہوئی دکھائی دی۔

”ناراض ہو گئی ہو۔“

”ہاں۔“

”خدا کے لیے خفا نہ ہو نجو..... میں جانتا ہوں کل وہ ذلیل پٹھانی تمہارے پاس آئی تھی۔

”ہاں آئی تھی۔“

”وہ بکواس کر کے گئی ہوگی۔“

”آئی تھی تو کچھ کہا ہی ہوگا نا۔“

”تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا..... وہ بہت ذلیل ہے بہت کمینی۔“

”وہ تمہاری منکوہ ہے سکھیرے۔“

”ہاں..... مجھے..... انکار تو نہیں نجو..... لیکن.....“

”مجھ سے کیوں چھپایا تھا۔“

پو پھٹ رہی تھی۔

نجو فضل کی قبر پر پھول چڑھاتے ہوئے اپنے ابدی نیند سوئے ویر سے باتیں کر رہی تھی۔

”ویرا..... میریا ویرا۔“

اس کے لبوں سے بار بار نکل رہا تھا۔ وہ بڑی مضطرب اور بے چین نظر آ رہی تھی.....

شادی میں تین دن باقی تھے اور وہ یہی خبر اپنے ویر کو سن رہی تھی۔ بالکل جھلی لگ

رہی تھی..... اسے احساس ہی نہ تھا کہ وہ مٹی کے بے جان ڈھیر کے سامنے جو کچھ کہہ رہی ہے وہ فضل نہیں سن رہا..... اسے تو یہی لگ رہا تھا کہ فضل اس کے سامنے بیٹھا ہے اور وہ ہنستے

روتے ساری روئیداد اسے سن رہی ہے۔

وہ کبھی چپ ہو جاتی۔

کبھی

بولنے لگتی۔

”نجو۔“ کسی کی آواز آئی۔ اس نے دھیرے دھیرے سے سر اٹھایا۔ اوپر دیکھا

تاج قبر کے قریب کھڑا تھا۔

”نجو۔“ تاج دوزانو ہوتے ہوئے بولا..... وہ سراسیمہ سا تھا۔

نجو کچھ نہ بولی۔ بولنے کو جی ہی نہ چاہا۔ وہ تو احساس کی جانے کن منزلوں پر تھی

حال کی زندہ گھڑیوں میں لوٹ آنے کے لیے وقت لگنا تھا۔

تاج گھبرا گیا۔

گھبراہٹ تو اسے کل ہی سے تھی۔ گل پروشے نجو سے مل گئی تھی۔ اس نے یقیناً

”میں نے..... میں نے۔“

”ہاں ہاں.....“

”میں سمجھتا تھا تم جانتی ہوگی..... سب کو پتہ ہے.....“

”مجھے پتہ نہ تھا.....“

”نحو خدا کے لیے..... میری بات تو سنو.....“

نحو نے رخ پھیر لیا۔ تاج کی پریشانی پر اس کی آنکھوں میں ہلا کی چمک آگئی تھی۔

”میری بات سنو۔“ تاج نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف اس کا رخ کرنا چاہا۔

نحو نے نخوت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تاج کی بے کلی اور پریشانی دید کے

قابل تھی.....

”نحو..... میری بات تو سنو..... میں اپنی غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔“

تاج نے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن نحو اس کی طرف دیکھ تھوڑا ہی رہی تھی۔

”نحو..... میری بات سن لو پہلے..... اپنے دل میں کوئی میل نہ لانا مجھ سے غلطی

ہوگئی نحو..... میں سمجھتا تھا تم اس کے متعلق جانتی ہوگی۔ یہ لڑکی میں نے سوات سے خریدی

تھی۔ وہاں غریب لوگ اپنی لڑکیاں بیچ دیتے ہیں۔ اس کے گھر والے بھی بہت غریب

تھے۔ میں نے خرید لی.....“

”اور شادی رچالی۔“

”نہیں..... میں تو نہیں چاہتا تھا۔ یہ لڑکی ہی ضد کر بیٹھی..... مجبوراً نکاح کرنا پڑا۔“

”بڑے وڈے دل کے مالک ہونا۔“

”طعنہ نہ دو نحو..... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے اس عورت سے کوئی

تعلقات نہیں ہیں۔ وہ گھر میں بے کار شے کی طرح پڑی رہتی تھی۔“

”رہتی تھی؟“

”ہاں میں نے اسے نکال دیا ہے گھر سے۔“

”کیوں؟“

”وہ میرے خلاف تمہیں بھڑکانے آئی تھی..... وہ نہیں چاہتی ہماری شادی ہو۔“

”وہ آئی اور تمہیں فکر لگ گئی۔“

”فکر نہ لگتی..... وہ بکواس کرنے میں بڑی ماہر ہے جانے اس نے میرے خلاف

کیا کچھ کہا ہوگا.....“

نحو چپ ہوگئی۔ تاج چند لمحے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نکلتا رہا۔

”تم ناراض ہو مجھ سے..... نحو اپنے دل میں میری طرف کے کوئی میل نہ لانا۔

اس کی بکواس پر کان نہ دھرنا.....“

نحو اب بھی بیٹھی رہی۔

”میں نہیں چاہتا ہم اپنی نئی زندگی کا سفر غلط فہمیوں کے بار تلے شروع کریں۔

جب تک تم مجھے معاف نہ کروگی..... میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا۔“

”معافی کس بات کی مانگ رہے ہو..... اس نے..... اس نے تو جو کچھ کہا تھا وہ.....“

”وہ کیا؟“

”وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں جانتی تھی سب کچھ.....“

تاج نے اک گہری سانس لی۔ بے یقینی سے نحو کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر غم کا

تاثر تھا نہ خوشی کا۔ وہ کچھ بھی تو نہ جان سکا۔

وہ بار بار نحو سے معافی مانگنے لگا ہاتھ جوڑنے لگا۔

”معاف کر دے نحو۔“

”بخش دے۔“

”دل سے سارا میل نکال دے۔“

”تو نے مجھے معاف نہ کیا تو زندگی مشکل ہو جائے گی۔ میں تجھے خوش دیکھنا چاہتا

ہوں۔ دیکھ ہاتھ جوڑتا ہوں..... پاؤں پڑنے کو تیار ہوں۔“

تاج نے ہاتھ بڑھا کر نحو کے پیروں کو چھوا۔

تو

وہ مسکرا دی..... فاتحانہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر چل گئی۔

تاج کی جان میں جان آئی گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے ہوئے بولا ”شکر ہے تو مسکرائی۔“

رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ تیری خفگی سے میری جان پر بنی تھی۔“

”ایسی بات ہی کیوں کی تھی۔“

”چل غلطی ہو گئی تو نے معاف بھی کر دیا۔“

”پھر اٹھو اور جاؤ راستہ پکڑو۔“

”کیوں؟“

”دن نکل آیا ہے لوگ آنے جانے لگے ہیں۔“

”کیا ہوا۔“

”نہیں تاج.....“

”تاج تیرا تو تاج کی..... لوگوں کی کیا پروا..... اب ہم دونوں غیر تھوڑے ہی ہیں۔“

”ابھی اپنے بھی نہیں ہوئے۔“

تاج نے چونک کر نجو کو دیکھا وہ مسکرا دی۔ ”غلط بات تو نہیں کہہ رہی ابھی تو تین

دن باقی ہیں.....“

”اوہ ہاں.....“ تاج کے من میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔

”جاؤ نا۔“ چند لمحوں بعد نجو نے کہا۔

”جاتا ہوں تھوڑی دیر اور بیٹھنے دو.....“

”کیا کرو گے۔“

”تمہیں تنکوں گا۔“

”اتنے بے صبر نہ بنو۔“

”تم کیا جانو.....“

”بہت پیار ہو گیا ہے مجھ سے۔“

”پیار نہیں عشق ہو گیا ہے۔“

نجو ہنس پڑی.....

”جھوٹ نہیں کہہ رہا نجو۔“

”ٹھیک ہی کہتے ہو گے۔“

”یقین کرو۔ میں نے پہلی بار جب تمہیں دیکھا تو تم میرے من کو بھاگ گئیں۔“ نجو مسکرا دی۔

”تم فضل کی باگ پکڑتے ہوئے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں نا۔“ تاج نے کہا نجو کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ آنکھیں درد و کرب کی اذیت سے دو چار ہو گئیں۔ تاج اپنی رو میں کہے گیا ”اسی دن اسی وقت تم میرے من میں بس گئی تھیں اور میں نے تمہیں حاصل کرنے کا عہد کر لیا تھا۔“

نجو بے رنگ ہونٹوں پر پھسکی سی مسکراہٹ لیے اسے تنکنے لگی۔ ”تم بھی مجھے چاہتی ہونا.....“

”ہاں..... میں نے تمہیں فضل کی پھوڑی پر دیکھا تھا..... تو.....“

”تو.....؟“

”تو.....“

”پسند کر لیا تھا مجھے۔“

نجو نے سراسبات میں ہلا دیا۔ خوشی سے بہکنے لگا۔

”ہمارا پیار سچا تھا اسی لیے میل ہو گیا۔“ تاج نے مخمور نگاہوں سے نجو کو دیکھا.....

اس کا بس چلتا تو نجو کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیتا۔

”اب جاؤ بھی۔“ نجو نے ادائے دلربائی سے کہا۔

”جی نہیں چاہ رہا۔“ وہ بے تاب جذبات سینے میں دبائے بولا۔

”کہانا اتنے بے صبر نہ بنو۔“

”تھوڑی دیر اور بیٹھوں تو کیا ہرج ہے۔“

”فائدہ بھی تو کوئی نہیں تو جس بات کے لیے آیا تھا وہ کر لی۔“

”ہاں نجو۔ یقین مانو ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔“

”من میں چور تھا۔“

تاج خفت سے ہنس دیا۔ ”نہیں یہ بات نہیں بس ڈر لگتا تھا تم خفا نہ ہو گئی ہو کہیں.....“

”خفا تو میں ہو گئی تھی پر معاف کر دیا تجھے.....“

”اوہ تو کتنی اچھی ہے نجو.....“

”اس نے بے تابی سے نجو کا ہاتھ پکڑنا چاہا، لیکن نجو نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ

پرے ہٹالیا۔

اس اداے مست پر تاج مر مٹا.....

نجو کے بار بار کہنے پر بھی وہ نہیں اٹھا..... نجو کی قربت سے وہ مسحور اور مخمور تھا۔

شاید نجو بھی چاہتی تھی کہ وہ مسحور و مخمور رہے اسی لیے سختی سے اسے اٹھ جانے کا ایک

بار بھی نہ کہا تھا۔

ہاں جب خاصا اجالا پھیل گیا، شہر کو جانے والی سڑک پر نیل گاڑیاں جانے آنے

لگیں، گھڑسوار ٹک ٹک کرتے شہر کا رخ کرنے لگے اور بیرونی مسجد میں نماز کے بعد درس

لینے والے لوگ واپس آنے لگے تو تاج اپنی جگہ سے اٹھا۔

”رب را کھا نجو۔ اب تین دن بعد ملیں گے۔“

”وج گج (دھوم) کے ملیں گے سکھیرے۔“ نجو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”بالکل بالکل۔“ تاج نے سرمستی کے عالم میں کہا۔

”پھر وہ نجو کو دوبارہ رب را کھا کہہ کر قبر کے دوسری طرف سے اپنے راستے پر چل دیا۔

نجو کے چہرے سے ساری مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں میں

اجنبیت کا غبار پھیلنے لگا..... وہ جاتے ہوئے تاج سکھیرے کو خالی خالی نظروں سے تکتی رہی۔

تاج نے موڑ پر مڑ کر دیکھا اسے اپنی طرف تکتا پا کر ہاتھ ہلایا۔

نجو اس اشارے سے بے خبر بیٹھی رہی۔

پھر

اس نے سر جھکایا اپنے ویر کی قبر کو دیکھا۔

”ویرا، میرا ویرا۔“

اس کے لبوں سے فریادی نکلی اور وہ کچی قبر پر سر رکھ کر بے اختیاری سے رونے لگی۔

”کتے کا بچہ۔ سور کا بچہ، ام کو چوڑو..... ام کو چوڑو..... ام تمہارے دوست کا بیوی

ہے.....“

گل پروشے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی لیکن انسان کے روپ میں چھپا بھیڑیا اس پر

پل پڑا تھا..... احتجاج..... فریاد اور گالی گلوچ سے وہ مرعوب نہ ہو رہا تھا.....

گل پروشے کو تاج کا بد قماش اور آوارہ دوست ساتھ لے آیا تھا۔ گل کو تاج نے

دھکے دے کر گیٹ سے باہر کر دیا تھا۔ وہ اپنی اس بے عزتی پر بل کھاتی دانت بیستی اسے کوس

رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر آ رہے چل رہے تھے۔ وہ بہت خوفناک نظر آ رہی تھی۔ گیٹ

پھلانگ کر اندر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سخت تشویش میں تھی۔ اس کا ارادہ خطرناک

تھا۔ وہ اندر جا کر پستول کی ساری گولیاں تاج کے سینے میں اتارنا چاہتی تھی۔

ایسے میں تاج کا دوست یا کی آ گیا۔ اس کا نام لیاقت تھا۔ لیکن سب یا کی کہتے۔

جہاں بھر کا لوفر اور آوارہ آدمی تھا۔ تاج کا ہم پیالہ ہم نوالہ تھا۔ باپ دادا کی جائیداد پر عیش

کر رہا تھا۔ بیوی اس کی عیاشی، فحاشی سے تنگ آ کر میکے جا چکی تھی۔ اب اسے من مانی کرنے

کی کھلی چھٹی تھی۔

گل پروشے کو اس حال میں دیکھا تو صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ فوراً ہی

ہمدردی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ بڑی ملائمت سے پوچھا ”کہو کیا ہوا بھابی، لڑائی ہو گئی تاج سے۔“

”اس حرامی بچے کو ہم جان سے مار ڈالے گا۔“ گل پروشے غرائی۔

”حوصلے سے کام لو بھابی۔“

”اب ہم میں حوصلہ نہیں ہے۔ ام اس کو جان سے مارے گا۔“

یا کی نے بھرپور نظروں سے گل پروشے کو دیکھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا تھا



یا کی ہنس پڑا۔  
گل پروشے نے شعلہ بارنگا ہوں سے اسے دیکھا۔  
”بھابی..... کیا تاج پستول آپ کے ہاتھ میں پکڑا دے گا۔ پستول تو اس کے پاس ہوگا۔“

”ام اس سے چھینے گا۔“  
”جذبائی باتیں مت کریں، چلیں میرے ساتھ۔“  
”کدر.....“

”میرے گھر۔“  
”نہیں۔“

”یہاں سرعام پڑی رہیں گی.....؟“  
”ام جو چاہے گا کرے گا۔“

”عقل سے کام لیں۔ سردار سے بدلہ لینا ہی ہے تو تھوڑی عقل استعمال کریں، وہ بڑا زور آور آدمی ہے۔ وہ آپ کو قتل بھی کروا سکتا ہے۔ یہاں ٹھہرنا عقلمندی نہیں..... آپ کو پتہ ہے وہ قتل کروانے میں کتنا تیز ہے۔ وہ اپنے دشمن کو اک چیونٹی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا.....“  
بات گل پروشے کی عقل میں کچھ کچھ آ گئی..... اس کا جوش و جنون قدرے کم ہو گیا۔  
یا کی نے بات بننے دیکھی تو چکنی چڑی باتوں میں گل پروشے کو گلے لگا لیا۔ تاج سے انتقام لینے میں اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ بڑے بہلاوے دیئے۔ بھروسے اور اعتماد کی فضا بحال کی۔

”تو چلو۔“ گل پروشے اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کے سینے میں الاؤ جل رہے تھے۔ وہ بہت خونخوار ہو رہی تھی۔ تاج کی ہڈی پلی ایک کر دینے کا سوچ رہی تھی۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔

یا کی اسے گھر لے آیا۔ ایک کمرے میں گل کو بٹھاتے ہوئے بولا۔ میں اپنی بیوی کے کپڑے لا کر دیتا ہوں۔ آپ بدل کر آرام سے لیٹ جائیں۔“  
گل پروشے انجام و عواقب سے بے خبر صرف اور صرف تاج کے متعلق سوچ رہی

اور اس کا دودھیا بدن جھانک رہا تھا۔ یا کی جیسے لفنگے آدمی کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔

تاج اور گل پروشے کے تعلقات سے آگاہی تھی۔ تاج کے لیے اب گل پروشے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسی لیے تو اس دن اس نے شراب کے نشے میں گل دوستوں کو بخش دی تھی۔ ان دوستوں میں ایک یا کی بھی تھا۔

یا کی کی نیت بد ہو گئی، لیکن گل اس وقت سراپا شعلہ بنی تھی۔ غصے سے زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح کوٹھی کے اندر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ کپڑے پھٹے تھے۔ چہرے کی خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ دانت لہو بہنے سے سرخ ہو رہے تھے۔ چانٹوں کے نشان تھے۔ جسم پر مکوں، گھونسوں اور لاتوں کے داغ تھے۔  
”بھابی۔“ یا کی نے اسے بازو سے پکڑ کر گیٹ سے ہٹایا۔

”چوڑا ام کو.....“

”بھابی صبر سے کام لو۔ غصے سے کام نہیں بنے گا۔ بات کیا ہوئی، مجھے بتاؤ میں تاج کو سمجھاؤں گا۔ اس وقت وہ بھی غصے میں ہوگا۔“

”اس نے ام کو مارا، ام کو گھر سے نکالا، ام اس کو نہیں چوڑے گا۔“  
”بالکل نہ چھوڑیں، اس زیادتی کا بدلہ ضرور لیں.....“  
”تم امارا مدد کرے گا۔“

”ضرور کروں گا۔ آپ مظلوم ہیں آپ کی مدد کرنا میرا فرض ہے.....“  
”تو ام کو گیٹ کے اندر کرو۔“

”کیا کریں گی اندر جا کر۔“

”پستول سے شوٹ کرے گا اس کو۔“

”بھابی۔“

”ام کو مت روکو۔“

”روکتا نہیں۔ لیکن آپ کا طریقہ غلط ہے۔ پستول ہے آپ کے پاس؟“

”ام اندر سے لے گا۔ سردار کے پستول سے اسے مارے گا۔“

آپ آرام کریں.....“  
 ”تم امارا مدد کرے گا؟“  
 ”یقین کریں بھابی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“  
 ”چائے پیئیں۔“  
 ”تم جاؤ ام پئے گا۔“  
 ”یا کی اٹھ کر چلا گیا۔ گل نے گرم گرم چائے کی دو تین پیالیاں اندراٹھ پلئیں پھر وہ بستر پر لیٹ گئی۔

اور

جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن بھر کی تھکی تھی شام مارنے اودھ موا کیا تھا۔ وہ سوئی تو پھر دن چڑھے ہی اٹھی۔  
 وہ رات دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر سو گئی تھی۔ صبح جوں کی توں اٹھی تو یا کی پر بھروسہ اور اعتماد دو چند ہو گیا۔

سارا دن وہ یا کی کے ہاں ہی رہی۔ وہ اس کے پاس وقفوں کے بعد آ کر بیٹھتا رہا..... اس کے ساتھ انتقام کے منصوبے بناتا رہا۔ اس کو پستول دینے کا بھی وعدہ کیا۔  
 گل پروشے انسانی روپ میں ابلیس پر پورا یقین کر بیٹھی۔

لیکن

دوسری شب

وہ اس کے کمرے میں آ گیا۔ گل پہلے تو کچھ نہ سمجھی۔ اس کے ذہن پر صرف تاج سے انتقام ہی کا بھوت سوار تھا۔

لیکن درندگی اور خباثت نے جب اسے اپنی لپیٹ میں لینا چاہا تو وہ چیخ اٹھی.....  
 اس نے احتجاج کیا۔

اس نے فریاد کی۔

اس نے منت سماجت کی۔

تھی۔ وہ اس ظالم انسان کو اس بھیڑیے صفت آدمی کو اس مرد کے روپ میں درندے کو زندہ نہیں چھوڑے گی اس نے عہد کر لیا۔  
 یا کی کپڑوں کا جوڑا لے آیا..... ”آپ کپڑے بدل لیں۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں.....“

وہ کپڑے میز پر رکھ کر چلا گیا۔ گل پروشے چند لمحے چپ بیٹھی رہی۔ پھر اس نے اپنے آپ پر نگاہ ڈالی۔ اس کے جسم کے کئی حصے پھٹ جانے والے کپڑوں میں سے جھانک رہے تھے۔ شرم اور غیرت سے وہ کانپ گئی۔

جلدی سے اٹھی دروازہ بند کیا اور کپڑے تبدیل کر لیے۔ اس نے چادر سے اپنا پورا وجود ڈھانپ لیا۔ غسل خانے میں اس نے منہ ہاتھ بھی دھویا اور بال بھی ٹھیک کیے۔  
 وہ بظاہر پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کے من میں اب بھی آندھیاں چل رہی تھیں۔ جھکڑوں کا زور تھا۔ اس کی دنیا لٹ گئی تھی، تہس نہس ہو گئی تھی، لیکن وہ خاموشی سے اس پر ماتم کرنے کے حق میں نہیں تھی..... وہ تاج سے بدلہ لے گی۔ اسے زندگی کی رنگینیوں میں کھونے سے پہلے ہی ختم کر دے گی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہو۔“ گل پروشے نے پوچھا۔

”چائے لایا ہوں بھابی۔“ یہ یا کی تھا۔

گل نے دروازہ کھول دیا۔ یا کی کی ہمدردی اس پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کا سبب تھی۔ وہ چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولا ”آپ چائے پی کر اطمینان سے لیٹ جائیں۔ کچھ سکون ملے گا.....“

”ام کو سکون ابھی نہیں ملے گا۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے پھر بھی آرام تو کریں۔“

”ام آرام اس وقت کرے گا جب تاج کو آرام کی نیند سلا دے گا۔“

”ضرور ضرور.....“ یا کی نے طرفداری کی۔ ”آپ جیسی مظلوم عورت کے ساتھ مجھے دلی ہمدردی ہے۔ میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا..... لیکن اس وقت بہتر یہی ہے کہ

رت بدل چکی تھی۔ گلابی جاڑا تھا۔ اس سردی کو پنڈ کے لوگ خاطر میں کب لاتے تھے۔ کھیسوں اور چادروں کی بکلیں اتار پھینکی تھیں۔ بیٹھکوں میں رت جگے نہیں ہوتے تھے۔ میدانوں میں رات گئے بیٹھنے اور گپ شپ لگانے کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ درختوں تلے چار پائیاں اور حقے آگئے تھے۔ ڈھور ڈنگر بھی اب کڑھوں کی بجائے کھل آسمان تلے بندھے جانے لگے تھے۔

گاؤں کی الہڑنیاں کھیل کود کے لیے شام ڈھلتے ہی میدان میں جمع ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔۔۔۔۔ ان کی مائیں بھی کام کاج ختم کر کے کھیتوں کے کنارے آ بیٹھتیں۔ گندم کی فصل تیار ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ فضا کچی گندم کی خوشبو سے بھری رہتی تھی۔

لڑکیاں بالیاں میدان میں جمع تھیں۔ گیارھویں کا چاند آسمان کے سینے پر دھرا تھا۔ اب ان ٹیاروں کے کھیلوں میں وہ گرمی وہ زندگی اور وہ پیار نہ رہا تھا۔ ان سب کی روح رواں نجو تھی جو یہاں نہیں آتی تھی۔ اس کی ساتھی سکھیاں بھی بددل ہو گئی تھیں۔ شاد و بیگی تو پھر بھی کھیل کود لیتیں، لیکن رتوں نے تو آنا چھوڑ ہی دیا تھا۔

آتی بھی تو کھیل میں حصہ نہ لیتی۔

چپ چاپ کسی کھیت کی کچی منڈیر پر بیٹھ جاتی۔ لڑکیوں کے اصرار پر بھی لکھن مٹی میں حصہ نہ کھلی کلیر میں۔

آج بھی لڑکیاں میدان میں آئی ہوئی تھیں۔ چاندنی کافسوں پھیلا تھا۔۔۔۔۔ گدرائی ہوئی ہوائیں چل رہی تھیں۔۔۔۔۔ الہڑ مست اور فکر فردا سے آزاد کنواریاں کھیل رہی تھیں۔۔۔۔۔ غم فکر سے آزاد تھیں، کچھ دن انہوں نے گاؤں میں ہونے والے ایسے کا دکھ جھپلا تھا، لیکن اب وہ اسے فراموش کر چکی تھیں۔۔۔۔۔

گالیاں بکس۔  
کوسا۔

مارا۔

لیکن ایک درندے کے سامنے اس کی کیا حقیقت تھی۔ وہ اس کی ساری باتوں کے جواب میں کھل کر قہقہے لگاتا رہا۔۔۔۔۔ اسے بتاتا رہا کہ اس کے سردار نے اسے بخشیش کے طور پر اپنے دوستوں میں بانٹ دیا ہے۔ اس بخشیش کے حقدار دوسرے دوست محبوب، حمید اور صابر بھی ہیں۔۔۔۔۔ گل پروشے جو رستم کے خلاف چبختی رہی۔

لیکن اس درندے نے اک پاک طینت غیرت مند اور گھریلو زندگی کی متمنی عورت کو کچل ڈالا، بکھیر دیا، توڑ دیا۔۔۔۔۔

صرف اسی نے نہیں دوسرے دن اس کے باقی دوستوں نے بھی بخشیش کا حصہ وصول کیا۔

گل پروشے ٹوٹ گئی، بکھر گئی، چکنا چور ہو گئی، لٹ گئی، برباد ہو گئی۔

اور

جب

اک عورت کی دنیا لٹ جائے، خواب چکنا چور ہو جائیں، وجود ٹوٹ جائے تو

وہ

عورت باقی نہیں رہتی۔

صرف

اور

صرف

جذبہ انتقام بن جاتی ہے۔

جذبہ انتقام۔

جو انتہائی شدید بے حد خطرناک اور بڑا ہی خوفناک ہوتا ہے۔

ہاں ان کی ماؤں اور بڑی بہنوں بھابیوں کے لیے یہ موضوع آج بھی تازہ تھا..... آج تو بطور خاص وہ باتوں میں مصروف تھیں۔ فضل کے قتل اور نجو کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔

گل پروشے کے گاؤں آنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

رتو عورتوں کے جملگٹھے سے ذرا ہٹ کر اکیلی بیٹھی تھی۔ دل بے طرح اداس تھا۔ نجو سے وہ روٹھی ہوئی تھی۔ جانتی بھی تھی کہ وہ بس دودن کی مہمان ہے پھر بھی وہ اس کے پاس نہیں گئی تھی۔

عورتیں چرچے کر رہی تھیں۔

”ہیں نی۔ تو نے دیکھا تھا پٹھانی کو۔“

”لو اور سنو۔ دیکھا کیا اچھی طرح دیکھا تھا۔“

”بھئی ایڈی سوئی عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔“

”تا جے کی بیوی ہے پہلی۔“

”ہائے میں مرگئی۔ نجو سوکن پر جا رہی ہے۔“

”ہاں۔ تمہیں پتہ نہیں۔“

”مجھے کیا پتہ۔“

”اس کڑی کو پتہ نہیں سو جھی کیا ہے۔“

”مرضی کی مالک ہے، وڈا ان کا تو کوئی رہا نہیں، خود ہی فیصلہ کر لیا اس نے.....“

”فضل زندہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتا۔“

”اے کیا پتہ..... وہ خود بھی تو سکھیروں سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔“

”دوستی اور بات ہے، دھی کا رشتہ دینا اور بات۔ آخر کو تو یہ لوگ اس کے پیو کے

قاتل ہیں.....“

”تاج کے کرتوت بھی تو سب جانتے ہیں۔“

”اس کی تو نظریں ہی بھیڑی ہیں۔“

”لچا ہے لچا.....“

”اللہ خیر کرے نجو کی۔“

”مت ماری گئی ہے اس کی۔“

”ہائے ہائے..... گھر ہی تباہ ہو گیا ملکوں کا۔“

”رہا ہی کوئی نہیں.....“

”کیا شان تھی چودھری رحمت علی کے ویلے اس خاندان کی..... جو ملی کی۔“

”ہاں۔“

”عورتیں پرانی باتیں یاد کرنے لگیں۔“

”آج مکاں کی دھی کی شادی رچی ہے تو لگتا ہے جیسے مر گیا ہو، جو ملی سوئی ہے بالکل۔“

”حالانکہ دودن کے بعد شادی ہے۔“

”کوئی رونق ہی نہیں.....“

”بھئی رونق تو ہوتی ہے لوگوں کے کٹھ سے، گانے بجانے سے، ڈھول ڈھمکانے سے،

لیکن نجو نے سب کچھ منع کر دیا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، جوان بھائی کی ابھی تو راہیں بھی میلی نہیں ہوئیں۔“

”شادی کی اتنی اتول (جلدی) کیا پڑی تھی۔ کوئی سال چھ مہینے اڈیک لیتی.....“

رتو کے یہ بات دل لگی۔ ”واقعی اتنی جلدی کیا تھی شادی کی۔ ویر کی اتنی دیوانی

تھی۔ راہ بھی میلی نہ ہونے دی اور شادی رچا بیٹھی۔“

دل ہی دل میں بل کھاتے ہوئے رتو نے سوچا۔ اسے نجو سے نفرت سی محسوس

ہوئی۔ راجو کا دل توڑنے والی بے رحم لڑکی سے تو وہ پہلے ہی روٹھی ہوئی تھی۔

وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا جی چاہا ابھی جا کر نجو کو جھنجھوڑ ڈالے، خوب

طعنے دے، اس کی شادی کو بربادی کہے، جو بھائی کے مرنے کے تین مہینے بعد ہی وہ رچا

بیٹھی تھی۔

لیکن

وہ نجو کے گھر کی طرف نہ گئی۔ ہولے ہولے چلتی اپنے گھر کو جانے لگی۔ لیکن وہ

اپنے گھر بھی نہ گئی۔ اس کے کانوں میں بنسری کی سریلی لے اترنے لگی۔ اس کا بھارا جو

درختوں سے پار بنسری کا کلیجہ چیر کر فضا میں درد ہی درد بکھیر رہا تھا۔  
اس کے قدم آپوں آپ اس طرف اٹھنے لگے۔

راجو ایک ٹنڈ منڈ درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بنسری بجا رہا تھا۔  
بنسری کیا تھی نوحہ تھا۔ ساری فضا سو گوار تھی درد برس رہا تھا۔ دکھ بھری چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

راجو کو تو جیسے سدھ بدھ ہی نہ تھی۔ وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی اداسی تھی کہ دیکھنے والے کا صبر و ضبط لٹ جاتا تھا۔  
رتو چپ چاپ اسے تنگے گئی۔ اس کے دل کا درد پکھلنے لگا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

جب درد حد سے بڑھا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر بنسری راجو کے ہونٹوں سے جدا کر دی اور دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی ”بس بھارا راجو بس.....“  
راجو نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے رتو کو پا کر حیران ہوا۔ ”تو کب آئی بھین رتو.....“

”مجھ سے تیری حالت نہیں دیکھی جاتی بھارا راجو۔“ رتو پھر رو پڑی۔ راجو بڑا متاثر ہوا۔ اس معصوم سی لڑکی کی ہمدردی نے اس کے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا۔ اس کے دل میں اس کے لیے عقیدت بھر گئی۔ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

”تو روتی کیوں ہے بھین رتو..... یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔“

”وہ بہت بری ہے۔ اس نے تمہیں غریب سمجھ کر چھوڑ دیا نا۔“

راجو نے گہری سانس لے کر کہا ”غریب ہی تو ہوں.....“

”یہ اسے پہلے نہیں پتا تھا۔“

”چلو کیا ہوا.....“

”ہوا ہی کچھ نہیں۔ تیری زندگی برباد کر دی اس نے۔ بہت بری لگنے لگی ہے مجھے۔“

راجو دھیرے سے مسکرایا..... یہ مسکراہٹ زخم خوردہ تھی۔

”ہاں سچ کہہ رہی ہوں میں۔“

”تو بہت غصے میں ہے رتو..... ورنہ یہ بات نہ بھولتی کہ جو دل کو پیارے ہوتے ہیں وہ کبھی برے نہیں لگتے.....“  
”ہونہہ۔“

”سچی بات ہے۔“

”نحو تجھے اب بھی اچھی لگتی ہے۔“

”نحو.....“

وہ چند لمحے چپ رہا..... رتو جلدی سے بولی ”دفع کرا سے۔ بہت برا کیا اس نے تیرے ساتھ پہلے پیار کیا پھر دھتکار دیا.....“  
”ہاں رتو بھین..... جانے اس نے ایسا کیوں کیا..... شاید کوئی مجبوری ہو کوئی مصلحت ہو.....“

”ہائے ہائے اب بھی دل کو جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ وہ بے وفا نکلی ہے راجو بھائی اسی لیے تو میں اس سے بولتی نہیں ہوں۔ اس نے مجھے ایک دو دفعہ بلا بھی بھیجا ہے پر میں گئی نہیں.....“  
”کیوں۔“

”بس وہ قول کی جھوٹی نکلی۔ ایسی کڑی سے میں دوستی کیوں کروں۔“

”تجھے تو کچھ نہیں کہانا اس نے..... دھتکارا تو مجھے ہے۔“

”میرے ساتھ کون سا اچھا بولتی ہے..... پھر تمہیں جس طرح چھوڑ گئی ہے مجھے زہر لگتی ہے۔“

”نہ نہ رتو بھین..... اگر تجھے اس سے واقعی پیار تھا تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا.....“

”کیوں نہیں ہو سکتا..... دیکھ لے میں اس سے بالکل نہیں ملتی اس کی شادی میں بھی نہیں جاؤں گی..... اسی لیے تو کہتی ہوں تو بھی اسے دفع کر صحت برباد کر لی ہے اتنا سا منہ نکل آیا ہے تیرا..... چھوڑ دے اس کا خیال۔“

”رتو بھین.....“ راجو نے کہا پھر چند لمحے چپ رہا۔ رتو اس کا منہ تیکنے لگی۔ وہ

بڑے مستحکم لہجے میں بولا ”نحو میرا سچا تے سچا پیار ہے بھین رتو..... اس نے مجھے دھتکار دیا ہے“

چھوڑ دیا ہے..... وعدے نہیں نبھائے، قول توڑ دیئے، ساری باتیں بھلا بیٹھی..... لیکن وہ میرے لیے اب بھی وہی ہے۔“

”تو بھی جھلا ہو گیا ہے۔“ رتو چڑ کر بولی۔

راجو ہنس پڑا..... پھر بنسری دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے بولا ”بھن وچھڑ جائیں نا تو دل کے اور بھی قریب ہو جاتے ہیں رتو بھین.....“

رتو نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ بولا ”یہ پیار تو نہ ہونا کہ سجنوں نے منہ موڑا تو خود بھی منہ موڑ لیا..... پیار سچا ہو، گہرا ہو سچا ہو تو مٹا کہاں ہے بی بی..... یہ تو اپنی جڑیں من میں اور گہری کر لیتا ہے۔“

”ہائے ہائے پاگلوں والی باتیں کرتا ہے تو بھارا جو۔“

”تو نہ سمجھے گی رتو بی بی..... دلاں دیاں لکیاں دلاں والے ہی جانتے ہیں۔“

”ہونہہ۔“ رتو نے برا سامنہ بنایا۔

”میری تو دعا ہے نجو شادو آ باد رہے..... جس مصلحت کے تحت بھی اس نے یہ فیصلہ کیا ہے اس میں کامیاب ہو۔ شادو آ باد رہے شادو آ باد.....“

راجو کی آواز حلق میں پھنس گئی..... رتو نے اس کی طرف دیکھا، ضبط کا یار اندر رہا..... آنکھوں میں آنسو بھر آئے..... اور آنچل میں انہیں جذب کرتی وہ واپس جانے کو مڑی۔

”اس کے ہاں ضرور جانا رتو..... وہ تیرے بچپن کی سکھی ہے.....“ راجو نے کہا۔

رتو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر جھکائے چلتی چلی گئی۔

راجو کے ہونٹوں نے پھر بنسری کا چھلنی سینہ چھولیا۔

اور

فضا میں پہلے سے بھی زیادہ دردیلے نغمے بکھرنے لگے۔

-----○-----

پہلاں والی کی فضا سو گوار تھی۔ اک غیر محسوس سی اداسی ہر دل میں اتر رہی تھی..... درود یوار گم صم تھے۔ شجر چرچر سادھے محسوس ہوتے تھے۔

آج نجو کی شادی تھی۔

ملک فضل کی بہن کی شادی تھی۔

لیکن

حویلی کے درود یوار اداس تھے۔ دالان، صحن، کوٹھے سب مہمانوں سے بھرے تھے۔ عورتوں، لڑکیوں اور بچوں نے رنگارنگ لباس پہن رکھے تھے۔ مردوں نے بھی نئے اور ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پھر بھی یہ گھر شادی والا نہ لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی میت اٹھنے والی ہے۔

لوگ فضل کو یاد کر رہے تھے۔

اس جواں مرگ کو رو رہے تھے۔

نجو کے لیے آنسو بہا رہے تھے۔

آج اس اکیلی دھی کا ڈولہ اٹھنے والا تھا۔ باپ نہ تھا جس کے گھر کی دہلیز اس نے

چھوڑنا تھی۔ بھائی نہ تھا جس نے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے پرانی کرنا تھا۔ کوئی قریبی ماما چاچا بھی نہ تھا جس نے یہ فریضہ ادا کرنا تھا۔

لوگ یہی باتیں کر رہے تھے۔

اور

آنسو بہا رہے تھے۔

پھوپھی سکینہ اپنی جھلی دھی کو فضل کے گھر لے آئی تھی۔ لوگ اس نامراد کو دیکھ کر

دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

بارات بڑی دھوم دھام سے آئی..... سکھیروں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا..... وہ ناچ رہے تھے گدے ڈال رہے تھے لڑیاں ڈالتے ہوئے آئے تھے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ ان کی خوشیاں حق بجانب تھیں ان کے جذبات فاتحانہ تھے ان کا ہاتھ اوپر تھا ان کا سر اونچا تھا وہ اپنے جدی پشتی دشمنوں کی بیٹی بیاہ کر لے جا رہے تھے۔ اس بیٹی کے باپ کو انہوں نے قتل کیا تھا..... اور تاج جانتا تھا کہ اس کے بھائی کو قتل کرانے والا وہ خود ہی تھا۔

بارات کی سب دھج بڑھانے کے لیے شہر سے سوہنی کا بینڈ آیا تھا۔ یوں بھی ٹکڑیوں میں ڈھول باجے بج رہے تھے۔ کچھ مسخروں نے سوانگ بھرے ہوئے تھے۔ کچھ کھیل تماشے دکھا رہے تھے۔

سکھیروں کی بارات اس دھوم سے آئی کہ پھلاں والی کا ہر فرد مرعوب سا ہو گیا..... ہر کوئی داد دے رہا تھا۔

واہ واہ ہوئی..... شاباشیں ملیں۔

ملکوں اور سکھیروں کے ملاپ پر خوشی کا اظہار کیا گیا..... لیکن

جو اسی دلوں میں اتر گئی تھی وہ اس سارے ہنگامے اور رنگارنگ تفریحی پروگرام سے بھی دور نہ ہوئی۔

فضل کی شادی کا سانحہ اک زندہ المیہ تھا۔ بیگاں کی دیوانگی، نوجو کا اکیلا پن اور کچھ راز دانوں کے لیے راجو کی ناکامی دکھ واذیت کا باعث تھی۔ رتو آج بھی اسی لیے نہیں آئی تھی۔

نوجو نے سب سہیلیوں سے پوچھا تھا۔

”اسے بلا لاؤ۔“ اس نے شادو سے کہا تھا۔

”پھر یہ وقت کہاں آئے گا۔“ اس نے چاچی سے کہا تھا۔

”اسے کہو مجھے اپنے ہاتھ سے وہ بیٹی بنائے میرا سنگھار کرے مجھے کپڑے

پہنائے میرے ماتھے پر ٹیکہ سجائے میری بانہوں میں چوڑیاں بھر دے میرے گلے میں

کنٹھے اور مالائیں ڈالے۔“ اس نے بڑے کرب سے جیلاں سے کہا تھا۔

لیکن

وہ کسی کے بھی کہنے پر نہیں آئی تھی۔ اسے راجو کا دکھ تھا۔

راجو جو اسے بڑے بھائیوں کی طرح عزیز تھا اور جس کے پیار کی گہرائیوں اور گیرائیوں سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

راجو کی تڑپ سے بھی آگاہ تھی۔ وہ رات رات بھر ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ بانسری کے کلیجے سے دکھ کے نغمے چیر کر نکالتا رہتا تھا۔

وہ نہیں آئی۔

نوجو نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔

اس نے خود ہی کپڑے پہنے، سنگھار کیا، زیور پہنا اور گولے بھر لال دوپٹہ اوڑھ بیٹھی۔

سہ پہر کو بارات کی واپسی تھی۔ لال گولے کناری والے دوپٹے سے ڈھکا سرخ ڈولہ حویلی کے دروازے پر آ گیا تھا۔

زرتار، سنہری لڑیاں اور پھولوں سے بنا سہرا ڈالے کھواب کی شیروانی پہنے تاج ڈولے کے قریب کھڑا تھا۔

رخصتی کے لیے کہا جا رہا تھا۔ لوگ انڈاڈ کر حویلی کے دروازے کی طرف آ رہے تھے۔ سوہنی کا بینڈ الوداعی گیت کی دھن بجانے کو تیار کھڑا تھا۔

رشتے کی بھابھیاں، پھپھیاں، ماسیاں نوجو کو ڈولے تک لانے کے لیے دالان میں گئیں..... نوجو پلنگ پر بیٹھی تھی اس کے چہرے پر انوکھا سا نکھار تھا۔ بڑا روپ آیا تھا۔

لیکن اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ وہ بالکل نہیں روئی تھی۔

”چلو بیٹی۔“ کسی رشتے کی تائی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”ٹھہرو تائی۔“ نوجو نے کہا۔

”کیوں؟“

”تم سب لوگ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔“

”سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نوجو پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔

”جاؤ نا۔“ پتھر کے بت کے ہونٹ ہلے۔

”کیوں۔“ کسی نے کہا۔

”میں نے کہا نا جاؤ سب..... جاؤ بھی.....“ وہ درد بھرے التجا آمیز لہجے میں بولی۔

”بادلِ خواستہ سب کمرے سے جانے لگے۔ شادو اور بیگی پلنگ پر ہی بیٹھی رہیں۔“

”تم بھی جاؤ۔“ نجو نے کہا۔

”بات کیا ہے نجو.....“

”بتاؤں گی پہلے جاؤ باہر۔“

”وہ دونوں بھی باہر چلی گئیں۔ نجو نے دالان کا دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ اپنے ویر کے خون آلود کپڑوں اور سہرے سے یوں لپٹ گئی جیسے یہ بے جان چیزیں نہ ہوں..... اس کا اپنا پیارا ویر فضل ہو..... وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑی رہی پھر اس نے بڑی عقیدت سے سب چیزوں کو چوما آنکھوں سے لگایا..... بکس کی طرف آئی..... کوئی چیز نکال کر دوپٹے کے اندر کی..... اور

دروازہ کھول دیا۔

عورتوں لڑکیوں بچوں کا ہجوم پل پڑا رشتہ دار مرد بھی آگے بڑھے۔

-----○-----

کہاروں نے ڈولہ حویلی کے دروازے سے لگا دیا۔ تاجِ خواب کی اچکن پہنے بنارس پگ پر بھاری پھولوں اور تازہ لڑیوں کا سہرا پہنے ڈولے کے قریب کھڑا تھا۔ ڈولے پر سرخ گوٹے سے بھری چادر ڈالی گئی تھی اور پھولوں کی پیتیاں بکھیری گئی تھیں۔

شادی کی ساری رسمیں انجام پا چکی تھیں۔ وقتِ رخصت قریب تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ واپسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بارات کے ساتھ آئے لوگ گلی، کھیتوں اور میدان میں منتظر کھڑے تھے۔ سوہنی کا بینڈر خستی دھن بجانے کے لیے تیار تھا۔

شور شرابے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر کوئی ڈیوڑھی اور گلی کی طرف لپک رہا تھا۔ نجو کو ڈولی میں بیٹھتے دیکھنے کے لیے لڑکیاں اور عورتیں تو اُمڈ آ رہی تھیں۔

نجو دلہن بنی تھی۔ سرخ سلمے ستارے اور گوٹے کنارے سے بھرے کپڑے پہنے تھے۔ لمبے بالوں میں سونے کی گھنگھریوں والا لال پراندہ ڈالا تھا۔ سر سے پاؤں تک بھاری بھاری زیور تھا۔

”جلدی کرو بھی..... ڈولہ آ گیا ہے۔ باراتی تیار کھڑے ہیں۔ دوسرے گاؤں پہنچنا ہے دیر ہو رہی ہے۔“ کسی رشتے کے چاچا نے آ کر لڑکیوں سے کہا جو نجو کو گھیرے بیٹھی تھیں۔

نجو

جو وہاں تھی۔

لیکن نہیں تھی۔

رشتے کی بہنیں بھابیاں آگئیں، جل تھل آنکھوں سے نجو کو دیکھا ”چلو نجو.....“ انہوں نے نجو کو پلنگ سے اتار کر دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھایا اور دالان سے باہر



لے جانے لگیں۔

نحو کا رخ دروازے کی بجائے دیوار کی طرف ہو گیا..... وہ آہستہ آہستہ چلتی فضل کے سہرے اور کپڑوں کے قریب گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ان بے جان چیزوں کو نہیں جیتے جاگتے فضل کو تک رہی ہے۔ پھر اس نے سر بھی یوں جھکایا جیسے وقت رخصت بھائی سے پیار لے رہی ہو۔

ارد گرد کھڑی عورتیں اور لڑکیاں سسک اٹھیں..... آنچلوں سے آنسو پونچھ پونچھ کر انہوں نے آنکھیں اور ناک سرخ کر لیے تھے۔

نحو چند لمحے سہرے کی لڑیوں کو آنکھوں سے لگائے رہی پھر انہیں چو ما اسی طرح فضل کے خون آلود کپڑوں کو بوسہ دیا جانے کیا بڑ بڑائی۔

بھابی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا ”چھوڑ دے جھلے..... جانے گھر..... رب تجھے سدا راضی رکھے۔“

نحو کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ ہونٹ بھی روکھے پھیکے تھے..... آنکھوں میں اجنبیت کی دھند پھیلی تھی۔

عورتیں اسے دونوں بازوؤں سے تھامے دالان سے باہر لے آئیں۔ صحن میں کھڑی عورتیں نحو سے ملنے کو اس پر پل پڑیں۔ روتے ہوئے گلے ملیں۔ سسکتے ہوئے دعائیں دیں۔

نحو کی آنکھوں سے آنسو کا اک قطرہ نہ بہا۔ بابل کی دہلیز چھوڑتے وقت تو کڑیاں رو رو کر بے حال ہو جاتی ہیں..... جس میاں کا بھائی نہ ہو وہ ایسے وقت میں مجسم فریاد بن جاتی ہے۔

لیکن نحو چپ چاپ صحن پار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں حتیٰ کہ جب رتو بے اختیار ہو کر آگئی اور اس سے لپٹ کر ٹپ کر رو دی جب بھی نحو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا قطرہ نہ ٹپکا۔

”غم سے بت بن گئی ہے۔“

”جی کو کچھ نہ ہو جائے۔“

”رو لیتی تو دل کا غبار نکل جاتا۔“

”ہائے و چاری۔“

عورتیں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں جو سر جوڑے آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر رہی تھیں۔ نحو کو روتے دھوتے ڈولے میں سوار ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات تو انہیں عجیب سی لگ رہی تھی۔

”جانچئے۔“

”تیرا رب را کھا دھیے۔“

”بابل کی حویلی اندھیری ہو گئی ہے۔ پیچھے کوئی نہ رہا۔ آگے جا کر خدا تیرا گھر روشن رکھے۔“

”آنسوؤں اور دعاؤں کے سہارے نحو کو دروازے تک لایا گیا۔ تاج کو اس کے برابر کھڑا کیا گیا۔

بھابی رحمتے تھالی میں کچھ چاول ڈال لائی۔ نحو اور تاج کے سامنے کرتے ہوئے بولی ”چاول اپنے پیچھے پھینکو۔“

”یہ رخصتی کی رسم تھی۔ اک علامتی رسم تھی کہ لڑکی کے جانے کے بعد بھی اس گھر میں رزق کی کمی نہ ہو۔ یہ رسم ہمیشہ ہنستے کھیلتے کی جاتی تھی، لیکن نحو کا معاملہ اور تھا..... پیچھے رہ ہی کیا گیا تھا..... لوگ رو رو کر بے حال ہو رہے تھے۔

ماسی را بو جیراں، جیلاں، جارد اور رقیہ تو بچکیوں سے رو رہی تھیں، بکو بھی بچوں کی طرح رو رہا تھا..... ماسی را بونے نحو کو لپٹا کر پیار کیا۔ لڑکیاں بھی اس سے لپٹ گئیں، بکو نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”جادھیئے گھراپنے.....“

سب نے مل کر نحو کو ڈولے میں بٹھایا۔ ”بینڈ نے رخصتی دھن چھیڑ دی۔

”سکھیروں نے ڈولے پر سے روپے اور چاندی کے پھول نچھاور کر کے پھینکے

اور ڈولہ اٹھالیا.....

لوگوں کی چیخیں نکل گئیں..... اتنا تو شاید لوگ فضل کی میت اٹھنے پر بھی نہ روئے

تھے جتنا نحو کا ڈولہ اٹھنے پر رو رہے تھے۔

ہڑیا لے پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ اندھیرا اتر آیا..... لیکن  
ہڑیا لہ تو آج بقیہ روشنی تھا۔ اتنے گیس جل رہے تھے کہ شمار نہ کیے جاسکتے  
تھے..... آتش بازی چھوٹ رہی تھی، مشعلیں جل رہی تھیں۔

سرور ہنگامہ اور شور شرابا اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ڈھولک پیٹی  
جاری تھی، ڈھول تاشہ بج رہا تھا۔

سوئی کے بینڈ نے واپس ہونے سے پہلے سکھیرے کی حویلی کے بڑے پھانک  
پر سلامی کی مسرور کن دھن بجائی۔

مبارک سلامت کے فاتحانہ شور میں نجو نے ڈولے سے باہر قدم نکالا۔ گولے  
چھوڑے گئے، بھنگڑا ڈالا گیا، پورا پنڈ اس خوشی میں شریک ہوا.....

رات نجو کو حویلی کے ایک آراستہ کمرے میں بٹھا دیا گیا، رنگین پایوں اور اونچے  
رنگین تکیے والے پلنگ پر جس میں گھنگھرو اور گھنٹیاں لگی تھیں، زربفت کی چادر اور تکیے پڑے  
تھے۔ نجو بھاری گولے والے دوپٹے کا گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔

اس کمرے کو تاج نے بڑے چاؤ سے کچھ شہری طرز پر سنوارا تھا۔ محرابی دروں  
والی کھڑکیوں اور دروازے پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف رنگین پیڑھے بھی  
رکھے ہوئے تھے اور پیتل کے کام والی اونچی پیڑھیاں بھی پڑی تھیں۔

پلنگ کی سرخ زربفت کی چادر پر پھول بکھرے تھے۔ فضا خوشبوؤں سے معطر تھی۔  
رات گئے دوستوں، رشتہ داروں سے پلہ چھڑا کر تاج جھومتا ہوا کمرے میں  
آیا..... نگاہ شوق بے تاب تھی۔ دروازے کا کنڈا چڑھا کر وہ بہکے بہکے قدم اٹھاتا پلنگ کے  
قریب آ گیا۔

چند لمحے کھڑا رہا۔

وہ بے حد مسرور تھا۔

”زندگی میں اس نے عورت کے مقابلے میں کبھی شکست نہ کھائی تھی۔ جسے چاہا

حاصل کر لیا تھا۔

اور

نجو

کو حاصل کرنا تو اس کی زندگی کی شاید سب سے بڑی فتح تھی۔

وہ فتح کے نشے میں ڈولتا پلنگ کے کنارے پر عین نجو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شوق و  
تجسس سے چند لمحے اس چمکیلی گٹھڑی کو تکتا رہا۔

”نجو۔“ اس نے فوراً شوق سے پکارا۔ وہ چپ رہی۔

”نجو۔“ اس نے دوبارہ پکارا۔ نجو کے وجود نے اضطرابی سی حرکت کی۔

”آتش شوق بھڑک اٹھی تھی۔ تاج ذرا کھسک کر آگے ہوا..... نجو کا گھونگھٹ

الٹنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

”سکھیرے۔“ نجو نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنا گھونگھٹ خود ہی الٹ دیا۔

تاج ششدر سا ہوا۔ نجو کے اس انداز کی سمجھ نہ آئی۔

”وہ سراپا انتقام تھی..... آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ جسم جل رہا تھا..... وہ  
مضبوط اور مستحکم آواز میں بولی ”میرے ویرے قاتلا.....“

”نجو کا دوپٹے میں ڈھکا ہاتھ باہر نکلا..... اور تاج کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے  
اس ہاتھ میں پکڑا آبدار خنجر سکھیرے کی چھاتی میں اتر گیا۔

”اوخ..... اوخ..... اوخ.....“ تاج کو جھٹکا لگا، منہ سے عجیب سی چیخ نما آواز  
نکل..... چھاتی سے خون ابل پڑا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھاتی پر رکھ لیا۔

نجو نے خنجر کھینچا اور دوسرا وار کرنے کو تھی کہ زخمی ہونے کے باوجود تاج خنجر  
پکڑنے کو چھٹا۔

شاید وہ خنجر جھپٹ کر نجو پر وار کر دیتا۔

لیکن

مزاحمت کے دوران سنسناتی ہوئی گولی آئی

اور

سکھیرے کے سینے کے پار ہو گئی۔

اک چیخ ابھری اور وہ تیوراً کر پلنگ پر گرا۔ دوہرا ہو کر قالین پر لوٹنے لگا۔

نحو نے حیرانگی سے گولی والی سمت دیکھا۔

گل پروشے کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اندر کود آئی۔

”گل پروشے۔“ نحو کے بے رنگ ہونٹوں سے صدائلی۔ اس کا خنجر والا ہاتھ

اٹھا رہا تھا۔

گل پروشے وحشی درندہ لگ رہی تھی۔ اس نے تڑپتے سکھیرے کو ٹھوکر ماری۔

”خنزیرا..... حرامی..... ام تم کو چوڑے گا کبھی.....؟ تکہ بوٹی کرے گا.....

تمارا۔“ وہ آگے بڑھی۔

نحو کو دیکھا۔

”اس کے ہاتھ میں پکڑے خنجر کو دیکھا۔

اور

پھر

جھپٹ کر خنجر اس کے ہاتھ سے چھین کر بولی ”یہ امارا ہاتھ سے مرے گا۔ ام سب کا

بدلہ لے گا..... ام اس کا قیمہ کرے گا..... تمارا بھائی کا بدلہ لے گا اپنی عزت کا بدلہ لے گا۔“

”وہ دیوانہ وار تاج کے سینے پر خنجر سے وار کرنے لگی۔

اور..... جب

گولی کی آواز پر گھروالے مہمان اور پنڈ کے لوگ اس کمرے کی طرف دوڑے۔

دروازے کو پیٹتے رہے کھڑکیاں کھٹکھٹائیں۔

جب دروازے اور کھڑکیاں نہ کھلیں

تو

توڑ کر اندر آ گئے۔

انہوں نے

جو منظر دیکھا۔

سکتہ سا ہو گیا سب کو۔

گل پروشے۔

سکھیرے کی خون میں لت پت لاش کے سینے پر دیوانہ وار خنجروں سے وار کر رہی تھی۔

اور

پلنگ کے قریب نحو

خون میں ڈوبے سکھیرے کے سہرے اور چہرے کو تکتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھی۔

چیخ و پکار سے جملہ عروسی ماتم کدہ بن گیا۔

لوگوں نے آگے بڑھ کر بڑی مشکلوں سے گل پروشے کو پکڑ لیا..... جو خونخوار

نظروں سے سکھیرے کو تکتے ہوئے پاگلوں کی طرح بولے بکے جا رہی تھی۔

انہوں نے نحو کو بھی سہارا دے کر پلنگ پر بٹھا دیا جو دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔

لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ بھائی کا چر کہ کھانے کے بعد دو لہا کا بھی وہی حشر دیکھ کر

غم کی ماری لڑکی صدمے سے پاگل ہو گئی ہے۔

-----O-----

”میں جب بھی اپنے ویر کے سہرے کی خون میں ڈوبی لڑیاں دیکھتی تھی نا..... تو مجھے اس میں اپنے ویر کا چہرہ نظر آنے لگتا تھا۔ یہ چہرہ آہستہ آہستہ بدلنے لگتا اور تاج سکھیرے کا چہرہ بن جاتا..... پھر میں..... میں خون میں ڈوبی سہرے کی لڑیوں کو کپڑوں کو چوم کر قسم کھاتی تھی کہ اپنے ویر کے خون کا بدلہ سکھیرے سے اسی طرح لوں گی..... میں اس طرح بدلہ نہ لیتی تو میرے ویر کی روح کو قہر نہ آتا اور میں بھی ساری عمر تڑپتی رہتی۔ میں نے اپنے ویر کا بدلہ لے لیا.....“

قتل کی واردات کے برسوں بعد جب نجو قانون اور کچہری کے چکروں سے نکل کر راجو کے پہلو میں دلہن بن کر بیٹھی..... تو راجو کے پوچھنے پر اس نے سارا قصہ اسے سناتے ہوئے اپنی قسم کے متعلق بھی بتایا۔

راجو اپنی بڑی بڑی فسوں ساز آنکھوں کو پھیلائے بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چپ ہوئی تو اس نے نجو کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بے اختیار انداز میں کہا ”او تو کتنی خطرناک ہے کڑیے۔“

نجو نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھڑا کر کہا ”جس تن لکیاں سوتن جانے.....“

”لکیاں تو میرے تن بھی کچھ کم نہ تھیں..... نجو..... وہ پٹھانی قاتل ثابت نہ ہو جاتی تو.....“

”تو میں پھانسی چڑھ جاتی۔“

”نجو..... پھر میں کیا کرتا.....“

”تو میری قبر پر مجاور بن کر ساری عمر گزار دیتا.....“

وہ مسکرا دی اور راجو نے بے اختیاری سے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔